فوج اور سیاست پر پہلی مستند کتاب

جرنیل اور سیاست دان

تاریخ کی عدالت میں

قیوم نظامی

اہم اضافوں کے ساتھ

فوج اور سیاست پر پہلی مستند کتاب

جرنیل اور سیاست دان

تاریخ کی عدالت میں

اہم اضافوں کے ساتھ

قیوم نظامی

JBD Press™
Since 1923

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر : نبیل نیاز

طابع : نیاز جہانگیر پرنٹرز، اردو بازار، لاہور

اشاعت اول: اپریل 2006

اشاعت دوم: ستمبر 2006

قیمت : -/300 روپے

تقسیم کنندہ: آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879

سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086

سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609

سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781

سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568

سیلز ڈپو حیدرآباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

جہانگیر بک ڈپو

Website:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

انتساب

جمہوریت، مشاورت اور شراکت پر مبنی سیاسی نظام
میں غیر متزلزل یقین رکھنے والے باشعور عوام
کے نام

فہرست

پیش لفظ

قیوم نظامی صاحب سیاست کے میدان میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور جمہوریت کے علمبردار ہونے کی پاداش میں ضیائی مارشل لاء کے دوران کوڑے بھی کھا چکے ہیں۔ وہ ایک معروف کالم نگار اور دانشور ہیں اور اب انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں مصنف کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔

تمام محب وطن اور جمہوری سوچ رکھنے والے پاکستانیوں کی مانند قیوم نظامی صاحب بھی فوج کی حکومت میں مداخلت اور غلبے سے متفکر ہیں اور اسے ملکی مفاد کے منافی سمجھتے ہیں۔ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے وہ پاکستان کے استحکام وترقی کے لئے جمہوری نظام کو ناگزیر سمجھتے ہیں اور ایک تجزیہ نگار کی حیثیت سے وہ اُن وجوہ اور بنیادی عوامل کو بھی اپنے تاریخی تناظر میں سمجھنا چاہتے ہیں جو وقفے وقفے سے فوج کی سیاست میں مداخلت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کی تحقیقی کتاب اُن کی اسی خواہش اور جستجو کی مظہر ہے۔ اگرچہ پاکستانی سیاست میں فوجی مداخلت اور غلبہ پرانی بات ہے کیونکہ درپردہ یہ سلسلہ 54-1953 میں شروع ہوگیا تھا لیکن باقاعدہ فوج نے حکومت پر قبضہ پہلی بار 1958 میں کیا اس کے باوجود اس موضوع پر کم لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ جو 1971ء میں ملک ٹوٹنے کا بھی سبب بنا۔ اس لحاظ سے یہ موضوع گہری تحقیق اور تجزیے کا متقاضی ہے۔ قیوم نظامی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک نہایت ہی اہم موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں نہ صرف اُن عوامل کا تجزیہ کیا ہے جو بار بار سیاست میں فوج کی آمد کا سبب بنے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہر سیاسی اور فوجی دور حکومت کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے، مختلف حکومتوں کی کارکردگی کا تجزیہ کیا ہے اور قوم کو مستقبل کی راہ دکھائی ہے۔ کتاب کے صفحات پر پھیلے ہوئے حوالہ جات مصنف کے وسیع مطالعے، عرق ریزی اور ریسرچ سکالرشپ کا منہ بولتا ثبوت ہیں جنہوں نے کتاب کو خاصی حد تک مستند بنا دیا ہے۔ نظامی صاحب بنیادی طور پر پیپلز پارٹی کے دیرینہ کارکن ہیں اس لئے بعض مقامات پر ان کا سیاسی جھکاؤ ایک قابل فہم بات ہے لیکن جس دلیری اور مہارت سے اُنہوں نے آمرانہ قوتوں کی سنگلاخ چٹانوں سے راستہ بنایا ہے اور تاریخی حقائق کے علاوہ اعداد وشمار کی بنا پر اُن کی کارکردگی کا راز فاش کیا ہے اس کے لئے وہ ہماری ستائش کے مستحق ہیں۔ اُن کے سادہ اور رواں اُسلوب نے کتاب کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے اور کتاب

پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ تاریخ کی وادی میں سفر کر رہا ہے۔ میری آرزو اور دعا ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کی جائے اور لکھا جائے تاکہ فوجی مداخلت کے خلاف شعور کی لہر عوام تک پہنچے اور اُن میں اس رجحان کے خلاف مزاحمت کا جذبہ پیدا ہو کیونکہ چار فوجی حکومتوں کے تسلط نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاستدان اُن کا راستہ نہیں روک سکتے۔ یہ ملک عوام کا ہے اور عوام کے لئے ہی بنا تھا اس لئے اس کے مفادات کی حفاظت کی ذمہ داری بھی عوام پر ہی عائد ہوتی ہے۔ نیم خواندگی، سیاسی و معاشی پسماندگی، فوجی تسلط، وڈیرہ شاہی اور جمہوری عمل میں رکاوٹ کے سبب عوام میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا لیکن اگر اس موضوع پر سوچ و بچار کا سلسلہ جاری رہا اور سیاسی جماعتوں نے میڈیا کی مدد سے اس ضمن میں منظم و مؤثر کام کیا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس عوام کے ذہنوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا جس طرح قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے تمام تر مسائل اور رکاوٹوں کے باوجود قوم میں بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ اقبال نے ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

قیوم نظامی صاحب نے اس زرخیز مٹی پر شبنم کے قطروں کی پھوار سے نمی کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک قومی خدمت کے زمرے میں آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خلوص نیت سے کی گئی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں اور قلم کی نوک سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی بے اثر نہیں ہوتے۔

اے اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیۓ ہوئے

ڈاکٹر صفدر محمود

لاہور

4 اپریل 2006

دیباچہ

کتاب کی تکمیل کے بعد دیباچہ تحریر کرنا مصنف کے لیے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ آج مجھے درپیش ہے۔ فوج اور سیاست پاکستان کی سیاسی تاریخ کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ پاکستان کے جرنیلوں اور سیاست دانوں کی کشمکش کے بارے میں انگریزی میں معیاری کتب تحریر کی گئیں مگر اُردو میں اس اہم موضوع پر معیاری اور مستند کتب کا فقدان ہے۔ میں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس موضوع پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کتاب میری دو سال کی محنت کا نتیجہ ہے، اس کے معیار کا فیصلہ محترم قارئین کو کرنا ہے۔

کتاب میں قائداعظم محمد علی جناح سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک ان اہم سیاسی واقعات کو بیان کیا گیا ہے جو پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کا سبب بنے اور جنہیں عوام سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ قائداعظم نے 14 اگست 1947ء کو ایک فوجی کو ڈانٹ دیا جس نے سول اُمور میں مداخلت کی کوشش کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے سول اور ملٹری افسروں کو ایک لیکچر دیا اور کہا کہ ’’آپ حاکم نہیں عوام کے خادم ہیں‘‘۔ قائداعظم نے جنرل ایوب کی فائل پر سخت ریمارکس تحریر کیۓ۔ ان واقعات کی تفصیل باب نمبر 1 ’’قائداعظم اور سول ملٹری بیوروکریٹس‘‘ میں ملاحظہ فرمائیے۔

قیام پاکستان سے ایک ہفتہ قبل دہلی کی ایک تقریب میں ایک فوجی افسر نے پاکستان میں پروموشن کے بارے میں سوال کر کے قائداعظم کو افسردہ کر دیا۔ قائداعظم نے کہا ’’پاکستان کی منتخب حکومت سول افراد پر مشتمل ہوگی جو بھی جمہوری اُصولوں کے برعکس سوچتا ہے اسے پاکستان کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے‘‘۔ اس تقریب کا احوال میزبان میجر جنرل شاہد حامد کی زبان میں باب نمبر 2 ’’فوج اور اثاثوں کی تقسیم‘‘ میں پڑھیے۔ اسی باب میں قارئین یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ قیام پاکستان کے فیصلے کے بعد سندھ اور پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں نے اپنا سرمایہ دہلی منتقل کرنا شروع کر دیا کیونکہ انہیں نئی مملکت کی پائیداری کا یقین نہیں تھا۔ تیسرا باب پاکستان کے ابتدائی دس سالوں کی سیاسی عسکری کشمکش پر مبنی ہے۔ یکم جنوری 1948 کو ایوب خان نے مشرقی پاکستان کے جی او سی کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا تحفظ کیا جسے طلبہ کے مشتعل ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ ایوب خان کو یہ احساس ہوا کہ سیاست دان فوج کے تعاون کے بغیر اپنا تحفظ بھی نہیں کر سکتے۔ تیسرے باب میں ہی سیاست دانوں کی محلاتی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر ہے۔ سیاست دانوں کی ذاتی اور گروہی مصلحتوں کی بناء پر سول ملٹری بیوروکریٹس ابتداء میں ہی سیاست اور حکومت پر حاوی ہوگئے۔ جنرل ایوب خان (1953) نے ملٹری اتاشی کو ہدایت کی کہ ’’وہ امریکی امداد کے بارے میں

پاکستان کے سفیر کو اعتماد میں نہ لے کیونکہ حساس معاملات پر سویلین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا"۔

جنرل ایوب خان سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک ہر باب میں مستند حوالوں کے ساتھ ایسے واقعات اور انکشافات شامل کیئے گئے ہیں جو قارئین کے لیے حیران کن اور سبق آموز ہوں گے۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ کتاب کے ہر باب کا مطالعہ کریں اور سیاست کے کاروبار مکر وفن اور پس پردہ عسکری مداخلتوں کے بارے میں آگاہی حاصل کریں۔ فوج کی تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کے بارے میں ایک باب کتاب میں شامل ہے جبکہ فوج کی فلاحی اور سماجی خدمات بھی الگ باب میں بیان کی گئی ہیں۔

پاکستان اور بھارت کا عسکری اور جمہوری موازنہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا سبب ہوگا۔ پاکستان کی عدلیہ کا کردار قابل رشک نہیں رہا جس کا اندازہ عدلیہ کے تاریخی آئینی فیصلوں سے ہوتا ہے جو کتاب کا حصہ ہیں۔ کتاب کے آخر میں تاریخ کی عدالت اپنا فیصلہ سناتی ہے اور ان طبقات کو بے نقاب کرتی ہے جو جمہوریت کے عدم استحکام اور عدم تسلسل کا سبب بنے۔ تاریخ کی عدالت ان عوامل پر بھی روشنی ڈالتی ہے جن کی وجہ سے قوم کو موجودہ سنگین سیاسی، جمہوری اور معاشی بحران کا سامنا ہے۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے ممکنہ حل الگ باب میں بیان کیا گیا ہے۔ تقریباً ساٹھ سال گزرنے کے بعد جرنیلوں اور سیاست دانوں کو تاریخ کی عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا تاکہ ذمہ داری کا تعین کیا جاسکے ان وجوہات کا علم ہو جو ہمارے سیاسی نظام کی ناکامی کا باعث بنیں اور ہم اپنی تاریخ سے سبق سیکھ کر ایسے راستے کا تعین کرسکیں جو ملک اور قوم کو کامیابی سے ہمکنار کردے۔

میں قارئین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری پہلی کتاب "جو دیکھا جو سنا" کو پذیرائی بخشی اور اس کا دو سال کے اندر تیسرا ایڈیشن مارکیٹ میں آچکا ہے۔ میری اس کتاب کا موضوع بالکل مختلف ہے اور پہلی کتاب کا ایک صفحہ بھی نئی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ کتاب کی زبان آسان فہم ہے اور انگریزی اقتباسات کے لفظی ترجمے کی بجائے مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ قارئین آسانی کے ساتھ دوسرے مصنفین کے تجزیے سے آگاہ ہوسکیں۔ میں ان مصنفین کا احسان مند اور شکر گزار ہوں جن کی کتب کے اقتباسات میں نے حوالے کے طور پر اپنی کتاب میں شامل کیئے ہیں۔ کتاب میں جو بھی سقم ہیں ان کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں اُمید ہے میری اس کاوش کو ریفرنس بک کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اگر صدر جنرل پرویز مشرف نے اظہار رائے کی بے مثال آزادی نہ دی ہوتی تو اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوسکتی۔

آخر میں مجھے ان اصحاب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا ہے جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر کتاب کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ سب سے پہلے میں محترم ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مصروفیات کے باوجود کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کے لیے وقت نکالا اور کتاب کو معیاری بنانے کے لیے مفید مشورے دیئے۔ انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کتاب کے لیے پیش لفظ لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے احساس ہوا کہ میری محنت کو سراہا جائے گا۔ محترم جنرل (ر) حمید گل خوشدلی

کے ساتھ فون پر میرے سوالات کے جوابات دیتے رہے انہوں نے لاہور میں میرے ساتھ ملاقات کرکے اپنے ذاتی مشاہدات شیئر کیئے۔ برادرم افتخار الحق نے اپنی ذاتی لائبریری کا اخباری ریکارڈ میرے حوالے کردیا۔ محترم ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، محترم مجید نظامی، محترم اعتزاز احسن، محترم ایس ایم ظفر اور محترم بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر نے اپنے مشاہدات اور آراء سے نوازا۔ اپنی بیگم کشور اور بیٹے بیٹیوں کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے جنہوں نے مجھے خوشگوار اور پرسکون ماحول فراہم کیا۔ جہانگیر بک ڈپو کے چیف ایگزیکٹو فواز نیاز نے کتاب کی اشاعت کو معیاری بنانے کے لیے پوری دلچسپی لی۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ ای میل کے ذریعے اپنے مشوروں اور تجاویز سے نوازیں تاکہ ان کی روشنی میں دوسرے ایڈیشن کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

قیوم نظامی

11 اپریل 2006

ای میل: Qayyumnizami@hotmail.com

دوسرا ایڈیشن

دیباچہ

خدا کے فضل و کرم، قارئین کی محبت، پسندیدگی اور جہانگیر بک ڈپو کے چیف ایگزیکٹو نبیل نیاز کی ماہرانہ مارکیٹنگ کی وجہ سے کتاب کا پہلا ایڈیشن چار ماہ میں ختم ہوگیا جو ایک ریکارڈ ہے اور اس امر کا ثبوت ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ سول ملٹری تعلقات کی نوعیت کو اس کے اصل پس منظر میں سمجھنے کا خواہش مند ہے۔ میں ان تمام دانشوروں تجزیہ نگاروں، صحافیوں، سیاست دانوں، پروفیسروں، سول سرونٹس، ریٹائرڈ جرنیلوں، ریٹائرڈ ججوں کا ممنون احسان ہوں جنہوں نے براہ راست یا بالواسطہ مجھے ایک معیاری کتاب تحریر کرنے پر مبارکباد دی۔ قارئین کا انتہائی سپاس گزار ہوں جنہوں نے میری کاوش کو پذیرائی بخشی۔ میں نے فوج اور سیاست کے موضوع پر تحقیق جاری رکھی۔ آج کل ان سیکرٹ اور ڈی کلاسیفائیڈ پیپرز کا مطالعہ کر رہا ہوں جو امریکہ اور برطانیہ نے جاری کیے۔ اس دوران میرے علم میں جو حوالے آئے انہیں تازہ ایڈیشن میں شامل کر دیا ہے۔ ان اہم اضافوں سے کتاب کی افادیت اور اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ میں آخر میں جہانگیر بک ڈپو کے نبیل نیاز کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب پر خصوصی توجہ دی اور کتاب کی اشاعت اور مارکیٹنگ میں فعال کردار ادا کیا۔

قیوم نظامی

14 اگست 2006

ای میل: Qayyumnizami@hotmail.com

باب 1

قائداعظم اور سول ملٹری بیوروکریٹس

قائداعظم دفاعی اُمور کے ماہر تھے۔ بھارت کے دفاع کے بارے میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ قائداعظم نے لارڈ چیمسفورڈ کے دور میں ممبئی میں ہونے والی صوبائی وار کانفرنس میں شرکت کی اور مشورہ دیا کہ ہندوستان میں کرائے کی فوج کے بجائے ایک قومی فوج (Citizen Army) تشکیل دی جائے۔ قائداعظم کے مطالبے پر ڈیرہ دون (بھارت) میں انڈین ملٹری اکیڈمی قائم کی گئی اور فوج کے لیے کمیشنڈ آفیسر تیار کیے گئے۔

برٹش انڈیا لائبریری لندن کے ریکارڈ کے مطابق، برصغیر کی آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے ان تمام سول اور فوجی ملازمین کو ریٹائر کر دیا جو ہندوستان میں فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ جب جبری ریٹائر ہونے والے آفیسروں نے احتجاج کیا تو انہیں بتایا گیا کہ برطانیہ میں "آقائی ذہنیت" کو سروسز میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت اور پاکستان انگریز دور میں خدمات انجام دینے والے سول اور ملٹری ملازمین کو بحال رکھنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کے پاس متبادل سروس کیڈر موجود نہیں تھا۔ قائداعظم سرکاری ملازمین کی برطانوی ذہنیت اور تربیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد متعدد بار سول اور ملٹری ملازمین کو باور کرایا کہ آزادی کے بعد ایک نیا ملک پاکستان قائم ہو چکا ہے جو ایک آزاد ریاست ہے لہٰذا اب وہ عوام کے آقا نہیں بلکہ عوام کے خادم ہیں۔ اسٹیون پی کوہن اپنی معروف کتاب "پاکستان آرمی" میں لکھتے ہیں۔

"پاکستان کے یوم آزادی 14 اگست 1947ء پر محمد علی جناح نے (جو ابھی ابھی گورنر جنرل بنے تھے) ایک نوجوان پاکستانی کو ڈانٹا۔ [1] اصغر خان کے مطابق (جو پاکستانی فضائیہ کے ایئر مارشل بنے) اس افسر نے شکایت کی تھی بجائے اس کے کہ ہمیں ان عہدوں پر اپنے وطن کی خدمت کا موقع دیا جائے جہاں ہماری فطری صلاحیتوں اور دیسی فطانت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اہم عہدے ماضی کی طرح غیر ملکیوں کو دیئے جارہے ہیں۔ تینوں جنگی سروسز میں برطانوی افسران کو سربراہ بنایا گیا ہے اور کلیدی سینئر عہدوں پر متعدد غیر ملکی متعین ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ پاکستان کے اُمور یوں چلائے جائیں گے۔ [2]

---

[1] اصغر خان کے مطابق یہ نوجوان لیفٹیننٹ کرنل اکبر خان تھے جو بعد میں میجر جنرل بنے اور راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہوئے۔
حوالہ: ایئر مارشل (ر) اصغر خان "We Have Learnt Nothing From History" صفحہ 3

[2] ایئر مارشل (ر) اصغر خان "Pakistan at the Crossroads" فیروز سنز 1969

جناح کا جواب محکم تھا۔ انہوں نے اس افسر پر واضح کر دیا کہ وہ یہ نہ بھولے کہ مسلح افواج ''عوام کی خادم ہیں'' اور قومی پالیسی آپ نہیں بناتے ہم سویلین افراد ان مسائل کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ ہمارا کام ہے کہ ان فرائض کا تعین کریں جو آپ کو تفویض کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی اور فکر و عمل میں انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کی ضرورت پر زور دیا۔ اس بات کی آزادانہ تصدیق نہیں ہوسکتی لیکن جناح نے دس ماہ بعد سٹاف کالج کے پہلے اور واحد دورے میں تقریباً انہی الفاظ میں یہ بات دہرائی انہوں نے ''ایک یا دو بہت اعلیٰ عہدے کے افسران'' کی لاپرواہی کے رویے پر تشویش ظاہر کی۔ دفاعی افواج کی تعریف کر کے ''وہ تمام پاکستانی سروسز میں اہم ترین ہیں'' انہوں نے موجود طلبہ اور انسٹرکٹروں (مؤخر الذکر بیش تر برطانوی) کو خبردار کیا کہ ان میں سے بعض افراد پاکستان سے کیئے ہوئے اپنے حلف کے مضمرات سے آگاہ نہیں۔ پھر انہوں نے فوراً حلف پڑھ کر سنایا ❸ اور کہا، میں چاہوں گا کہ آپ اس دستور کا مطالعہ کریں جو اس وقت پاکستان میں نافذ ہے اور جب آپ کہتے ہیں کہ آپ مملکت کے دساتیر سے وفادار رہیں گے تو اس بات کے سچے آئینی اور قانونی مضمرات کو سمجھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یاد رکھیں اور اگر وقت ہو تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کا جیسا کہ وہ پاکستان کے لیے اختیار کیا گیا ہے مطالعہ کریں جو ہمارا موجودہ آئین ہے۔ یہ کہ انتظامی اختیارات کا سرچشمہ حکومت پاکستان کا سربراہ ہے۔ جو گورنر جنرل ہے۔ لہٰذا آپ کو جو بھی احکامات ملیں وہ انتظامی سربراہ کی منظوری کے بغیر نہیں مل سکتے ❹''

اسٹیون کوہن کے اس اقتباس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قائداعظم ریاست پر سویلین لیڈروں کی بالادستی کے قائل تھے اور سول و ملٹری سرکاری ملازمین کو پیشہ ورانہ سرگرمیوں تک محدود رکھنے کے حامی تھے۔ قائداعظم نے پاکستان جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں حاصل کیا تھا اور قیام پاکستان میں سول اور ملٹری ملازمین کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ جمہوریت کے چیمپئن تھے اور پاکستان میں جمہوریت کے نظام کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوام کا استحصال کر کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے پنپنے کے خلاف تھے انہوں بڑے واضح، کھلے اور دوٹوک الفاظ میں فرمایا۔

❸ محمد علی جناح سٹاف کالج کوئٹہ سے خطاب، 14 جون 1948

❹ اسٹیون کوہن ''پاکستان آرمی تاریخ و تنظیم (اردو)'' اوکسفورڈ صفحہ 130,129

قائداعظم نے فوجی افسر کو یہ الفاظ کہے۔

"Never forget that you are the servants of the State. You do not make policy. It is we, the people's representatives, who decide how the country is to be run. Your job is only to obey the decisions of your civilian masters."

حوالہ: ایئر مارشل (ر) اصغر خان "We Have Learnt Nothing From History" صفحہ 3

"I am sure democracy is in our blood. Indeed, it is in the marrow of our bones. Only centuries of adverse circumstances have made the circulation of the blood cold. It has become frozen, and our arteries have not been functioning. But thank God, the blood is circulating again. It will be a people's government.

I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at the people's expense by a system which is so vicious, which is so wicked, and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lesson of Islam." ❺

ترجمہ: ''مجھے یقین ہے کہ جمہوریت ہمارے خون میں شامل ہے۔ یقیناً یہ ہماری ہڈیوں کے گودے میں ہے۔ صدیوں کے ناموافق حالات نے ہمارے خون کی گردش کو سرد کر دیا ہے۔ خون منجمد ہو چکا ہے اور ہمارے جسم کی شریانیں کام نہیں کر رہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خون دوبارہ گردش کرنے لگا ہے۔ اب یہاں عوام کی حکومت ہوگی۔

میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو انتباہ کرتا ہوں جو عوام کا استحصال کر کے خوشحال ہوئے ہیں ایک ایسے نظام میں جو قابل ملامت اور بے انصاف ہے اور جس نے انہیں اس قدر خود غرض بنا دیا ہے کہ اب انہیں دلیل سے سمجھانا مشکل ہو گیا ہے۔ غریب عوام کا استحصال کرنا ان کے خون میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ اسلام کا سبق بھول چکے ہیں۔'' ❺

قائداعظم نے سماج کی جس بیماری کی نشاندہی کی تھی آج وہ شدید تر ہو چکی ہے۔ جمہوریت پابند ہے، طاقت ور اداروں کے دباؤ میں ہے اور جاگیردار لوٹ مار کرنے میں آزاد ہیں۔ وہ حالات کی صدا سننے سے قاصر ہیں۔ سیاسی جسم کی شریانیں بند ہو چکی ہیں۔ جنہیں اب بائی پاس آپریشن سے ہی درست کیا جاسکتا ہے۔ قائداعظم کا پختہ نظریہ تھا کہ سرکاری ملازمین سیاست سے الگ رہیں اور اپنے فرائض آئین کی حدود کے اندر رہ کر ادا کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ بیوروکریسی برطانوی راج کی سوچ اور ذہنیت کو ختم کر دے اور اپنی عوام کی خدمت کرے۔ قائداعظم کو خدشہ تھا کہ بیوروکریسی نئی حقیقتوں کا ادراک کرنے کے بجائے پرانی روایات پر چلنے کی کوشش کرے گی۔ انہوں نے گزیٹڈ آفیسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"I want you to realise fully the deep implications of the revolutionary change that has taken place. Whatever

❺ قائداعظم تقریر کراچی 1943ء

community, caste or creed you belong to, you are now the servants of Pakistan. Servants can only do their duties and discharge their responsibilities by serving. Those days have gone when the country was ruled by the bureaucracy. It is people's government, responsible to the people more or less on democratic lines and parliamentary practices. Under these fundamental changes I would put before you two or three points for your consideration:

"You have to do your duty as servants; you are not concerned with this political or that political party; that is not your business. It is a business of politicians to fight out their case under the present constitution or the future constitution that may be ultimately framed. You, therefore, have nothing to do with this party or that party. You are civil servants. Whichever gets the majority will form the government and your duty is to serve that government for the time being as servants not as politicians. How will you do that? The government in power for the time being must also realise and understand their reponsibilities that you are not to be used for this party or that. I know we are saddled with old legacy, old mentality, old psychology and it haunts our footsteps, but it is up to you now to act as true servants of the people even at the risk of any Minister or Ministry trying to interfere with you in the discharge of your duties as civil servants. I hope it will not be so but even if some of you have to suffer as a victim – I hope it will not happen – I expect you to do so readily. We shall of course see that there is security for you and safeguards to you. If we find that is in any way prejudicial to your interest we shall find ways and means of giving you that security. Of course, you must be loyal to the government that is in power.

"The second point is that of your conduct and dealings with the people in various departments, in which you may be: wipe off that past reputation; you are not rulers. You do not belong to the ruling class; you belong to the servants. Make the people feel that you are their servants and friends,

maintain the highest standard of honour, integrity, justice and fairplay. If you do that, people will have confidence and trust in you and will look upon you as friends and well-wishers. I do not want to condemn everything of the past, there were men who did their duties according to their rights in the service in which they were placed. As administrators they did justice in many cases but they did not feel that justice was done to them because there was an order of superiority and they were held at a distance and they did not feel the warmth but they felt a freezing atmosphere when they had to do anything with the officials. Now that freezing atmosphere must go; that impression of arrogance must go; that impression that you are rulers must go and you must do your best with all courtesy and kindness and to try to understand the people. May be sometimes you will find that it is tiring and provoking when a man goes on talking and repeating a thing over and over again, but have patience and show patience and make them feel that justice has been done to them."

Next thing that I would like to impress upon you is this:

"I keep on getting representations and memorials containing grievances of the people of all sorts of things. Maybe there is no justification, maybe there is no foundation for that, maybe that they are under wrong impression and maybe they are misled but in all such cases I have followed one practice for many years which is this: Whether I agree with anyone or not, whether I think that he has any imaginary grievances, whether I think that he does not understand but I always show patience. If you will also do the same in your dealings with an individual or any association or any organisation you will ultimately stand to gain. Let not people leave you with this bearing that you hate, that you are offensive that you have insulted or that you are rude to them. Not one per cent who comes in contact with you should be left in that state of mind. You may not be able to agree with him but do not let him go with this feeling that you are offensive or that you are

discourteous. If you will follow that rule believe me you will win the respect of the people.⑥"

ترجمہ: ''میں چاہتا ہوں کہ جو انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے آپ اس کے گہرے مضمرات کا پورا پورا اندازہ کریں۔ آپ کسی بھی فرقے، ذات پات یا عقیدے سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، اب آپ پاکستان کے خادم ہیں۔ خدمت گار صرف خدمت کے ذریعے ہی اپنے فرائض منصبی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ وہ دن گئے، جب ملک پر افسر شاہی کا حکم چلتا تھا۔ یہ عوام کی حکومت ہے۔ عوام کے سامنے جمہوری خطوط اور پارلیمانی طرز پر جواب دہ ہے۔ ان بنیادی تبدیلیوں کے تحت، میں دو یا تین نکات آپ کے غور وخوض کے لئے پیش کروں گا:

آپ کو اپنا فرض منصبی خادموں کی طرح انجام دینا ہے۔ آپ کو اس سیاسی جماعت سے یا اُس سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ آپ کا کام نہیں۔ یہ سیاستدانوں کا کام ہے کہ وہ موجودہ آئین یا آئندہ آئین کے تحت، جو بالآخر تشکیل پائے گا، کے تحت اپنے موقف کے لئے لڑیں۔ لہٰذا آپ کا نہ اِس سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس سیاسی جماعت سے۔ آپ سرکاری ملازم ہیں۔ جس جماعت کو اکثریت حاصل ہوگی وہ حکومت بنائے گی اور آپ کا فرض ہے کہ آپ وقتی طور پر اس حکومت کی خدمت ملازمین کی طرح کریں، سیاستدانوں کی طرح نہیں۔ یہ آپ کیسے کریں گے؟ وقتی طور پر اقتدار میں آنے والی حکومت بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور سمجھے کہ آپ کو اِس پارٹی یا اُس پارٹی کی خاطر استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے علم ہے کہ ہم پر پُرانے ورثے، پُرانی ذہنیت اور پُرانی نفسیات کا غلبہ ہے اور یہ سائے کی طرح ہمارا تعاقب کرتا ہے۔ لیکن اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ عوام کے سچے خادموں کی طرح کام کریں۔ آپ اپنے فرائض منصبی سچے ملازمین کی طرح سرانجام دیں اور بحیثیت سرکاری ملازم اپنے فرائض کی بجا آوری میں، کسی وزیر یا وزارت کی مداخلت کے باوجود خطرہ بھی مول لے لیں۔ مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو میں آپ سے مستعدی سے کام کرنے کی توقع کرتا ہوں۔ یقیناً ہم نظر رکھیں گے کہ آپ محفوظ اور مامون ہوں۔ اگر ہم نے یہ دیکھا کہ کسی طرح بھی آپ کے مفادات کو خطرہ لاحق ہے تو ہم آپ کے تحفظ کے لئے تدابیر اختیار کریں گے۔ یقیناً آپ کو اس حکومت کا جو برسرِ اقتدار ہو وفادار رہنا چاہیئے۔

دوسرا نکتہ، مختلف محکموں میں عوام الناس کے ساتھ آپ کے رویہ اور برتاؤ کا ہے۔ آپ جہاں بھی ہوں، پرانے تاثر کو ذہن سے نکال دیجئے۔ آپ حاکم نہیں ہیں۔ آپ کا حکمران طبقے سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کا تعلق خدمت گاروں کی جماعت سے ہے۔ عوام الناس میں یہ

احساس پیدا کر دیجئے کہ آپ ان کے خادم اور ان کے دوست ہیں اور وقار، دیانت، عدل اور انصاف کی اعلیٰ ترین روایات قائم رکھیئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو لوگوں کو آپ پر اعتماد اور اعتبار ہوگا اور وہ آپ کو دوست اور بہی خواہ تصور کریں گے۔ میں ماضی کی ہر چیز کی مذمت نہیں کرتا۔ ایسے لوگ بھی تھے، جو ملازمت کے جس شعبہ میں بھی تعینات ہوئے، اپنے فرائض منصبی، اپنی صوابدید کے مطابق سرانجام دیتے رہے۔ منتظم کی حیثیت سے انہوں نے بہت سے معاملات میں انصاف بھی کیا، لیکن عوام نے یہ محسوس نہیں کیا کہ خود ان کے ساتھ تو انصاف کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ بالادستی کا زمانہ تھا اور انہیں ذرا فاصلہ پر رکھا جاتا تھا۔ انہیں جب سرکاری کارندوں سے کوئی کام پڑتا تو وہ گرم جوشی نہیں پاتے تھے بلکہ انہیں سرد مہری کے ماحول کا احساس ہوتا تھا۔ اب وہ سرد مہری کا ماحول ختم ہو جانا چاہیئے۔ اس احساس تکبر کو ختم ہونا چاہیئے۔ وہ تاثر کہ آپ حاکم ہیں زائل ہو جانا چاہیئے اور آپ کو پورے اخلاق کے ساتھ اپنی بہترین کوشش کرنا چاہیئے اور لوگوں کو سمجھنے کی سعی کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ یہ محسوس کریں کہ یہ ایک صبر آزما اور اشتعال انگیز بات ہے جب ایک شخص بولتا چلا جا رہا ہے اور بار بار ایک ہی بات کی رٹ لگا رہا ہے۔ لیکن آپ صبر سے کام لیں اور تحمل کا مظاہرہ کریں اور انہیں اس امر کا احساس دلائیں کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد جو بات میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے ایسی عرض داشتیں اور تحریریں موصول ہوتی رہتی ہیں جن میں مختلف النوع امور کے بارے میں لوگوں کی شکایات درج ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا کوئی جواز نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی کوئی بنیاد نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کا تاثر غلط ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گمراہ کیئے گئے ہوں لیکن میں نے ان تمام معاملات میں برسوں سے یہ طرز عمل اختیار کر رکھا ہے کہ خواہ میں کسی سے اتفاق کروں یا نہ کروں، خواہ میں یہ خیال کروں کہ اس کی تمام شکایات خیالی ہیں، خواہ میں یہ سوچوں کہ وہ بات نہیں سمجھتا لیکن میں ہمیشہ تحمل کا اظہار کرتا ہوں۔ اگر آپ بھی کسی فرد یا انجمن یا تنظیم کے ساتھ یہی برتاؤ کریں گے تو آخر کار آپ فائدہ میں رہیں گے۔ آپ کے پاس سے لوگوں کو یہ تاثر لے کر نہیں جانا چاہیئے کہ آپ نفرت کرنے والے اور جارح ہیں، یا آپ نے ان کی ہتک کی ہے یا آپ ان سے بدمزاجی سے پیش آئے ہیں۔ ان میں سے ایک فیصد اشخاص بھی ایسے نہیں ہونے چاہئیں جن سے آپ کا رابطہ ہوا ہو اور وہ اس قسم کا تاثر لے کر جائیں۔ آپ اس سے متفق نہ ہوں اس کو اس احساس کے ساتھ نہیں جانا چاہیئے کہ آپ جارح ہیں یا آپ بدمزاج ہیں۔ اگر آپ اس اصول پر چلیں گے تو مجھ پر یقین کریں کہ آپ لوگوں کی نظر میں عزت پائیں گے۔ ⑥

⑥ قائداعظم: مشرقی بنگال کے گزیٹڈ افسروں سے خطاب۔ چٹاگانگ 25 مارچ، 1948

قائداعظم کی یہ تقریر سول اور ملٹری ملازمین کے لیے ضابطۂ اخلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں سرکاری ملازمین کی ذمہ داریوں اور فرائض کا تعین کیا گیا ہے ان کی ملازمت کی حدود قائم کی گئی ہیں اور انہیں سیاست سے الگ رہنے کا پابند بنایا گیا ہے۔ قائداعظم کی ان تقریروں کو عوام سے چھپایا جاتا ہے۔ نئی نسل قائداعظم کے نظریات سے آگاہ نہیں ہے۔ اس نوعیت کی پالیسی ساز تقریروں کو نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔

لیاقت علی خان چار سال تک پاکستان کے بااختیار وزیراعظم رہے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ پاکستان کی ضرورتوں اور قائد کے تصورات کے مطابق آئین کی تیاری کو اولین ترجیح بناتے۔ سرکاری ملازمین کی آقائی ذہنیت اور حکمرانہ طرزِ عمل کو تبدیل کرنے کے لیے قانون سازی کرتے۔ ہماری دستور ساز اسمبلی نے آرمی ایکٹ 1911 کو بعینہٖ اپنا لیا حالانکہ یہ ایکٹ برطانیہ نے اپنے مفادات کے تحفظ، رعایا کے حقوق کو سلب کرنے اور آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے بنایا تھا۔ ہم نے اس استعماری اور نوآبادیاتی آرمی ایکٹ کو کسی ترمیم کے بغیر قبول کر لیا۔ جبکہ اسے قائداعظم کے نظریات کے مطابق تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ قائداعظم کے خدشات درست ثابت ہوئے اور سول وملٹری ملازمین عوام کے خادم بننے کی بجائے آقا بن گئے۔ پاکستان کے سول اور فوجی بیوروکریٹ ہمارے ملک کی سیاست، جمہوریت، عدالت، صحافت اور عوام سے جو سلوک کرتے چلے آرہے ہیں ان کی تفصیل آنے والے ابواب میں بیان کی جائے گی۔

قائداعظم کو سول اور ملٹری کے آفیسروں کے بارے میں جو خدشات تھے ان کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب ایوب خان کو مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں سردار عبدالرب نشتر کی معاونت کی ذمہ داری دی گئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے قائداعظم کو رپورٹ پیش کی کہ ایوب خان نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اور اس کا رویہ پیشہ وارانہ نہیں ہے۔ قائداعظم نے فائل پر لکھا۔

> "I know this Army officer. He is more interested in politics than the army matters. He is transferred to East Pakistan. He will not hold any command position for one year. He will not wear his badges during this period.[7]"

ترجمہ: ''میں اس آرمی آفیسر کو جانتا ہوں۔ وہ فوجی معاملات سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس کو مشرقی پاکستان ٹرانسفر کیا جاتا ہے۔ وہ ایک سال تک کسی کمانڈ پوزیشن پر کام نہیں کرے گا اور اس مدت کے دوران بیج نہیں لگائے گا۔''[7]

قائداعظم کی وفات کے بعد ایوب خان اپنی پوزیشن مستحکم بنانے میں کامیاب ہوگئے اور 1950ء میں جی ایچ کیو میں ایجوٹنٹ جنرل (Adjutant General) بن گئے۔ یہ فوج میں ایک اہم پوزیشن تھی۔ اس منصب کی وجہ سے وہ طاقت کے مرکزوں کے قریب ہوگئے۔ پاک فوج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی

[7] تنویر زاہد لاہور کا ایک خط 'ڈان' 29 دسمبر 2001 "Derailment of Democracy"۔ تنویر زاہد کا دعویٰ ہے کہ یہ خفیہ فائل کیبنٹ ڈویژن میں موجود ہے جسے ڈی کلاسیفائی نہیں کیا گیا۔

نے اپنی مدت ختم ہونے پر ایوب خان کو نیا کمانڈر انچیف بنانے کی سفارش کی اور وزیراعظم کو انتباہ کیا کہ اس کی سیاسی خواہشات پر نظر رکھی جائے۔[8] قائداعظم اگر زندہ ہوتے تو ایوب خان فور سٹار جنرل بننے سے پہلے ریٹائر ہوجاتے۔[9]

قائداعظم نے سٹاف کالج کوئٹہ میں فوجی آفیسروں کو خطاب کیا اور انہیں آئین اور حلف کا پابند رہنے کی تلقین کی۔

> "I have no doubt in my mind, from what I have seen and from what I have gathered, that the spirit of the Army is splendid, the morale is very high, and what is very encouraging is that every officer and soldier, no matter what the race or community to which he belongs, is working as a true Pakistani.
>
> If you all continue in that spirit and work as comrades, as true Pakistanis, selflessly, Pakistan has nothing to fear.
>
> "One thing more. I am persuaded to say this because during my talks with one or two very high-ranking officers I discovered that they did not know the implications of the oath taken by troops of Pakistan. Of course, an oath is only a matter of form; what is more important is the true spirit and the heart.
>
> "But it is an important form and I would like to take the opportunity of refreshing your memory by reading the prescribed oath to you:
>
> "I solemnly affirm, in the presence of Almighty God, that I owe allegiance to the Constitution and the Dominion of Pakistan (mark the words Constitution and the Government of the Dominion of Pakistan) and that I will as in duty-bound honestly and faithfully serve in the Dominion of Pakistan Forces and go within the terms of my enrolment wherever I may be ordered by air, land or sea and that I will observe and obey all commands of any officer set over me..."
>
> "As I have said just now, the spirit is what really matters. I should like you to study the Constitution which is in force in

[8] اسلم منہاس 'ڈان' 10 نومبر 2002 "Politics And The Army"

[9] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 30

Pakistan at present and understand its true constitutional and legal implications when you say that you will be faithful to the Constitution of Dominion.

I want you to remember and if you have time enough you should study the Government of India Act, as adapted for use in Pakistan, approved by the Governor-General and, therefore, any command or orders that may come to you cannot come without the sanction of the Executive Head. This is the legal position.'[10]

ترجمہ: ''جہاں تک میں مشاہدہ کر سکا ہوں اور اندازہ لگا سکا ہوں میرے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے کہ فوج کا جذبہ زبردست ہے، اس کا حوصلہ بلند ہے اور حوصلہ افزاء بات یہ ہے کہ فوج کا ہر افسر اور جوان چاہے وہ کسی نسل یا گروہ سے تعلق رکھتا ہوا ایک سچے پاکستانی کی طرح کام کر رہا ہے۔

اگر آپ یہی جذبہ جاری رکھیں اور کامریڈوں کی طرح اور سچے پاکستانیوں کی طرح بے غرضی سے اپنا کام جاری رکھیں تو پاکستان کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔

میں ایک اور بات کہنے پر مجبور ہوں کیونکہ مجھے ایک یا دو نہایت اعلیٰ فوجی افسروں سے گفتگو کر کے احساس ہوا وہ یہ کہ انہیں اس حلف کے مقصد کا اندازہ نہیں ہے جو افواج پاکستان نے اُٹھایا ہے۔ بلاشبہ حلف صرف ایک تحریر ہے مگر اصل اہمیت اس جذبے اور نیت کی ہے جس کے تحت یہ حلف اُٹھایا گیا۔

لیکن یہ ایک اہم تحریر ہے اور میں موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے مجوزہ حلف کی تحریر آپ کے سامنے پڑھنا چاہوں گا۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میں آئین اور سلطنت پاکستان کا وفادار رہوں گا (آئین اور گورنمنٹ آف ڈومینین پاکستان کے الفاظ کو ذہن میں رکھیے) اور میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے ڈومینین آف پاکستان کی افواج کی ذمہ داریاں، دیانت داری اور وفاداری سے پورا کروں گا۔ اپنی ملازمت کی شرائط پر عمل کرتے ہوئے بری، بحری اور فضائیہ جہاں پر حکم ملے گا، ڈیوٹی کروں گا اور اپنے افسروں کے احکامات بجا لاؤں گا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے جذبہ ہی اصل اہمیت کا حامل ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو اس وقت پاکستان میں نافذ ہے اور اس کے حقیقی آئینی اور قانونی تقاضوں کا ادراک کریں جب آپ یہ عہد کرتے ہیں کہ آپ ڈومینین کے آئین کے وفادار رہیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے یاد رکھیں اور وقت ملنے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا مطالعہ کریں جسے پاکستان میں نافذ کرنے کے لیے قبول کر کے، گورنر جنرل کی منظوری سے، موافق بنایا گیا۔ لہٰذا آپ کے پاس کوئی حکم یا ہدایات چیف ایگزیکٹو کی منظوری کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ یہی قانونی پوزیشن ہے۔''[10]

قائداعظم کا فوج کے افسروں سے یہ خطاب بڑا واضح اور غیر مبہم ہے۔ جس میں انہوں نے بڑے تکرار کے ساتھ اور زور دے کر آئین اور حلف کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ قائداعظم نے آئینی اور قانونی جنگ لڑ کر ہی پاکستان حاصل کیا تھا۔ وہ آئین پرست سیاسی شخصیت تھے اور قانون کی بالادستی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اعلیٰ ترین فوجی افسروں سے تبادلہ خیال کر کے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ فوج کے آفیسر آئین اور حلف کی اہمیت اور اس کے مضمرات کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فوجی افسروں کے اجلاس میں حلف کی عبارت پڑھ کر سنائی تا کہ وہ آئین اور حلف کی پابندی کر سکیں۔ کوئی بھی نئی ریاست آئین پر سختی سے عمل کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ سول اور ملٹری بیورو کریٹس نے قائداعظم کے احکامات اور نظریات سے انحراف کیا اور آئین کی قدر نہ کی اور اپنے حلف کو توڑتے رہے۔ اس عاقبت نااندیشی اور مصلحت کوشی کا خمیازہ آج پوری قوم بھگت رہی ہے۔ نوجوان نسل کو جس نے مستقبل میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے قائداعظم کے اساسی سیاسی فلسفہ سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ اسی جذبے کے تحت قائداعظم کی تقریروں کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں تا کہ نوجوان ان کی روشنی میں پاکستان کی تعمیر و تشکیل کر سکیں۔

بدقسمتی سے پاکستان کی سیاست اور حکومت پر ایسے طبقے قابض رہے ہیں جو قائداعظم کے سیاسی فلسفے کے مخالف تھے۔ پاکستان کو ایسے طبقات کے قبضے سے بازیاب کرانے کی ضرورت ہے جب تک ہم بحیثیت قوم صدق دل کے ساتھ بانی پاکستان کے نظریات کی جانب رجوع نہیں کرتے پاکستان عالمی افق پر ایک بھٹکا ہوا ملک ہی رہے گا۔

[10] قائداعظم محمد علی جناح: سٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے خطاب 14 جون، 1948

باب 2

فوج اور اثاثوں کی تقسیم

بھارتی افواج کے کمانڈر انچیف سر کلاوڈ آکن لیک (Sir Claude Auchinleck) کے پرائیویٹ سیکریٹری میجر جنرل شاہد حامد نے اپنی تصنیف (Disastrous Twilight) میں آزادی سے چند روز پہلے دہلی میں قائداعظم کی فوجی افسروں سے ایک ملاقات کی تفصیل بیان کی ہے جو چشم کشا ہے۔ اس محفل میں ایک فوجی افسر نے پاکستان کے بارے میں افسوسناک سوال کر دیا جسے سن کر قائداعظم رنجیدہ ہو گئے۔ شاہد حامد لکھتے ہیں:۔

3rd August (1947): Sometime ago I had met the Quaid and told him that the officers of the Armed Forces were anxious to get a glimpse of him. Most of them had never met the 'Great Founder of their country' and they were frightened of him. He pondered over my suggestion and said:

'What do you suggest'?

I told him that if he cared to come to our house one evening I would arrange a get-together.To my utter astonishment he agreed and even gave me a date, but said that he may be a little late as he had to attend a meeting of the Muslim League Committee of Action.

We had invited the Auk, the Naval and Air C-in-Cs, principal staff officers, some civil servants apart from all the senior Muslim officers of the Defence Forces, also some Hindu officers. For a while Tahirah and I waited at the entrance for the Quaid, but as he was held up at the meeting we joined our guests on the back lawn of our house, where everyone had assembled.

A little later the Quaid arrived. As Tahirah and I were not there to receive him, he walked through the house on to the

lawn. We apologised for not being at the entrance to receive him. He said that he was sorry at being late. I asked him whether he would like the guests to be introduced to him, to which he agreed.

To my surprise the Quaid was in a talkative mood. He had something to say to each person who was introduced to him. The officers gathered around him to ask all sorts of questions. He answered them in his characteristic manner – slowly, clearly and convincingly. It is always a pleasure to hear him explain his point of view. He meant what he said. He did no pretend to be what he was not. He did not mince his words. He put the problem which he will have to face squarely. I was with him most of the time. The only time he became solemn when someone asked him about the prospect of promotion in Pakistan. I could see from the look of Quaid's face that he did not like the question. In his typical style, he looked him over from head to foot before giving an answer.

'You Mussulmans, either you are up in the sky or down in the dumps. You cannot adopt a steady course. All the promotions will come in good time, but there will be no mad rush.'

To another question he replied, 'Pakistan's elected government will be that of civilians and anyone who thinks contrary to democratic principles should not opt for Pakistan.' He also said that all would have to work hard to build the new nation and guard and preserve the identity of the Islamic State and that our task was not easy.

He was full of praise for the Muslim minority in India, especially that of the United Province which he said spearheaded the Pakistan Movement and which supplied the leadership which played a great role in the establishment of Pakistan. He paid great tribute to the late Sir Syed Ahmed Khan who, he said, was the founder of the two nations theory.[1]

ترجمہ: ”3 اگست 1947ء: کچھ عرصہ پہلے میں نے قائد سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ فوجی آفیسران کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ان میں سے اکثر نے اپنے ملک کے

عظیم بانی سے کبھی ملاقات نہیں کی اور وہ (قائد) سے خوف زدہ ہیں۔انہوں نے میری تجویز پر ذرا سوچا اور کہا۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے“؟

میں نے اُن سے کہا کہ وہ کسی شام میرے گھر آنا پسند کریں تو میں تقریب کا اہتمام کر سکتا ہوں۔ میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے میری تجویز سے اتفاق کر لیا اور تاریخ بھی دے دی لیکن کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونا ہے لہٰذا ممکن ہے انہیں کچھ دیر ہو جائے۔

ہم نے آک (بھارت کے کمانڈر انچیف)، بحریہ اور فضائیہ کے چیفس، پرنسپل سٹاف آفیسرز، چند سول سرونٹس اور تمام سینئر مسلم فوجی افسروں کے علاوہ کچھ ہندو افسروں کو دعوت دی۔ میں نے طاہرہ کے ہمراہ کچھ دیر مین گیٹ پر قائداعظم کا انتظار کیا مگر وہ چونکہ میٹنگ میں مصروف تھے لہٰذا ہم اپنے گھر کے عقبی لان میں مہمانوں کے پاس چلے گئے، جہاں پر سب لوگ جمع تھے۔

کچھ دیر کے بعد قائد پہنچ گئے۔ چونکہ میں اور طاہرہ ان کا گھر کے دروازے پر استقبال نہ کر سکے اور وہ گھر سے گزرتے ہوئے لان میں پہنچ گئے۔ ہم نے معذرت کی کہ ان کا اپنے گھر کے باہر استقبال نہ کر سکے۔ انہوں نے تاخیر سے آنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ پسند کریں گے کہ مہمانوں کا ان سے تعارف کرایا جائے انہوں نے رضا مندی ظاہر کی۔

میں حیران ہوا کہ قائد باتیں کرنے کے موڈ میں تھے۔ جس شخص کا بھی ان سے تعارف کرایا گیا انہوں نے اس سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کی۔ افسر ہر قسم کے سوالات کرنے کے لیے ان کے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے منفرد طریقے سے آہستہ، صاف اور پُراثر انداز میں اُنہیں جوابات دیئے۔ جب وہ اپنا نقطۂ نظر وضاحت سے بیان کرتے تو اُن کو سن کر خوشی ہوتی۔ وہ وہی کہتے جس سے ان کی مراد ہوتی۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے کام نہ لیتے۔ وہ کھری بات کرتے تھے۔ وہ ایسا مسئلہ بھی بیان کر دیتے جس کا انہیں دیانت داری سے سامنا کرنا ہوتا۔ میں زیادہ وقت ان کے ساتھ رہا۔ وہ صرف اس وقت سنجیدہ اور جذباتی ہوئے جب ایک افسر نے پاکستان میں ترقی کے امکانات کے بارے میں سوال کیا۔ میں قائد کے چہرے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ انہوں نے اس سوال کو پسند نہیں کیا تھا۔ انہوں نے جواب دینے سے پہلے اپنے مخصوص انداز میں اسے (سوال کرنے والے) کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔

’آپ مسلمان یا تو آسمانوں سے باتیں کرتے ہو یا دھم سے نیچے گر پڑتے ہو۔ آپ متوازن راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ تمام ترقیاں اپنے وقت پر ہوں گی اور پاگل پن سے جلد بازی سے نہیں کی جائے گیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں قائد نے کہا ’پاکستان کی منتخب حکومت سول افراد پر مشتمل ہوگی جو بھی جمہوری اصولوں کے برعکس سوچتا ہے اسے پاکستان کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے‘۔

انہوں نے کہا کہ سب کو ایک نئی قوم کی تعمیر کے لیے اور اسلامی ریاست کی شناخت کے بچاؤ اور تحفظ کے لیے محنت کرنا ہوگی اور ہمارا کام آسان نہیں ہے۔

انہوں نے بھارت کی مسلم اقلیت کی بڑی تعریف کی، خاص طور پر یوپی کی۔ جس نے ان کے بقول تحریک پاکستان کے دوران ہراول دستے کا کام کیا اور ایسی قیادت فراہم کی جس نے پاکستان کے قیام کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے سرسید احمد خان کو بہت زیادہ خراج تحسین پیش کیا جو ان کے قول میں دوقومی نظریے کے بانی تھے۔‘‘❶

قیام پاکستان سے چند روز قبل قائداعظم کی مسلمان فوجی افسروں سے ملاقات کا احوال سیاسی اور عسکری مؤرخین کی نظر سے نہیں گزرا۔ میجر جنرل شاہد حامد 47-1946 میں برٹش انڈین آرمی کے آرمی چیف آکن لیک (Auchinleck) کے ساتھ پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض ادا کرتے رہے انہوں نے بھارت اور پاکستان کی تقسیم کو بڑے قریب سے دیکھا اور تمام واقعات کو اپنی پرسنل ڈائری میں ریکارڈ کیا اور 1990ء کی دہائی میں اسے شائع کرایا۔ قائداعظم کی مسلمان فوجی افسروں سے ملاقات کا احوال بڑا مستند حوالہ ہے کیونکہ اس ملاقات کا اہتمام اس واقعہ کے راوی میجر جنرل شاہد حامد نے اپنے گھر پر کیا تھا۔ اس ملاقات کے دوران ایک فوجی افسر کے پروموشن کے بارے میں کیئے گئے سوال سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ متحدہ بھارت کے مسلمان فوجی آفیسر کور (Officer Core) کو پاکستان کی آزادی کی خوشی کم تھی اور اپنی پروموشن کی فکر زیادہ تھی۔ آج فوج کی آفیسر کور قائداعظم کے پاکستان کی مختار کل بنی بیٹھی ہے۔ قائداعظم کو اندازہ تھا کہ متحدہ بھارت میں خدمات انجام دینے والے سول اور فوجی بیورو کریٹس پاکستان کو اپنی جاگیر بنانے کی کوشش کریں گے لہٰذا انہوں نے واضح کر دیا کہ پاکستان میں منتخب سویلین کی حکومت ہوگی اور جو کوئی جمہوری اصولوں کے برعکس سوچتا ہے وہ پاکستان منتقل ہونے کا خیال دل سے نکال دے۔ اس سے بڑا انتباہ اور کیا ہوسکتا تھا۔

فوج کا چونکہ تحریک پاکستان میں کوئی کردار نہیں تھا۔ لہٰذا فوجیوں کے دل میں پاکستان سے محبت اور وابستگی کے جذبات پیدا نہ ہوئے۔ مسلمان فوجی بھارتی فوج کا حصہ رہ کر اپنا بڑا اسٹیٹس قائم رکھنا چاہتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ علیحدہ ہوکر ان کی عسکری حیثیت اور شناخت کم ہوجائے گی۔ اس لیے وہ پاکستان آرمی

❶ میجر جنرل شاہد حامد "Disastrous Twilight" صفحہ 218-219

کے بجائے انڈین آرمی کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ البتہ یہ سوچ آفیسر کور کی تھی اور فوجی جوان اس سوچ کے حامل نہ تھے۔ آزادی کے بعد بھارت کو ایک منظم ریاستی ڈھانچہ مل گیا تھا، ادارے فعال تھے، صنعتیں موجود تھیں اور زراعت کا شعبہ بہتر حالت میں تھا۔ پاکستان ایک نئے ملک کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ اس کے پاس کوئی انڈسٹری نہیں تھی۔ زرعی منڈیاں بھی بھارت میں تھیں۔ پاکستان دنیا کی کل پٹ سن کا 75 فیصد پیدا کرتا تھا مگر اس کے پاس پٹ سن کی ایک انڈسٹری بھی موجود نہ تھی۔

برطانوی دور میں بھارت کی فوج اور دفاعی امور پر برطانوی حکومت کا کنٹرول تھا۔ بھارتی پارلیمنٹ کو صرف دفاعی بجٹ پر نظر ثانی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ بھارت کے رہنما مطالبہ کرتے رہے کہ پارلیمنٹ کو دفاعی اخراجات پر مکمل اختیار دیا جائے اور دفاع کا محکمہ وزیر کے سپرد کیا جائے جو پارلیمنٹ کو جواب دہ ہو۔ 1935ء کے ایکٹ میں بھی دفاع اور خارجہ امور کے اختیارات گورنر جنرل کو دیئے گئے جو اسمبلی کو جواب دہ نہیں تھا۔ جنوبی ایشیا میں سلامتی سے وابستہ برطانوی جرنیل تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ قوی امکان تھا کہ تقسیم کی صورت میں دونوں ریاستیں فوجی کنفیڈریشن میں رہیں گی اور ان کا دفاعی نظام مشترکہ ہوگا۔ معروف کانگریسی اور قوم پرست مسلمان رہنما ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری نے ایک کتاب ’’پاکستان‘‘ تحریر کی جس میں پاکستان کے دفاع کے بارے میں شکوک وشبہات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ پاکستان اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس کے پاس وسائل نہیں ہوں گے، ایک جانب اسے ایران اور جاپان سے خطرہ ہوگا، دوسری جانب سے اسے افغانستان اور روس سے دفاع کرنا پڑے گا جبکہ بھارت کے ساتھ طویل سرحد پر بھی فوج تعینات کرنی پڑے گی۔ پاکستان دفاعی لحاظ سے مصر اور برما کی طرح کا ایک کمزور ملک ہوگا۔ کانگریس کے سابق صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے آخری کوشش کی کہ انڈین آرمی کو متحد رکھا جائے مگر ان کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ قائداعظم نے دھمکی دی کہ اگر پاکستان کو اپنی فوج کا کنٹرول نہ دیا گیا تو وہ 14 اگست کو اقتدار قبول نہیں کریں گے۔ 15 اگست 1947ء کو مشترکہ ڈیفنس کونسل قائم کی گئی۔ گورنر جنرل انڈیا اس کے چیئرمین تھے۔ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف کو پاکستان اور بھارت کی افواج کا سپریم کمانڈر نامزد کیا گیا۔ پاکستان اور بھارت کے وزیر دفاع کونسل کے رکن تھے۔

9 جون 1947 کو قائداعظم نے نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"I have done my job. When the Field Marshal leads his army into victory, it is for the civil authority to take over."

ترجمہ: ’’میں نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔ جب فیلڈ مارشل آرمی کو فتح سے ہمکنار کرتا ہے تو اس کے بعد سول اتھارٹی کنٹرول سنبھال لیتی ہے۔‘‘

قائداعظم کے ان ریمارکس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی منصب کے خواہش مند نہیں تھے اور

حکومت پر سویلین کنٹرول کے حامی تھے۔ قائداعظم کے ان ریمارکس کو ''ڈان'' نے اپنے اداریے 18 اگست 1947 میں رپورٹ کیا۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی حکومت کو یقین دلا رکھا تھا کہ جناح ان کے گورنر جنرل بننے پر اعتراض نہیں کریں گے۔ قائداعظم کے انکار سے ماؤنٹ بیٹن کے دل میں پاکستان کے بارے میں تعصب کے جذبات پیدا ہوئے۔ کشمیر، اثاثوں کی تقسیم، باؤنڈری کمیشن اور ریاستوں کا الحاق ایسے اہم اور سنجیدہ مسائل تھے جنہیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حل کرنا تھا۔ وہ پہلے ہی ہندو نواز تھا اس کا جھکاؤ بھارت کی جانب ہو گیا۔ [2]

تحریک پاکستان کے ایک رہنما سردار شوکت حیات کے مطابق لیاقت علی خان اور ان کے رفقاء کو جب علم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن چھ ماہ کے لیے بھارت اور پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں تو ان کو خوف لاحق ہوا کہ اس صورت میں قائداعظم پاکستان کے وزیراعظم بن جائیں گے تو انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کے خلاف مہم شروع کر دی اور ہزاروں کی تعداد میں ٹیلی گرام قائداعظم کو بھجوائے جس سے قائد متاثر ہو گئے۔ قائداعظم نے سردار شوکت حیات کے ساتھ ایک ملاقات میں ان ٹیلی گراموں کا ذکر بھی کیا۔ [3]

عائشہ جلال مشترکہ گورنر جنرل کے مسئلہ پر لکھتی ہیں:۔

> On 2 July 1947, Jinnah formally told Mountbatten that he intended to become Pakistan's first Governor-General. Of course, Mountbatten was outraged. It complicated the partition process, as planned by him, and especially the already odious business of dividing the Indian army. Both parties wanted separate Commanders-in-Chief in charge of two newly-reconstituted armies by 15 August. Since the division of the army was not expected to be completed before 31 March 1948, a British Commander-in-Chief had to remain in charge and it was preferable that he should take orders from a Governor-General common to both Dominions.[4]

ترجمہ: ''2 جولائی 1947ء کو جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو باضابطہ طور پر بتادیا کہ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ ماؤنٹ بیٹن سخت ناراض ہوا۔ اس فیصلے سے تقسیم کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا اور ماؤنٹ بیٹن کی منصوبہ بندی متاثر ہوئی اور خاص طور پر بھارتی فوج کی تقسیم جیسا ناپسندیدہ کام بھی متاثر ہوا۔ دونوں ریاستوں کی خواہش تھی کہ 15 اگست تک دونوں

[2] ولی خان Facts are Facts; "The untold story of India and Pakistan" صفحہ 135

[3] سردار شوکت حیات خان "The nation that lost its soul" صفحہ 169-71

تقسیم شدہ افواج کے الگ الگ آرمی چیف نامزد کر دیئے جائیں۔ چونکہ فوج کی تقسیم کا کام 31 مارچ 1948ء سے پہلے مکمل ہونے کی توقع نہ تھی اس لیے برطانوی کمانڈر انچیف کے لیے دونوں افواج کا انچارج رہنا ضروری تھا اور مناسب یہی تھا کہ وہ دونوں ریاستوں کے مشترکہ گورنر جنرل سے احکامات لے۔'' [4]

میجر جنرل شاہد حامد کے مطابق اگر ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر تسلیم کر لیا جاتا تو وہ دہلی میں اپنا دفتر قائم کرتے اور ہندو انہیں ڈکٹیٹ کرتے۔ پاکستان کے عوام پر منفی اثرات مرتب ہوتے اور وہ محسوس کرتے کہ آزادی کے بعد بھی ایک انگریز ان کے مقدر کے فیصلے کر رہا ہے۔ اس طرح قائداعظم کی لیڈر شپ پر عوام کا اعتماد مجروح ہوتا۔ [5]

Time میگزین نے 13 ستمبر 1948 کی اشاعت میں تحریر کیا:۔

> "No succeeding Governor-General can quite fill his place, as the "Father of the Nation" his prerogatives were enlarged by popular acclaim far beyond of limits laid down in the Constitution."

ترجمہ: ''کوئی جانشین گورنر جنرل ان کی جگہ پُر نہیں کر سکتا تھا۔ بابائے قوم کی حیثیت سے ان کا استحقاق آئین میں درج حدود سے کہیں زیادہ عوامی پسندیدگی کا حامل تھا۔''

دستور ساز اسمبلی نے قائداعظم کو اسمبلی کا صدر منتخب کر لیا۔ قائداعظم حالات کی نزاکت اور حساس نوعیت کے مسائل کے پیش نظر تمام اندرونی، بیرونی معاملات اور تقسیم کے امور اپنی اتھارٹی میں رکھنا چاہتے تھے۔ اگر وہ وزیراعظم بن جاتے تو انہیں آئین اور قوانین کے مطابق گورنر جنرل سے احکامات لینے پڑتے۔ پاکستان کے مقابلے میں بھارت ایک بڑا ملک اور بڑی منڈی ہے لہٰذا قدرتی طور پر برطانیہ کا جھکاؤ بھارت کی جانب تھا۔ قائداعظم کے گورنر جنرل بننے سے فوج اور اثاثوں کی تقسیم اور ریاستوں کے الحاق میں دشواریاں پیش آئیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن مشترکہ گورنر جنرل بن جاتے تو پاکستان کی مشکلات پھر بھی کم نہ ہوتیں۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت بھارت میں جو فوج موجود تھی اس کے پس منظر اور ذہنی ساخت کے بارے میں بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی لکھتے ہیں:۔

''انگریزوں نے ہندوستان کو فتح نہیں کیا بلکہ ہندوستان سے ہی دیسی فوج بھرتی کر کے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور لگ بھگ ڈیڑھ سو سال اسی دیسی فوج کے سہارے پورے برصغیر پر قبضہ قائم رکھا۔ انگریزوں کی افواج میں بعد میں بھی گورا سپاہیوں کی تعداد کبھی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوئی۔ البتہ افسر دیسی

[4] عائشہ جلال "The Sole Spokesman" صفحہ 292

[5] میجر جنرل شاہد حامد "Disastrous Twilight" صفحہ 200

(ہندوستانی) فوج میں بھی سب کے سب انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ صرف ان انگریز افسروں کے سہارے پر برصغیر میں انگریزوں کی سلطنت قائم تھی۔ اسی طرح دیسی فوج کی حیثیت محض کرائے کے سپاہیوں کی تھی۔"❻

30 جون 1947ء کو افواج کی تقسیم کے لیے قائم کونسل کا اجلاس ہوا جس میں قائداعظم شریک ہوئے۔ کونسل کے فیصلوں کے مطابق طے پایا تاوقتیکہ ہندوستانی افواج دو حصوں میں تقسیم نہ ہو جائیں اور دونوں حکومتیں اپنی اپنی فوج کو تنخواہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائیں یہ افواج ایک واحد انتظامی یونٹ کے طور پر کام کریں ۔ افواج کی تقسیم مکمل ہونے تک فیلڈ مارشل سرکلاوُڈ آکن لیک سپریم کمانڈر کے طور پر کام کریں گے۔ انڈین یونین اور پاکستان کے کمانڈر انچیف فوری طور پر نامزد کیے جائیں گے۔ موجودہ افواج مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہوں گی۔ فوج کے ایسے یونٹ جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہ پاکستان سے باہر مقیم ہوں انہیں جلد پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ اسی طرح جن یونٹوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو اور وہ پاکستان کے علاقوں میں مقیم ہوں انہیں انڈین یونین کی حدود میں منتقل کر دیا جائے گا۔ بھارت اور پاکستان کے فوجی اثاثوں کا تناسب 64:36 تھا جو کم و بیش ہندوؤں اور مسلمانوں کے تناسب کے برابر تھا۔

ہندوستان کی کل چار لاکھ فوج تھی جو ملی جلی تھی اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی تھی۔ 47-1946ء میں فوج کے آفیسر کور میں 80 فیصد افسر ہندوستانی تھے۔ مسلمانوں کا کوئی الگ فوجی یونٹ نہ تھا۔ عسکری ادارے اور فوجی ساز و سامان کے ذخیرے بھارتی علاقے میں تھے۔ پاکستان کو چار لاکھ فوج میں سے ڈیڑھ لاکھ فوج ملی جو تقریباً 33 فیصد بنتی ہے۔ پاکستان کے پاس بحریہ اور فضائیہ کی کمی تھی۔ کراچی اور چٹاگانگ میں اہم بحری تنصیبات تھیں اور کوئٹہ میں ایک سٹاف کالج تھا۔ پاکستان کو چار ہزار فوجی افسروں کی ضرورت تھی لیکن اس کے پاس صرف ڈیڑھ ہزار افسر تھے جن میں پانچ سو برطانوی تھے۔ ایک میجر جنرل، 2 بریگیڈیئر اور 53 کرنل تھے۔ عارضی کمیشن، شارٹ سروس اور اہلیت و تجربہ کے بغیر پروموشن دے کر افسروں کی کمی پوری کی گئی۔

پاکستان کو 165000 ٹن آرڈیننس (Ordnance) سٹور میں سے صرف 4703 ٹن اسلحہ ملا جو 3 فیصد بنتا ہے۔ 249 ٹینکوں میں سے ایک ٹینک بھی پاکستان کو نہ ملا۔ جنرل گل حسن کے مطابق پاکستان کو جو اسلحہ دیا گیا وہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ گورنر سرحد سر جارج کننگھم نے اپنی ڈائری میں 16 اکتوبر 1947ء کو تحریر کیا کہ سکھوں کو فضائیہ کے ذریعے بلجیم کی رائفلیں پہنچائی گئیں۔ پاکستان کے پاس اسلحہ کی کمی تھی۔ گورنر کننگھم نے کمانڈر انچیف میسروی کو نوٹ روانہ کیا اور وہ لندن سے کچھ اسلحہ لے کر آئے۔ کل مالیاتی ذخائر چار ہزار ملین روپے تھے۔ پاکستان کا کلیم ایک ہزار ملین روپے کا تھا مگر اسے صرف 750 ملین روپے دینے کا فیصلہ ہوا جو 15 فیصد بنتے ہیں۔ 200 ملین روپے پاکستان کو فوری طور پر مل گئے باقی کشمیر کے ساتھ مشروط کر دیئے گئے۔ بھارت کے مرکزی لیڈر مہاتما گاندھی نے بطور احتجاج بھوک ہڑتال کی تو پاکستان کو 500 ملین روپے مزید مل گئے اور 50 ملین روپے باقی رہ گئے۔ انڈین سول سروس کے 1157 افسروں میں سے صرف

❻ بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی۔ "وقت کے ساتھ ساتھ"

101 مسلمان تھے۔ جن میں سے 95 افسروں نے پاکستان میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ 11 مسلم ملٹری آفیسر سول سروس میں شامل ہوگئے۔ 51 برطانوی سول سروس میں آئے۔ اس طرح کور سول سروس 157 افراد پر مشتمل تھی۔ یہ دنیا کی ایک بڑی بیوروکریسی تھی جسے خصوصی مراعات حاصل تھیں جو پاکستان کے ابتدائی بیس سالوں میں بڑے اہم اور فعال کردار کی حامل رہی۔ جس نے پاکستان کا عدالتی، سفارتی، آئینی اور انتظامی ڈھانچہ تیار کیا۔ سول سروس برطانوی تربیت یافتہ تھی لہٰذا اس کا مزاج ہی بیوروکریٹک تھا۔

قیام پاکستان کے وقت مالی وسائل کی سخت کمی تھی۔ ڈھاکہ میں جی ایچ کیو، ہائی کورٹ کی بلڈنگ کے اندر قائم کرنا پڑا۔ راولپنڈی میں جی ایچ کیو مالی مشکلات کا شکار تھا۔ فوج کے اخراجات کے لیے 35 سے 50 ملین روپے ماہانہ کی ضرورت تھی۔ ابتدائی سالوں میں 70 فیصد بجٹ فوج پر صرف کرنا پڑا۔ سول سرونٹس فائلوں کے لیے لوہے کی پنوں کی بجائے درختوں کے کانٹے استعمال کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں میں مناسب سامان موجود نہیں تھا۔ مالی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ پاکستان کے وزیر خزانہ چوہدری محمد علی نے گورنر جنرل پاکستان قائداعظم کی کارری کنڈیشن کرانے کے لیے فنڈز مہیا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ خزانہ خالی تھا۔ پاکستان کو سرحدوں کے دفاع اور اندرونی استحکام کے لیے فوج اور اسلحہ کی ضرورت تھی۔ فسادات پر قابو پانے کے لیے اور مہاجرین کی منتقلی اور آبادکاری کے لیے فوج کے علاوہ اور کوئی ادارہ نہیں تھا۔ بھارت نے کشمیر کے اندر اپنی فوجیں داخل کر دی تھیں اور کشمیر میں پاک بھارت جنگ نے فوج کے ادارے کو پاکستان کی پہلی ترجیح بنا دیا تھا۔ بھارت کی فوج نے آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ انگریز نے فوج کو سیاست سے الگ رکھا تا کہ اس کی پیشہ وارانہ صلاحیت متاثر نہ ہو۔ ناردرن کمانڈ کے جی او سی سر فرینک میسروی پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف نامزد ہوئے۔ دوسرے کمانڈر انچیف بھی برطانوی جنرل گریسی تھے۔ جنہوں نے کشمیر میں فوجیں بھیجنے کے لیے گورنر جنرل پاکستان قائداعظم کے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تکنیکی طور پر جائنٹ ڈیفنس کونسل کے چیئرمین لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کمانڈ میں تھے جنہوں نے کشمیر کی جانب پیش قدمی کی اجازت نہ دی۔

پاکستان کے تاجر اور صنعت کار بھی اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں پرامید نہ تھے اور اپنا سرمایہ پاکستان سے باہر منتقل کر رہے تھے۔ ان کو شاید یہ خوف تھا کہ نئی ریاست مالی دشواریوں کی بناء پر ان کا سرمایہ بحق سرکار ضبط نہ کر لے۔ عائشہ جلال اس صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں:۔

"There was a very strong rumour in Karachi business circles that Chief Minister of Sindh Ghulam Hussain Hidayatullah designated as governor of the province had transferred a large sum of money to certain unnamed banks in New Delhi."❼

ترجمہ: "کراچی کے تجارتی حلقوں میں افواہ گرم تھی کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ نے جنہیں صوبے کا گورنر نامزد کیا گیا تھا بھاری سرمایہ دہلی کے گمنام بنکوں میں منتقل کیا ہے۔"❼

❼ عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 36

پاکستان میں فسادات ہورہے تھے۔ بھارتی لیڈر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بدگمانیاں پھیلا رہے تھے۔ لہٰذا سرمایہ پاکستان سے باہر منتقل ہورہا تھا۔ کراچی میں امریکی قونصل جنرل کے مطابق جولائی 1947ء میں پنجاب سے 3 ارب روپے اور سندھ سے 200 سے 300 ملین روپے پاکستان سے باہر منتقل ہوئے۔

سید نور احمد کہتے ہیں:۔

''مملکت پاکستان کی مشینری میں ایک اور بہت بڑا خلا یہ تھا کہ جب یہ مملکت وجود میں آئی تو بینکنگ اور کرنسی کے لیے اس کا کوئی اپنا نظام موجود نہ تھا اور ہو بھی نہ سکتا تھا۔ اس انتظام کے لیے ملک کے وجود میں آنے کے بعد ہی قدم اٹھایا جاسکتا تھا۔ لہٰذا تقسیم کے وقت ریزرو بینک آف انڈیا کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک معاہدے کے ذریعے 30 ستمبر 1948ء تک کے لیے حکومت پاکستان کا خزانہ اور پاکستان کے لیے کرنسی فراہم کرنے، اس کی مقدار پر کنٹرول رکھنے کی ذمہ داری اس کی تحویل میں دے دی گئی تھی۔'' [8]

پاکستان کی فوج برطانوی انڈین فوج کی وارث ہے۔ اس کو روایات و رسومات ورثے میں ملیں۔ پاک فوج کے رینک، فارمیشن اور ٹریننگ کے اصول وہی ہیں جو برطانوی فوج کے تھے۔ اس کے پروٹوکول اور یونیفارم کا ڈیزائن بھی وہی ہے اور اس پر برطانوی ماڈل کے بیج سجائے جاتے ہیں۔ اسلحہ کے ڈیزائن بھی روایتی ہیں۔ برطانوی انڈین فوج نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور دنیا کی اہم ترین افواج میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ڈسپلن، وفاداری اور محب الوطنی کے لحاظ سے برطانوی انڈین آرمی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ پاک فوج فکر، ذہن، مزاج اور فطرت کے لحاظ سے برطانوی فوج کی روایات کی امین ہے۔ اسے مزاج، فطرت اور سٹرکچر کے اعتبار سے ایک اسلامی اور پاکستانی فوج بنانے کے لیے سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد فوجی افسروں کی کمی کو قبل از وقت ترقیاں دے کر پورا کیا گیا۔ پاکستان کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو چار سال کے اندر لیفٹیننٹ کرنل سے جنرل پروموٹ کیا گیا۔ فوج کا پہلا پاکستانی کمانڈر انچیف 1951 میں جبکہ بحریہ کا چیف 1953 اور فضائیہ کا چیف 1957ء میں نامزد ہوئے۔ ان سے پہلے بری، بحری اور فضائیہ کے چیف برطانوی تھے۔ [9] ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد جو مسلم فوج پاکستان کے حصے میں آئی وہ پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک کمزور فوج تھی اور درجنوں نان کمیشنڈ افسروں کو تربیت کے لیے امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ''پاکستانیت'' کے کلچر کی ضرورت تھی مگر طویل عرصہ برطانوی اور نو آبادیاتی مزاج اور ذہن کے حامل فوجی افسر انتہائی اہمیت کے حامل ادارے افواج پاکستان پر قابض رہے۔ نئی ریاست کے دوسرے ادارے چونکہ ابتداء سے ہی فوج کے افسروں کے دباؤ میں رہے لہٰذا قوم پرستی کا جذبہ پروان نہ چڑھ سکا۔

---

[8] سید نور احمد — ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' — صفحہ 357

[9] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی — "The Military and Politics in Pakistan" — صفحہ 33

باب 3

سیاسی عسکری کشمکش کے دس سال

لارڈ میکالے نے 1935ء میں لکھا کہ ہمیں ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے جو برطانیہ اور اس کی رعایا کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکے۔ یہ طبقہ رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگا مگر اس کا ذوق، اس کے درشن، سوچ اور اقدار سب برطانوی ہوں۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کا سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ ایک آزاد ملک میں غلام دور کے آقائی اثرات اور بیورو کریٹک کلچر جڑ نہ پکڑ لے۔ چنانچہ انہوں نے اوّلین فرصت میں سول اور ملٹری افسروں سے خطاب کر کے اپنے ان خدشات کا برملا اظہار کیا اور انہیں پرانی سوچ ترک کر دینے کا مشورہ دیا۔ قائداعظم کا دوسرا خدشہ یہ تھا کہ پاکستان میں موجود اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری نہ بنا دیا جائے۔ وہ خود بھارت میں مسلم اقلیت کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کے بے باک ترجمان رہے تھے اور پاکستان میں مقیم اقلیتوں کو بلا لحاظ مذہب مساوی حقوق دینا چاہتے تھے۔ ان کا تیسرا خدشہ یہ تھا کہ پاکستان تھیوکریسی پر مبنی ریاست نہ بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے 11 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے بعد اسمبلی سے اپنے یادگار خطاب میں پاکستان کی ریاست کی تشکیل کے بارے میں اپنا نظریہ کھل کر بیان کیا تاکہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانے اور غربت کے خاتمے پر زور دیا۔ اور اعلان کیا کہ پاکستان کے تمام شہریوں کو مساوی مواقع، حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی۔ رنگ، نسل، مذہب اور عقیدہ کی بنا پر کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ قائداعظم نے اپنے پالیسی خطاب میں کہا:۔

> "You are free, you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan. You may belong to any religion or caste or creed – that has nothing to do with the business of the State.
>
> Now I think we should keep that in front of us as our ideal and you will find that in course of time, Hindus would cease

to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the State. ❶

ترجمہ: ''اب آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے میں آزاد ہیں، آپ اس ریاست میں اپنی مساجد یا کسی عبادت گاہ پر جانے میں آزاد ہیں میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبار مملکت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں''۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔'' ❶

پاکستان کے بعض مؤرخ اور دانشور قائداعظم کے اس خطاب کو پالیسی بیان کے طور پر تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بارے میں مختلف تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ قائداعظم نے 1946ء میں دہلی میں رائٹر (Reuters) کے نامہ نگار ڈون کیمبل (Doon Campbell) کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا:۔

"The new state would be modern democratic state with sovereignty resting in the people and the members of the new nation having equal rights of citizenship regardless of their religion, caste or creed."❷

ترجمہ: ''نئی ریاست جدید جمہوری ریاست ہوگی جس میں اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہوگا اور نئی قوم کے اراکین کو شہریت کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور مذہب، ذات پات اور عقیدے کی بناء پر ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔'' ❷

قائداعظم نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی منظوری دی۔ لیاقت علی خان کو وزیراعظم، ایک احمدی سر ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ، ایک سابق سول سرونٹ غلام محمد کو وزیر خزانہ، ایک اچھوت ہندو جگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون بنایا۔ پنجاب میں سر فرانسس موڈی، سرحد میں جارج کنگھم اور مشرقی بنگال میں ایف سی بورن کو گورنر مقرر کیا۔ یہ نامزدگیاں قائداعظم کے سیاسی اور جمہوری فلسفہ اور 11 اگست 1947ء کے خطاب کی ترجمان تھیں۔ قائداعظم پاکستان کو ایک جدید، لبرل اور جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے۔

آئی ایس آئی قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں قائم کی گئی جبکہ آئی بی اور سپیشل برانچ انگریز دور سے

❶ قائداعظم خطاب دستور ساز اسمبلی 11 اگست 1947

❷ محمد منیر "From Jinnah To Zia" صفحہ 29

کام کر رہی تھیں۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں جانب انسانی تاریخ کی منفرد اور بے مثال ہجرت دیکھنے میں آئی۔ ہجرت کرنے والے انسانوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ تعداد کا درست اندازہ ممکن نہیں ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندو، سکھ اور مسلم فسادات میں 2 لاکھ انسان ہلاک ہوئے۔ آزادی کے رہنماؤں نے کبھی ایسے المیے کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ ایک نئی ریاست پاکستان کے لیے مہاجرین کی منتقلی اور آبادکاری ایک سنگین مسئلہ تھا۔ ہجرت کے دوران ہجرت مدینہ کے مناظر بھی دیکھنے کو ملے۔ بااثر افراد اور سرکاری ملازمین نے لوگوں کو بلیک میل بھی کیا۔ فوج چونکہ واحد منظم ادارہ تھی لہٰذا مہاجرین کی منتقلی، آبادکاری اور سکیورٹی کے لیے فوج نے قابل رشک کردار ادا کیا اور قدرتی طور پر فوج کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ہنگامی حالات میں فرائض انجام دینے کا واحد ادارہ ہے۔ تحریک پاکستان کا جذبہ مختصر عرصہ کے لیے کارفرما رہا۔ متروکہ املاک نے ابتداء ہی میں پاکستان کے اداروں کو کرپٹ کر دیا جو ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہونے نہ پائے تھے۔ کانگریس نے آزادی کے بعد اداروں کی تشکیل کے لیے ہوم ورک کر رکھا تھا اور مختلف شعبوں میں اصلاحات (reforms) کے لیے پالیسی پیپرز بھی تیار کر رکھے تھے۔ لہٰذا بھارتی رہنماؤں کو اداروں کی تشکیل اور قومی پالیسیوں کے نفاذ کے راستے میں دشواریاں پیش نہ آئیں۔ مسلم لیگ کے لیڈر تحریک پاکستان میں مصروف رہے، ان کو شاید ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا یقین نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کسی نہ کسی انداز میں متحدہ بھارت کا ایک حصہ ہوگا۔ عائشہ جلال کے مطابق قائداعظم ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن کے لیے تیار تھے۔ ❸ ڈاکٹر صفدر محمود عائشہ جلال کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہیں۔ قائداعظم نے 25 اکتوبر 1947ء کو رائٹر کے نمائندے کو ایک انٹرویو دیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم لیگ آزادی کے بعد درپیش آنے والی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

''مسلم لیگ نے اپنا مقصد ''آزاد مملکت پاکستان کا قیام'' حاصل کر لیا ہے۔ مسلم لیگ کے باقی اغراض و مقاصد عمومی نوعیت کے تھے۔ یعنی ہندی مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دوسرے حقوق و مفادات کا تحفظ و فروغ اور ہندی مسلمانوں کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات کا قیام و فروغ۔ قیام پاکستان کے بعد بہت جلد مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس بلانے کا خواہاں تھا کیونکہ صورت حال میں جو تبدیلیاں ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں مسلم لیگ کی تنظیم کی نئے سرے سے تشکیل ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے لیے بڑی سنگین صورتحال پیدا کر دی گئی (مہاجرین اور فسادات) اور ہم اس سے نمٹنے میں اس حد تک مصروف ہو گئے کہ ہمیں اس مسئلہ اور کئی دوسرے درپیش مسائل پر توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ مسائل ابھی تک ہماری فوری اور بھرپور توجہ کے متقاضی ہیں۔'' ❹

❸ عائشہ جلال "Sole Spokesman" صفحہ 260

❹ ڈاکٹر صفدر محمود ''مسلم لیگ کا دور حکومت'' صفحہ 38 پاکستان ٹائمز 26 اکتوبر 1947

بھارت کو ایک بنی بنائی ریاست مل گئی۔ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے ادارے مل گئے۔ پاکستان کو ایک نئی ریاست تشکیل دینا پڑی۔ نئی حکومت، نئی وزارت، نیا سفارتی عملہ، نئی پولیس اور نئی کرنسی بنانی پڑی۔ پاکستان نے چند ماہ بھارتی کرنسی پر پاکستان کی سٹیمپ لگا کر کام چلایا۔ نیا سینٹرل بنک اور نیا عدالتی نظام تشکیل دینا پڑا۔ قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دے کر بنگالیوں کو ناراض کرلیا۔ اردو اور بنگالی دو سرکاری زبانیں ملک کے مفاد میں ہوتیں۔

انگریز کے دور میں سول ملٹری بیوروکریٹس بڑے بااختیار تھے اور براہ راست گورنر جنرل سے رابطہ کر لیتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بیوروکریٹ محمد علی نے حکومت پاکستان کا سیکرٹری جنرل کا منصب نامزد کرنے کے لیے قائداعظم کو راضی کرلیا۔ اور خود گورنمنٹ آف پاکستان کے سیکریٹری جنرل بن گئے اور کیبنٹ پلاننگ کمیٹی تشکیل دی تمام وزارتوں کے سیکریٹری اس کمیٹی کے رکن تھے۔ وہ کیبنٹ کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کرتے حکومت کی پالیسیاں تشکیل دیتے جنھیں مرکزی کابینہ میں رسمی منظوری کے لیے پیش کیا جاتا۔ محمد علی سیکریٹری جنرل کی حیثیت میں متوازی وزیراعظم کی طرح ایکٹ کرنے لگے ابتدائی سالوں میں سول بیوروکریسی نے ریاست پر بالادستی حاصل کرلی۔ جب ایک اور بیوروکریٹ غلام محمد گورنر جنرل بنے تو انہوں نے سیکریٹری جنرل کا عہدہ ختم کردیا۔ اس طرح اختیارات ایک بیوروکریٹ سے دوسرے بیوروکریٹ کو منتقل ہوگئے اور سیاست دان ثانوی حیثیت اختیار کرگئے [5]۔

پاکستان ابھی مہاجرین کی منتقلی اور فسادات سے پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹ رہا تھا کہ 25 اکتوبر 1947ء کو ریاست جموں و کشمیر کے ڈوگرہ حکمران نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کرکے پاکستان کی سیاسی صورت حال کو مزید پیچیدہ بنادیا۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم نے قائم مقام کمانڈر انچیف سرڈگلس گریسی (Sir Douglas Gracey) کو احکامات جاری کیے کہ وہ کشمیر میں افواج بھیج کر امن وامان قائم کرے۔ میجر جنرل شاہد حامد کے مطابق:

"On 27th October he ordered Gracey to move troops into Jammu and Kashmir and to seize Srinagar and the Banihal Pass. Gracey replied that he could not comply with the order and must report the matter to Auchinleck as compliance would entail the issue of 'Stand Down Order No.2' which meant the withdrawal of the British officers from the Pakistan Army. According to Gracey's private secretary, Wilson, Mountbatten rang up Gracey and threatened that if he moved any troops to Kashmir he would ensure that he would not get his knighthood. Gracey capitulated." [6]

---

[5] اعتزاز احسن "Divided By Democracy" صفحہ 98-100

ترجمہ: ''27 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے گریسی کو حکم دیا کہ افواج پاکستان کو جموں اور کشمیر بھیجا جائے اور سری نگر اور درہ بانیہال پر قبضہ کرلیا جائے۔ گریسی نے جواب دیا کہ وہ احکامات کی تعمیل نہیں کرسکتا اور اسے یہ معاملہ آکن لیک کو رپورٹ کرنا لازمی ہے۔ احکامات کی تعمیل کا لازمی نتیجہ ''سٹینڈ ڈاؤن آرڈر نمبر 2'' کا اطلاق ہوگا۔ جس کا تعلق پاکستان آرمی سے برطانوی افسروں کی علیحدگی سے ہے۔ گریسی کے پرائیویٹ سیکریٹری ولسن کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے گریسی کو فون کیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے فوج کو کشمیر کی جانب روانہ کیا تو وہ یقین کرلے کہ اسے نائٹ ہڈ کا خطاب نہیں ملے گا۔ گریسی نے مشروط اطاعت کی۔'' [6]

میجر جنرل شاہد حامد چونکہ بھارت کے کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ لہٰذا ان کے بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ افواج پاکستان کی تاریخ رقم کرنے والے مصنفین نے ماؤنٹ بیٹن کی اس دھمکی کا ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے مطابق فیلڈ مارشل آکن لیک نے 28 اکتوبر 1947 کو لاہور پہنچ کر قائداعظم سے ملاقات کی اور انہیں اپنا حکم واپس لینے پر آمادہ کرلیا۔ [7]

میجر جنرل شیر خان کی ہدایت پر قدرت اللہ شہاب نے 48-1947 کی کشمیر جنگ کے بارے میں تحقیقات کی تو یہ راز فاش ہوا کہ کشمیر کی جنگ کے دوران میجر یحیٰی خان اور لیفٹیننٹ کرنل اعظم خان محاذ سے بھاگ گئے تھے اور انہوں نے اپنی رجمنٹ کے جوانوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا تھا۔

بھارت نے فوری طور پر اپنی افواج طیاروں کے ذریعے سری نگر میں اتاردیں۔ دفاعی وسائل کی کمی کی وجہ سے پاکستان کی افواج پورے کشمیر پر قبضہ نہ کرسکیں۔ قبائلی مجاہدین نے بھارتی افواج کا مقابلہ کرکے آزاد کشمیر کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ کشمیر پر پاک بھارت جنگ کچھ عرصہ جاری رہی اور آخر کار اقوام متحدہ نے سیز فائر کرادیا اور ایل او سی وجود میں آئی۔

ابتداء ہی میں کشمیر پر پاک فوج کی ناکامی نے سکیورٹی کو پاکستان کی اولین ترجیح بنادیا۔ فوج کو مضبوط بنانے کا احساس پیدا ہوا۔ پاکستان کی آزادی میں فوج کا کوئی کردار نہیں تھا۔ البتہ آزادی کو محفوظ بنانے کے لیے فوج کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے پاس فوج کے لیے مناسب وسائل موجود نہیں تھے۔ اکتوبر 1947ء میں پاکستان نے امریکہ سے دو بلین ڈالر قرضے کی درخواست کی۔ امریکہ میں پاکستان کے نمائندے نے تسلیم کیا کہ پاکستان کی اندرونی سیاسی صورت حال کا انحصار امریکہ اور برطانیہ پر ہے۔ ابتداء میں امریکہ نے پاکستان کے غیر یقینی مستقبل کی بناء پر قرضہ دینے سے گریز کیا۔ دفاع کی بنا پر مرکز نے ضرورت سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی۔ ایسے ملکوں کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی جو پاک فوج کو مستحکم بنانے کے لیے عسکری اور مالی امداد فراہم کرسکیں۔ پاکستان کی سکیورٹی کا مسئلہ اس قدر اہمیت اختیار کرگیا کہ ابتدائی

---

[6] میجر جنرل شاہد حامد "Disastrous Twilight" صفحہ 277
[7] ڈاکٹر مبشر حسن ''حاکمیت کا حکمران'' صفحہ 40

سالوں میں پاکستان کو اپنے بجٹ کا ستر فیصد دفاع پر خرچ کرنا پڑا۔ [8] فوج رفتہ رفتہ مضبوط ہوتی گئی جبکہ جمہوری اور سیاسی ادارے مستحکم نہ ہوسکے۔ مسلم لیگ 1940 کے بعد ایک عوامی جماعت بنی تھی۔ مسلم لیگ میں زیادہ تر سیاست دان 47 - 1944 کے دوران شامل ہوئے جن کو سیاست اور حکومت چلانے کا تجربہ نہیں تھا۔ سکیورٹی کے مسائل کی وجہ سے وسائل اور اقتدار کی تقسیم صوبوں تک نہ ہوسکی اور مسلم لیگ ایک مقبول عام عوامی جماعت نہ بن سکی۔ [9] ناتجربہ کار سیاست دان ایک آزاد ملک میں پیدا ہونے والے پیچیدہ بحران کو حل نہ کرسکے۔

جنرل ایوب مشرقی پاکستان میں جی او سی تھے۔ یکم جنوری 1948ء کو انہیں جذباتی سیاست کا منظر دیکھنے کا موقع ملا۔ طلبہ اپنے مطالبات کے لیے احتجاج کررہے تھے اور اسمبلی کی بلڈنگ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ جنرل ایوب نے فوجی یونٹ کی مدد سے اسمبلی کو گھیرے میں لے لیا اور پرجوش طلبہ کو اسمبلی کی عمارت میں داخل ہونے سے روکا۔ [10] یہ پہلا موقع تھا کہ جنرل ایوب کو احساس ہوا کہ سیاست دان ہنگامی صورت حال میں فوج کی مدد کے بغیر اپنا تحفظ بھی نہیں کرسکتے۔ ایوب خان نے جی او سی کی حیثیت سے محمد علی بوگرہ کو (جو اس وقت اپوزیشن لیڈر تھے) یہ الفاظ کہہ دیئے۔

"Are you looking for a bullet"? [11]

ترجمہ: ''کیا آپ گولی کا انتظار کررہے ہیں۔'' [11]

اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فوج کے افسر 1948ء میں ہی سیاست دانوں پر حاوی ہوگئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نئی ریاست کے بنیادی مسائل برق رفتاری کے ساتھ حل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی تیزی سے بگڑتی ہوئی صحت کی وجہ سے یہ اندازہ تھا کہ ان کی زندگی زیادہ دیر ان سے وفا نہیں کرے گی۔ لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ وقت ضائع کیے بغیر پاکستان کی بنیادیں مضبوط بنادی جائیں تاکہ نومولود ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے۔ قائداعظم، لیاقت علی خان کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کے لیاقت علی خان سے تعلقات اس قدر کشیدہ ہوگئے کہ جب لیاقت علی خان زیارت میں قائداعظم کی تیمارداری کے لیے گئے تو انہوں نے اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح سے کہا۔

"Do you know why he has come. He wants to know how serious my illness is, how long I will last." [12]

ترجمہ: ''تم جانتی ہو کہ وہ (لیاقت علی خان) کیوں آیا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ میری بیماری کتنی شدید ہے اور میں کتنی دیر زندہ رہوں گا۔'' [12]

[8] Brian Cloughley "A History of the Pakistan Army" صفحہ 39
[9] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 55
[10] جنرل ایوب خان ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' صفحہ 29
[11] Brian Cloughley "A History of the Pakistan Army" صفحہ 26
[12] شریف الدین پیرزادہ "Last Days of The Quaid" صفحہ 6

مسلم لیگ کے اخبار ڈان نے اداریے لکھے اور روٹی کے بجائے بندوق پر زور دیا۔ ایک بڑی اور مسلح فوج کا مطالبہ کیا تاکہ ارض مقدس کا دفاع کیا جاسکے۔ [13] قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل خارجہ پالیسی کے بارے میں امریکی سفارت کار سے کہا: ''مسلمان ملک، روس کی ممکنہ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہوں گے اور امداد کے لیے امریکہ کی جانب دیکھیں گے۔'' قائداعظم نے لائف میگزین کے رپورٹر کو بتایا کہ پاکستان کو امریکہ کی اتنی ضرورت نہیں جتنی امریکہ کو پاکستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اس قدر اہم ہے کہ پاکستان دنیا کی توجہ کا مرکز ہوگا۔ [14]

شدید بیماری کے باوجود قائداعظم آئین کی تیاری میں مصروف رہے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ قوم کو ایک قابل عمل آئین دے دیں اور نئی ریاست آئین کے مطابق چلتی رہے۔ 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کو شدید بیماری کی بناء پر کراچی منتقل کیا گیا۔ وہ آرمی کی ایک ایمبولینس پر ایئرپورٹ سے گورنر ہاؤس جارہے تھے کہ راستے میں ایمبولینس خراب ہوگئی اور کوئی متبادل انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ قائداعظم 4:15 سہ پہر سڑک پر ہی رحلت فرماگئے۔ افسوس کہ پاکستان کے بانی اور گورنر جنرل کے لیے ٹرانسپورٹ کا مناسب انتظام نہ کیا گیا۔ اس المناک واقعہ سے قائداعظم کے قریبی رفقاء اور سول و ملٹری ملازمین کی بے حسی اور مجرمانہ غفلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قائداعظم کے بعض رفقاء ان کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے تھے اور ان کی موجودگی میں وہ آزادی کے ساتھ اقتدار کے مزے نہیں لوٹ سکتے تھے۔ قائداعظم کی بے وقت وفات سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا جس کا خمیازہ آج تک پاکستان کے عوام بھگت رہے ہیں۔ قائداعظم کو اگر موقع ملتا تو وہ قوم کو ایک پائیدار آئین دیتے اور پاکستان کے قبلہ کی سمت درست کردیتے۔ پاکستان سیاسی اور آئینی بحران کا شکار نہ ہوتا۔ قائداعظم مسلم لیگ کے واحد کرشماتی لیڈر تھے۔ ان کی وفات کے بعد ملک کے اندر قیادت کا خلاء پیدا ہوگیا جس کا فائدہ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے اٹھایا۔ بنگالیوں کا خیال تھا کہ ان کی آبادی زیادہ ہے لہٰذا انہیں پاکستان میں مساوی حقوق دیئے جائیں گے مگر پاکستان کی حکومت پر مغربی پاکستان کے ملٹری اور سول بیوروکریٹس اور سیاست دان قابض ہوگئے۔ خواجہ ناظم الدین پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل نامزد ہوئے وہ شریف النفس انسان تھے اور اقتدار کے مکر وفن میں ملوث نہ ہوئے۔ ان کے اختیارات لیاقت علی خان استعمال کرنے لگے۔ ان کی خواہش تھی کہ ریاست کا سربراہ کمزور ہو اور طاقت کا مرکز وہ خود بن جائیں۔ آئین سے انحراف کی یہ افسوسناک روایت تھی۔ بعد میں آنے والے سول اور ملٹری حکمرانوں کو اس روایت سے تقویت ملی۔ بنگال کے مولوی تمیز الدین دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہوگئے۔ بھارت نے اپنا آئین 1949ء میں تیار کرلیا جبکہ پاکستان 1956ء تک اپنا آئین بنا سکا۔ آئین نہ ہونے کی بناء پر جمہوری ادارے پنپ نہ سکے۔

[13] Bourke White "Halfway to Freedom" صفحہ 103
[14] Kux "United States and Pakistan" صفحہ 13.93

میاں افتخار الدین نے 1949ء میں زرعی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی جس میں زرعی اصلاحات کی سفارش کی گئی۔ اس رپورٹ میں قائداعظم کی تقریر 1944ء کو بنیاد بنایا گیا جو انہوں نے آل انڈیا پلاننگ کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی اور دولت کو اسلام کے نظام عدل کے مطابق دوبارہ تقسیم کرنے پر زور دیا تھا۔ پاکستان کی حکومت نے میاں افتخار الدین کی رپورٹ پر عمل نہ کیا [15] اور جاگیرداری نظام مضبوط اور مستحکم ہوگیا۔ جاگیردار سول اور ملٹری بیوروکریٹس کے اتحادی بن گئے اور جمہوریت پروان نہ چڑھ سکی۔ بھارت نے بروقت زرعی اصلاحات کر کے جاگیرداری کو ختم کر دیا اور وہاں پر جمہوریت اور جمہوری اداروں کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں۔

قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان نظریات کے دیوالیہ پن کا شکار ہوگیا۔ قائداعظم کے تصورات سے انحراف ہونے لگا۔ بھارت کو پاکستان کا دشمن نمبر ون ڈیکلیئر کیا گیا جس کا مقصد عوام کو غیر معمولی ہیجان میں مبتلا رکھنا تھا۔ توازن کے ساتھ ریاست کو چلانے کی بجائے روٹی کی نسبت بندوق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ امریکی اسلحہ پر انحصار کر کے پاکستان کے مستقبل کو امریکہ سے وابستہ کر دیا گیا۔

چوہدری محمد علی جو پاکستان کے وزیراعظم رہے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"In order to sefeguard the independence and territorial
integrity of Pakistan, it was essential to build up and equip
the armed forces. Resources that were urgently needed for
economic reconstruction and development were diverted to
defence, which used up half and, at times, even more of the
central budget. The people bore these sacrifices willingly.
Liaquat Ali Khan's remarks, "We can afford to be hungry for
a day but we cannot afford to be slaves even for a minute,"
reflected the will of the whole nation. The original plan for an
army of 125,000 men was revised upward under the constant
threat of aggression by India. Since India had withheld
Pakistan's share of military stores, large runs had to be spent
on defence equipnent. In a broadcast to the nation on October
8, 1948, the Prime Minister said: "The defence of the State is
our foremost consideration and has dominated all other
governmental activities. We will not grudge any amount on
the defence of our country." [16]

ترجمہ: ''پاکستان کی آزادی اور علاقائی سلامتی کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ افواج پاکستان کو منظم کیا جائے اور اسے اسلحہ سے لیس کیا جائے۔ قومی وسائل جن کی معاشی تعمیر نو اور ترقی کے

[15] آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 123

لیے فوری ضرورت تھی دفاع کی جانب منتقل کیے گئے۔ جس پر نصف اور بعض اوقات قومی بجٹ سے بھی زیادہ صرف کرنا پڑا۔ عوام نے بڑی خوشی کے ساتھ ان اخراجات کو برداشت کیا۔ لیاقت علی خان نے کہا ''ہم ایک دن بھوکے رہ سکتے ہیں مگر ہم ایک منٹ کے لیے بھی غلام بننے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔'' اس رائے سے پوری قوم کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ بھارت کی جارحیت کے مستقل خطرے کی بناء پر فوج کی تعداد 1,25,000 کے ابتدائی منصوبے میں مزید اضافہ کیا گیا۔ چونکہ بھارت نے پاکستان کے فوجی اثاثے روک لیے تھے لہٰذا دفاعی ساز و سامان پر کافی سرمایہ خرچ کرنا پڑا۔ 8 اکتوبر 1948 کو لیاقت علی خان نے اپنے قوم سے خطاب میں کہا۔ ''پاکستان کا دفاع ہماری پہلی ترجیح ہے۔ جس نے حکومت کے تمام دوسرے امور پر برتری حاصل کر لی ہے۔ ہم ملک کے دفاع پر کسی قسم کے اخراجات سے دریغ نہیں کریں گے۔'' [16]

پاکستان کے عوام نے ابتداء ہی سے افواج پاکستان پر خوشدلی کے ساتھ اخراجات کیے۔ کیا فوج نے بھی عوام کے استحقاق کا خیال رکھا؟

پاکستان میں صوبائی خودمختاری اور ریاست سے مذہب کے تعلق کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ مذہبی رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست ڈیکلیئر کیا جائے۔ اس تنازعہ کو حل کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد 7 مارچ 1949ء کو منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں تسلیم کیا گیا کہ ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق گزاریں گے۔ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔ اقلیتوں کو اپنے عقیدے پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ لیاقت علی خان نے قرارداد پیش کرتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ اس قرارداد میں عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دے کر پاکستان کو ایک تھیوکریٹک (ملائیت) ریاست بنانے کے خطرے کو ختم کر دیا گیا ہے۔ [17]

لیاقت علی خان کی کابینہ میں ایک بنگالی گروپ تھا اور دوسرا پنجابی گروپ تھا۔ بنگالی گروپ کی قیادت خواجہ ناظم الدین اور خواجہ شہاب الدین کرتے تھے۔ بنگالی مذہبی طور پر قدامت پسند تھے اور سیاسی طور پر بڑے پرجوش تھے۔ وہ امریکہ کی حمایتی خارجہ پالیسی کے خلاف تھے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان، غلام محمد اور پنجابی گروپ کے دوسرے افراد امریکہ کے حامی تھے۔ مغربی پاکستان میں موقع پرست جاگیردار تھے اور مشرقی پاکستان کے سیاست دان نظریاتی تھے۔ لیاقت علی خان کا اپنا کوئی انتخابی حلقہ نہ تھا وہ مہاجر تھے لہٰذا انہوں نے صوبوں کو کنٹرول کرنے کے لیے مرکزی انتظامیہ کو مضبوط بنایا اور 1935ء کے ایکٹ میں دیے

[16] چوہدری محمد علی: "The Emergence of Pakistan" صفحہ 376

[17] حامد خان "Constitution and Political History of Pakistan" صفحہ 92

گئے مرکزی اختیارات کو استعمال کیا۔ چنانچہ صوبے کمزور ہوئے۔ ان کے دور میں مہاجر پنجابی تضاد بھی زور شور سے ابھرا۔ ابتدائی سالوں میں میاں ممتاز دولتانہ، نواب افتخار حسین ممدوٹ اور وزیراعظم لیاقت علی خان کے اختلافات کی وجہ سے جمہوریت کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیاقت علی خان نے حسین شہید سہروردی اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے۔

"Dogs let loose by the enemies of Pakistan"[18]

ترجمہ: ''کتے جن کو پاکستان کے دشمنوں نے کھلا چھوڑ دیا ہے۔''[18]

سیاست دانوں کے اس حد تک شدید اختلافات کی بناء پر ابتدائی سالوں میں جمہوری کلچر پروان نہ چڑھ سکا اس ضمن میں ایوب کھوڑو کی مثال کلاسیک ہے۔ 1948ء میں کھوڑو کی وزارت (سندھ) کرپشن اور بے ضابطگیوں کے الزام میں برطرف کی گئی۔ تین سال بعد کھوڑو کو دوسری بار سندھ کا وزیراعلیٰ بنایا گیا۔ چند ماہ بعد وفاقی حکومت نے انہیں پروڈا قوانین کے تحت برطرف کر دیا اور ان کے خلاف مقدمہ چلایا۔ 1954 میں کھوڑو تیسری بار وزیراعلیٰ بننے میں کامیاب ہوگئے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ نئی ریاست کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ایسی ریاستی مشینری اور نظام وضع کیا جائے جس سے پاکستان کے عوام کو کنٹرول کیا جاسکے۔ گویا عوام کو اقتدار میں شریک کرنے کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ زیر غور نہ تھا۔ نئی ریاست کو مختلف نوعیت کے چھ بحرانوں کا سامنا تھا: شناخت کا بحران، اخلاقی اور سیاسی جواز کا بحران، عوام تک پہنچنے کا بحران، عوام کی شرکت کا بحران، استحکام اور اتحاد کا بحران اور وسائل کی تقسیم کا بحران۔ گویا پاکستان ابتداء ہی میں گوناگوں بحرانوں کا شکار تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کو منظم کرنے کی ضرورت تھی۔ قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت چھوڑ دی اور سرکاری وسیاسی عہدے الگ الگ کر دیئے۔ مسلم لیگ کو پاپولر قیادت کی ضرورت تھی۔ قائداعظم کے بعد مسلم لیگ کمزور ہوتی چلی گئی۔ مسلم لیگ کے لیڈر اقتدار کی سیاست میں مشغول ہوگئے۔

جون 1951ء میں امریکہ اور کوریا کی جنگ ہوئی۔ جس میں پاکستان نے امریکہ سے تعاون کیا اور کوریا میں اقوام متحدہ کے ملٹری ایکشن کو سپورٹ کیا اور کوریا میں پاک فوج کا ایک بریگیڈ بھیجنے پر رضامندی ظاہر کی جبکہ بھارت نے انکار کر دیا۔ امریکہ نے پاک فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کرنے کا وعدہ کیا۔ پاکستان نے واشنگٹن سے مطالبہ کیا کہ وہ بھارت کے خطرے کے پیش نظر پاکستان کو دفاع اور سلامتی کی گارنٹی دے۔ امریکہ کے انکار پر پاکستان نے کوریا میں فوج بھیجنے کا فیصلہ تبدیل کر دیا البتہ اقوام متحدہ کی کارروائیوں کی سیاسی حمایت کی۔ کوریا کی جنگ کے دوران بھارت نے پنجاب (پاکستان) سرحد پر اپنی فوجیں تعینات کر دیں۔ پاکستان کے پاس دفاع کی فوجی صلاحیت نہیں تھی لہٰذا حکمران خوف زدہ ہو کر امریکہ کی جانب دیکھنے لگے۔ امریکہ نے پاکستان سے تعاون کیا اور امریکہ کا پاکستان میں اثر ورسوخ بڑھا۔

---

[18] آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 136

پاکستان کی برآمدات میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔[19] امریکہ کو مشرق وسطیٰ کی سکیورٹی اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے پاکستان کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے پاکستان سے روابط بڑھائے۔

مئی 1950 میں لیاقت علی خان نے روس کی دعوت مسترد کر کے امریکہ کا دورہ کیا اور امریکہ کو پاکستان کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ اگر امریکہ پاکستان کی سرحدوں کے دفاع کی ضمانت دے تو پاکستان کے لیے بڑی فوج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔[20]

لیاقت علی خان ایک دیانت دار سیاست دان تھے۔ انہوں نے کرپشن اور اقربا پروری پر قابو پانے کے لیے 1949ء کے آغاز میں پروڈا (Proda) کا قانون منظور کرایا جس کے مطابق وزیروں اور اراکین اسمبلی کو کرپشن کے الزام میں دس سال کے لیے نااہل قرار دیا جاسکتا تھا۔ گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کے علاوہ ایک عام شہری بھی پانچ ہزار روپے سکیورٹی جمع کر کے وزیر اور رکن اسمبلی کے خلاف مقدمہ درج کرا سکتا تھا۔ پروڈا کا اطلاق سول سرونٹس پر نہیں ہوتا تھا۔ سول سرونٹس ابتدائی سالوں میں ہی سیاست دانوں پر بالادستی حاصل کر چکے تھے۔ ممتاز دولتانہ نے لیاقت علی خان کے خلاف ایک گروپ بنایا جسے فوج کی حمایت حاصل تھی۔[21]

جنوری 1951 میں پاک فوج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی مدت ملازمت ختم ہوگئی۔ انہوں نے کشمیر میں فوج بھیجنے کے سلسلے میں قائداعظم کے احکامات پر عمل نہیں کیا تھا اس لیے جنرل گریسی کو ملازمت میں توسیع نہ دی گئی۔ مسلم لیگ کے رہنما چاہتے تھے کہ کسی پاکستانی فوجی افسر کو کمانڈر انچیف ہونا چاہیے۔ جنرل ایوب کا سروس ریکارڈ مجموعی طور پر اچھا تھا۔ وہ ایک پروفیشنل سولجر تھے اور ان سے یہی توقع تھی کہ وہ سیاست میں مداخلت نہیں کریں گے۔ انہیں 1951 میں پاکستانی فوج کا پہلا پاکستانی کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ جنرل ایوب کی بطور کمانڈر انچیف نامزدگی کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ ان سے دو سینئر جرنیل ایک فضائی حادثہ کا شکار ہوگئے تھے۔ جنرل ایوب خان کو کمانڈر انچیف کا منصب سنبھالتے ہی فوج کے اندر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ 1951ء کے وسط میں میجر جنرل اکبر خان چیف آف جنرل سٹاف، بریگیڈیئر ایم اے لطیف کمانڈر (کوئٹہ)، فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز اور بیگم اکبر خان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ ان پر حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگایا گیا۔ اس واقعہ کو راولپنڈی سازش کیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض مورخین کے مطابق جنرل اکبر اور ان کے رفقاء سوشلسٹ انقلاب کے حامی تھے۔ اگر یہ انقلاب کامیاب ہوجاتا تو پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ جاگیرداری نظام، ملا ازم اور فوجی آمریت کے امکانات ختم ہوجاتے۔ جنرل اکبر خان کو کشمیر پالیسی پر بھی حکومت سے شدید اختلاف تھا۔ اس سازش کو بے نقاب

---

[19] Brian Clougley "A History of the Pakistan Army" صفحہ 30

[20] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 111

[21] منیر احمد ''جنرل پرویز مشرف جی ایچ کیو سے ایوان صدر تک''

کرنے کے بعد ایوب خان نے اپنے آپ کو حکومت کا محافظ سمجھنا شروع کر دیا اور حکومتی امور میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کرنے لگے۔

لیاقت علی خان کو 16 اکتوبر 1951 کو اس وقت شہید کر دیا گیا جب وہ لیاقت پارک راولپنڈی میں جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ ان کا قتل پراسرار تھا۔ جس شخص (سید اکبر) نے ان کو گولی ماری اسے بھی موقع پر ہی ہلاک کر دیا گیا۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کا پہلا وزیراعظم دن دیہاڑے قتل ہو گیا اور اس کے قاتل بے نقاب نہ ہوئے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سیاسی قتل ہماری تاریخ کی روایت بن گئے۔ اگر پہلے سیاسی قتل کے مجرموں کو سزا مل جاتی تو آئندہ کسی کو قتل کرانے کی جرأت نہ ہوتی۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ جس سیاسی قتل کا سراغ نہ مل سکے اس کے پیچھے خفیہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ بیگم رعنا لیاقت نے بتایا کہ لیاقت علی خان راولپنڈی میں اپنی زندگی کی تاریخی تقریر کرنے والے تھے۔ [42] قائداعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی خان کا قتل پاکستان کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد سیاست میں جو خلاء پیدا ہوا اسے سول اور ملٹری بیوروکریسی نے پُر کیا۔ مؤرخ وزیراعظم لیاقت علی کے قتل کی ذمہ داری ان افراد پر ڈالتے ہیں جنہیں اس قتل کے بعد سب سے زیادہ سیاسی فائدہ ہوا۔ شیرباز مزاری کے مطابق لیاقت علی خان کے قتل کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ ان کے قتل کی سازش پنجاب کے سینئر بیوروکریٹس نے غلام محمد کی آشیرباد سے تیار کی تھی جو لیاقت کابینہ میں وزیرخزانہ تھے۔ [43]

جنرل ایوب نے لیاقت علی خان کے قتل کے بعد کابینہ کے وزیروں کی سردمہری اور سنگدلی کے بارے میں تحریر کیا:۔

> "... I met several members of the new Cabinet in Karachi – Prime Minister Khawaja Nazimuddin...and others. Not one of them mentioned Liaquat Ali's name, nor did I hear a word of sympathy or regret from any one of them. Governor-General Ghulam Mohammad seemed equally unaware of the fact that the country had lost an eminent and capable Prime Minister...I wondered at how callous, cold-blooded, and selfish people could be ... It seemed that every one of them had got himself promoted ... It was disgusting and revolting ... I got the distinct impression that they were all feeling relieved that the only person who might have kept them under control had disappeared from the scene..." [44]

ترجمہ: ''میں نے کراچی میں کابینہ کے کئی ارکان سے ملاقات کی۔ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اور

---

[42] ڈان 20 اکتوبر 1951

[43] شیرباز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 55

دوسرے افراد سے ملا۔ ان میں سے کسی نے لیاقت علی خان کا ذکر تک نہ کیا اور نہ ہی میں نے ان سے ہمدردی اور افسوس کا کوئی لفظ سنا۔ گورنر جنرل غلام محمد کو بھی احساس نہیں تھا کہ ملک ایک ممتاز اور اہل وزیراعظم سے محروم ہو گیا ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ لوگ اس قدر سنگدل، بے حس اور خودغرض بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کو ترقی مل گئی ہے۔ یہ میرے لیے نفرت انگیز اور بغاوت پر آمادہ کرنے والا رویہ تھا۔ مجھے واضح طور پر یہ تاثر ملا کہ وہ سب سکون محسوس کر رہے تھے کہ واحد شخصیت جو ان کو کنٹرول کر سکتی تھی منظر سے ہٹ گئی ہے۔'' [44]

جنرل ایوب خان کی اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ 1951ء میں ہی سیاست دانوں سے بڑے برگشتہ ہو چکے تھے۔ لیاقت علی خان کی شہادت پاکستان کو بڑی مہنگی پڑی۔ مسلم لیگ میں اور کوئی لیڈر نہ تھا جو اس خلاء کو پورا کرتا۔ خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا منصب چھوڑ کر وزیراعظم کا منصب سنبھال لیا۔ بیوروکریٹ وزیرخزانہ غلام محمد جو مسلم لیگ کے رکن بھی نہ تھے گورنر جنرل بن گئے۔ غلام محمد نے مارشل لاء کے لیے راستہ ہموار کیا۔ عائشہ جلال لکھتی ہیں:۔

> "Some seven years before the first military takeover, the political power had slipped off the rails. After the assassination of Liaquat Ali Khan in October 1951 a succession of unelected bureaucrats assumed elective office. Pakistan's third Governor-General, Ghulam Muhammad was a hardened bureaucrat who had no appetite for democratic practices." [45]

ترجمہ: ''پہلے فوجی اقتدار سے سات سال قبل سیاسی طاقت پٹڑی سے اتر گئی۔ اکتوبر 1951ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد غیر منتخب بیوروکریٹ جانشینوں نے سیاسی منصب سنبھال لیے۔ پاکستان کا تیسرا گورنر جنرل غلام محمد سخت گیر بیوروکریٹ تھا جسے جمہوری روایات کا کوئی احساس نہیں تھا۔'' [45]

مسلم لیگ کا ملکی اُمور پر کنٹرول کمزور پڑ گیا۔ فوج اور بیوروکریسی منظم ادارے تھے۔ لہٰذا ان کا اثر و رسوخ بڑھا۔ فوج کا ادارہ کسی کو جواب دہ نہ تھا۔ غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان ریاستی طاقت کے مالک بن گئے۔ لیاقت علی خان کے دور میں ہی جمہوریت تباہ ہو گئی۔ پنجاب پر 27 ماہ تک گورنر راج نافذ رہا۔ [46]

---

[44] جنرل ایوب خان "Friends not Masters" صفحہ 41

[45] عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 52

[46] شیرباز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 54

غلام محمد بیمار تھا وہ ذہین تھا مگر آمرانہ مزاج رکھتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کا تعلق بنگال سے تھا اور غلام محمد پنجابی تھا۔ سیاست کی ستم ظریفی ہے کہ جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے ان کے اختیارات وزیراعظم لیاقت علی خان استعمال کرتے رہے اور جب خواجہ ناظم الدین وزیراعظم بن گئے تو ان کے اختیارات گورنر جنرل غلام محمد استعمال کرتے رہے۔ اس غیر آئینی رویے سے بنگالیوں کے دلوں میں مایوسی، نفرت اور محرومی کے جذبات پیدا ہوئے۔ غلام محمد کی بطور گورنر جنرل نامزدگی قائداعظم کی پالیسی سے انحراف تھا۔ انہوں نے سول اور ملٹری بیوروکریسی کو سیاست سے الگ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ غلام محمد نے جنرل ایوب کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کی مدت ملازمت میں چار سال کی توسیع کر دی ایوب خان جنوری 1955 میں ریٹائر ہونے والے تھے۔

مؤرخین حیران ہیں کہ قیام پاکستان کے صرف چار سال بعد ہی مسلم لیگ نے بیوروکریسی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور ایک بیوروکریٹ وزیر خزانہ کو پاکستان کا گورنر جنرل تسلیم کر لیا۔ پاکستان میں رفتہ رفتہ امریکہ کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ امریکن کنکشن کی وجہ سے سول اور ملٹری اسٹیبلشمینٹ بھی مضبوط ہوتی گئی۔ بریگیڈیئر میاں غلام جیلانی جب ملٹری اتاشی نامزد ہو کر امریکہ رخصت ہونے لگے تو کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے انہیں بلایا اور ہدایت کی۔

"Your basic task is to establish a military aid relationship with the Pentagon. You must deal directly with them and do not take the ambassador into confidence. After all we can not trust these civilians with such sensitive matters." [27]

ترجمہ: ''تمہاری بنیادی ذمہ داری پینٹا گان کے ساتھ ملٹری ایڈ کے تعلقات استوار کرنا ہے۔ تم ان (امریکنوں) سے براہ راست ڈیل کرنا اور پاکستانی سفیر کو اعتماد میں نہ لینا۔ ہم اس قسم کے حساس معاملات میں سویلین پر اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔'' [27]

پاکستان کے سویلین سیاست دانوں کے بارے میں جنرل ایوب خان کے خیالات ابتداء ہی سے اچھے نہ تھے اور وہ عسکری و دفاعی امور کے بارے میں انہیں ہرگز اعتماد میں لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اپریل 1953ء کے آخر میں احمدیوں کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو وزارت سے نکالنے کا مطالبہ کیا جانے لگا وہ احمدی تھے۔ دولتانہ نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔ لاہور میں حالات بڑے کشیدہ ہوگئے۔ سینکڑوں احمدی قتل ہوگئے۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق احمدیوں کے خلاف تحریک خواجہ ناظم الدین کو ہٹانے کے لیے چلائی گئی۔ 6 مارچ 1953ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ جنرل اعظم خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے حالات کو کنٹرول کیا۔ لاہور دو ماہ تک مارشل لاء کے تحت رہا۔ لاہور میں صفائی کا انتظام کیا گیا، اہم عمارتوں کو پینٹ کر کے خوبصورت بنایا

[27] مشاہد حسین، اکمل حسین "Pakistan Problems of Governance" صفحہ 90

گیا۔ ذخیرہ اندوزوں کو گرفتار کیا گیا۔ فوج کا کام امن و امان بحال کرنا تھا مگر اس نے حدود سے تجاوز کیا۔ مثالی نظم و نسق سے عوام میں یہ تاثر پھیلا کہ فوج امن و امان قائم کر سکتی ہے اور بہترین ایڈمنسٹریشن دے سکتی ہے۔ فوج کے اندر برتری اور مقبولیت کا احساس پیدا ہوا۔ چیف جسٹس منیر کی رپورٹ کے مطابق ریاستی ایجنسیوں نے مذہب اور مذہبی گروپوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جس سے مذہبی وابستگی کا ایسا جذباتی ماحول پیدا ہوا جسے بعد میں کنٹرول نہ کیا جا سکا اور فوج کو ریاستی امور میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ دریں اثناء ملک میں گندم کا قحط پیدا ہوگیا۔ مسلم لیگ محلاتی سازشوں کا پہلے ہی شکار تھی۔ لہٰذا خواجہ ناظم الدین گردش حالات کا شکار ہوگئے۔ سیاست دان ہی ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ خوراک کی قلت پر غور کرنے کے لیے گورنر جنرل غلام محمد کی صدارت میں ایک ہنگامی اجلاس ہوا۔ جس میں فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان نے خواجہ ناظم الدین پر الزامات لگائے اور ان کی توہین کی۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق احمدیوں کے خلاف تحریک انجینئرڈ تھی۔ امریکی آشیر باد سے گندم کا قحط سازش کے تحت پیدا کیا گیا جس کا مقصد خواجہ ناظم الدین کو ہٹانا تھا۔ مسلم لیگ اقتدار کی مصلحتوں کا شکار رہی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے کارکن ''خضر وزارت توڑ دو'' کے نعرے لگاتے رہے۔ جب خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ کی مشروط اطاعت کر لی تو پنجاب میں ''تازہ خبر آئی اے، خضر ساڈا بھائی اے'' کے نعرے لگنے لگے۔

1953 میں خواجہ ناظم الدین وزیراعظم تھے۔ اس وقت تک سول سرونٹس سیاست دانوں پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ سکندر مرزا کیبنٹ سیکریٹری تھے، انہوں نے کابینہ اور وزیراعظم کو بائی پاس کیا جس کی شہادت کرامت اللہ غوری نے پیش کی ہے:۔

"How ruthlessly this unholy alignment of power worked was narrated to me by my ambassador in Tokyo, Mr Qamarul Islam, an old ICS himself with encyclopaedic knowledge of the Pakistani bureaucracy. His was an eyewitness account. The time was 1953 and the cabinet of Khawaja Nazimuddin was convened to decide the line of action in regard to the sectarian violence then consuming Lahore. In the middle of a heated debate, Iskander Mirza, then cabinet secretary, rose and left the room without seeking the PM's permission. He returned to the cabinet session ten minutes later and calmly announced to its participants not to bother themselves any more as he had spoken to Lt-Gen Azam Khan, Lahore's corps commander who was all primed to declare martial law in the city next morning That ended the discussion Neither the PM nor anybody else dared challenge Mirza over his arbitrary decision or insolent behaviour." [28]

ترجمہ: ’’طاقت کی یہ ناپاک صف بندی کس طرح ظالمانہ طور پر کام کررہی تھی اس کا حال مجھے ٹوکیو میں ہمارے سفیر قمر الاسلام نے بتایا جو خود پرانے آئی سی ایس ہیں اور پاکستانی بیوروکریسی کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا جیسا علم رکھتے ہیں۔ اس واقعہ کے وہ چشم دید گواہ ہیں۔

1953ء میں خواجہ ناظم الدین نے لاہور کو تباہ کرنے والے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں لائحہ عمل طے کرنے کے لیے کابینہ کا اجلاس طلب کیا۔ اجلاس کے درمیان میں جب گرم بحث جاری تھی سکندر مرزا (کیبنٹ سیکریٹری) وزیراعظم کی اجازت کے بغیر اُٹھ کر چلے گئے۔ دس منٹ کے بعد وہ اجلاس میں واپس آئے اور بڑے سکون سے میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ وہ اس موضوع پر پریشان نہ ہوں کیونکہ انہوں نے کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل اعظم خاں سے بات کی ہے جو اگلی صبح شہر میں مارشل لا لگانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اس کے بعد بحث ختم ہوگئی۔ نہ ہی وزیراعظم اور نہ ہی کسی دوسرے شخص نے سکندر مرزا کے من مانے فیصلے اور گستاخانہ رویے کو چیلنج کیا۔‘‘ [28]

16 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے ایوب خان کی آشیرباد سے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کردیا حالانکہ انہیں اسمبلی کا اعتماد حاصل تھا اور چند روز پہلے انہوں نے اسمبلی سے بجٹ پاس کرایا تھا۔ وفاقی وزیر خزانہ چوہدری محمد علی اور مشتاق احمد گورمانی نے غلام محمد کا ساتھ دیا۔ ناظم الدین کابینہ کے نو وزراء میں سے چھ بوگرہ کی کابینہ میں شامل ہوگئے۔ سردار عبدالرب نشتر نے اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کردیا اور سیاسی عتاب کا نشانہ بنے۔ خواجہ ناظم الدین نے ملکہ برطانیہ سے اپیل کی کہ غلام محمد نے اپنے آئینی اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ مگر برطانوی سفارت خانہ نے ان کا پیغام ملکہ کو ارسال نہ کیا، ان کے گھر کے فون منقطع کردیئے گئے۔

محمد علی بوگرہ جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے خواجہ ناظم الدین کی جگہ پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے بہ رضا و رغبت انہیں قبول کرلیا اور مسلم لیگ کی صدارت کا تاج بھی ان کے سر پر رکھ دیا۔ امریکہ اور پاکستانی اسٹیبلشمینٹ کے اشتراک کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔

بعض مؤرخین کے مطابق خواجہ ناظم الدین جو دستور تیار کرا رہے تھے اس میں گورنر جنرل کے اختیارات کم کردیئے گئے تھے۔ خواجہ صاحب دولت مشترکہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو انہوں نے ملکہ برطانیہ سے غلام محمد کو عہدے سے ہٹانے کی سفارش کی مگر ملکہ نے انکار کردیا۔ غلام محمد کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کا فیصلہ ذاتی اور انتقامی وجوہات کی بناء پر کیا۔ [29]

ناظم الدین جنرل ایوب کو توسیع دینے اور فوج کے سائز کو قومی وسائل سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔

---

[28] کرامت اللہ غوری — ڈان 11 فروری 2006

[29] عائشہ جلال — "The State of Martial Rule" — صفحہ 178

غلام محمد اقتدار کی ہوس میں اس قدر مبتلا تھے کہ معذوری کے باوجود مستعفی ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ فالج اور بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بولنے سے بھی معذور تھے۔ [30] ہماری سیاسی تاریخ کی بدقسمتی ہے کہ ایک معذور بیوروکریٹ پاکستان پر حکومت کرتا رہا اور اس نے اپنے دور میں ایسے غیر جمہوری فیصلے کیے جن کی وجہ سے ابتداء ہی میں جمہوری اداروں کو کاری ضربیں لگیں۔ مغربی پاکستان کو ون یونٹ قرار دینا اور مشرقی پاکستان کی آبادی کی اکثریت کو تسلیم نہ کرنا افسوسناک فیصلے تھے۔

بوگرہ کے دور میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات مستحکم ہوئے۔ بھارت چونکہ روس کے قریب تھا اور امریکہ کو جنوبی ایشیا میں ایسے ملک کی تلاش تھی جو وقت آنے پر روس کا مقابلہ کرسکے اور اس کے گرم پانیوں تک پہنچنے کے خواب کو پورا نہ ہونے دے۔ پاکستان بھارت کی جانب سے خوف میں مبتلا تھا۔ اسے اپنا دفاع مضبوط بنانے کے لیے فوجی تعاون کی ضرورت تھی۔ امریکہ اور پاکستان نے سیٹو (SEATO) اور سینٹو (CENTO) کے معاہدے کرلیے۔ ان معاہدوں کے بعد پاکستان امریکہ کے اثر و رسوخ میں چلا گیا۔

آرمی چیف ایوب خان نے ستمبر اکتوبر 1953ء میں سول حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر اپنی منشا کے مطابق امریکہ کا دورہ کیا۔ حالانکہ پاکستان کے سویلین سربراہ اور وزیر خارجہ امریکہ کا دورہ کرنے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ ایوب خان نے ’’مناسب قیمت‘‘ پر ایک ایسی ڈیل کی کوشش کی جس کے مطابق پاکستان مغرب کے اتحادی کا کردار ادا کرسکے۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور (Eisenhower) نے کوریا سے توجہ ہٹا کر پاکستان، ایران، ترکی اور عراق جیسی فرنٹ لائن ممالک کی عسکری صلاحیت بڑھانے پر توجہ دی جس کا مقصد روس کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کرنا تھا۔

امریکی تعاون حاصل کرنے کے لیے ایوب خان اس حد تک آگے چلے گئے کہ انہوں نے ایک امریکی اہلکار کو کہا کہ..........:

"Our army can be your army if you want." [31]

ترجمہ: ’’اگر آپ چاہیں تو ہماری آرمی آپ کی آرمی بن سکتی ہے‘‘ [31]

شرط یہ ہے کہ قیمت مناسب دی جائے۔

بوگرہ نے خواجہ ناظم الدین، فضل الرحمٰن اور مشرقی پاکستان کے دوسرے لیڈروں کی جانب سے پیش کی گئی آئینی ترمیم سے اتفاق کیا اور آئین ساز اسمبلی نے 20 ستمبر 1954ء کو پروڈا کا قانون منسوخ کردیا جس کے تحت گورنر جنرل کو بدعنوان وزراء اور سیاست دانوں کے خلاف کارروائی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ آئین ساز اسمبلی نے 1935ء کے ایکٹ میں ترمیم کرکے گورنر جنرل کے کابینہ توڑنے کے اختیارات بھی ختم کردیئے۔ یہ کارروائی اس وقت کی گئی جب گورنر جنرل دارالحکومت سے باہر تھے۔ اسمبلی نے غیر معمولی

---

[30] قدرت اللہ شہاب — ’’شہاب نامہ‘‘ — صفحہ 641-642

[31] شیریں طاہر خیلی — "The United States and Pakistan" — صفحہ 3

Dennis Kux — United States and Pakistan (1947-2000)

عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے منظور ہونے والی ترامیم اسی روز گزٹ میں شائع کر دیں۔ محمد علی بوگرہ نے نئے آئین کا مسودہ کافی حد تک تیار کرالیا تھا اور یہ اعلان کر رکھا تھا کہ بابائے قوم کے یوم ولادت 25 دسمبر 1954ء کو نیا آئین نافذ کر دیا جائے گا۔ سٹیفن کوہن نے اپنی کتاب ''پاکستان آرمی'' میں اس ضمن میں بوگرہ کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے۔

ایک انتہائی سینئر سابق جنرل نے جو ان واقعات میں کلیدی کردار ادا کر چکے تھے۔ سیاست دانوں کے ساتھ اپنے ٹکراؤ کا قصہ سنایا جس کی بناء پر فوج براہ راست مداخلت کی طرف راغب ہوئی۔

''میں ان کے (وزیراعظم محمد علی بوگرہ) کے دفتر گیا۔ اس زمانے میں (1953)ء میں صرف میجر جنرل تھا۔ میں بیٹھ گیا، میں انہیں جانتا تھا۔ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے مگر بنگالی ہونے کی وجہ سے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ میری طرف مڑ کر بولے 'جنرل سر، جنرل سر، آپ کو پتا ہے کیا ہوا؟ نہیں پتا کیا ہوا؟' میں نے کہا 'نہیں' میں بتاتا ہوں کیا ہوا۔ 'دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کو بیشتر اختیارات سے محروم کرنے کی قرار داد منظور کی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب وہ ایبٹ آباد سے آئیں گے تو ہنگامی حالت نافذ کر دیں گے اور مداخلت کے لیے فوج کو استعمال کریں گے۔ کیا آپ ان کی بات مانیں گے!'

ذرا سوچیے ملک کا وزیراعظم اور وزیر دفاع ایک معمولی آدمی، آرمی کے ایک میجر جنرل سے اتنے حساس سیاسی معاملات پر مشورہ کر رہا ہے۔ مجھے چیف (ایوب خان) کی طرف سے کوئی بریفنگ نہیں ملی تھی۔ میں نے کہا ''جناب، اگر یہ حکم محکمانہ توسط سے کمانڈر انچیف کو پہنچے گا تو وہ تعمیل کریں گے۔ اس صورت میں یہ قانونی حکم ہوگا۔ اگر حکم آپ سے پوچھے بغیر آیا تو غیر قانونی ہوگا اور وہ عمل نہ کر سکیں گے۔ اگر آپ ہم سے کہیں 'آجاؤ' تو ہم تعمیل کریں گے''۔ اس پر انہوں نے فون اٹھایا اور میری موجودگی میں وزیر قانون سے بات کی۔ کہنے لگے نہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتے، جنرل.......... کہہ رہے ہیں۔'' انہوں نے انٹیلی جنس والوں سے بھی بات کی۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ بچوں کی طرح ہے اور ہمارے ملک کا وزیراعظم ہے۔ مجھے اتنی ٹھیس لگی کہ میں باہر نکل آیا، اپنے دفتر گیا اور سکیورٹی فون پر کمانڈر انچیف سے رابطہ کیا ''سر، دیکھیں کیا ہوا ہے'' انہوں نے کہا ''یہ اسی قسم کا آدمی ہے، مزہ چکھاتے ہیں اسے!'' یہ ہمارا اصل مسئلہ ہے، سیاسی انتشار۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب ہم نے محسوس کیا کہ آرمی کا تحفظ ضروری ہے۔ اس وقت یہ لوگ آرمی ہی کے اندر گروہ بندیاں کر رہے تھے۔'' [52]

پنجابی اور سندھی سیاست دان دولتانہ اور کھوڑو اور کراچی کے تاجر سول اور آرمی بیوروکریسی کے ساتھ مل گئے اور گورنر جنرل غلام محمد کو حمایت کا یقین دلا دیا۔ غلام محمد نے وزیراعظم بوگرہ کو امریکی دورہ سے فوری واپس بلا لیا۔ بوگرہ جب کراچی ایئرپورٹ پہنچے تو فوج کے جرنیل انہیں اپنی کار میں بٹھا کر سیدھا گورنر جنرل کے دفتر میں لے گئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو برطرف کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل

[52] سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 47-48

کو فوج کی آشیرباد حاصل تھی۔ [53]

گورنر جنرل غلام محمد نے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سے مشورہ کے بعد 24 اکتوبر 1954ء کو ایک حکم نامے کے ذریعے ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کر کے اسمبلی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہ غلام محمد کا دوسرا سنگین اور عاقبت نااندیشانہ اقدام تھا جس نے ملک اور قوم کو گہرے آئینی، سیاسی اور جمہوری بحران میں مبتلا کر دیا۔ اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ میں گورنر جنرل کے اس اقدام کو چیلنج کر دیا۔ سندھ چیف کورٹ نے متفقہ فیصلہ دیا کہ آئین ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے اور اسے اس وقت تک نہیں توڑا جا سکتا جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر لے جس مقصد کی خاطر یہ اسمبلی وجود میں آئی۔

وفاق پاکستان نے اس فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل کی۔ چیف جسٹس فیڈرل کورٹ جسٹس منیر اور بنچ میں شامل اکثریتی ججوں نے چیف کورٹ سندھ کے متفقہ فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر گورنر جنرل غلام محمد کے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اقدام کو آئینی قرار دے دیا۔ بنچ کے رکن جسٹس اے آر کارنیلیس (A . R. Cornelius) نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اختلافی نوٹ لکھا۔ پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ کا یہ پہلا افسوسناک فیصلہ تھا جس میں فیڈرل کورٹ نے آئینی تقاضوں اور سیاسی و جمہوری ادارے کی بقا کے خلاف فیصلہ دیا۔ چیف جسٹس منیر نے عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی کو زندہ درگور کر دیا۔ جسٹس منیر نے اپنا ہاتھ اسمبلی پر رکھنے کی بجائے ایک بیوروکریٹ گورنر جنرل کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ عدلیہ کی آزادی کی شاندار روایت قائم کر سکتے تھے۔ مگر ہماری عدلیہ حکمرانوں کی لونڈی بن گئی۔ جسٹس منیر نے بعد میں کئی مواقع پر تسلیم کیا کہ عدلیہ نے یہ فیصلہ ملکی تقاضوں اور سیاسی مصلحت کے تحت کیا تھا۔ غلام محمد کے سیکریٹری قدرت اللہ شہاب کے مطابق فیڈرل کورٹ میں مولوی تمیز الدین کے کیس کی سماعت کے دوران ان کا ایک اسسٹنٹ بغیر اطلاع کے آفس سے غائب ہو جاتا تھا اس کی جواب طلبی کی گئی تو اس نے تحریری طور پر معذرت کی اور زبانی بتایا کہ وہ گورنر جنرل غلام محمد کے خفیہ پیغام لے کر جسٹس منیر کے پاس جایا کرتا تھا۔ [54] حمیدہ کھوڑو کے مطابق غلام محمد نے اسمبلی توڑنے سے قبل چیف جسٹس منیر کو اپنے دفتر بلایا اور اسے انتباہ کیا وہ اسمبلی بحال نہ کرے۔ چیف جسٹس نے تعاون کیا۔ [55] مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی اگر خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کو قبول نہ کرتی تو غلام محمد کبھی اسمبلی کو برطرف نہ کرتے۔ جب منتخب نمائندے ایک بار کسی حکمران کے غیر آئینی اور غیر جمہوری اقدام کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ اپنی اہمیت اور طاقت کھو بیٹھتے ہیں اور آمرانہ مزاج رکھنے والا حکمران منتخب نمائندوں پر بالادستی اختیار کر لیتا ہے۔ غلام محمد نے اسمبلی کے سیاسی اراکین کو تو گھر بھیج دیا مگر بوگرہ جس کے ایماء پر دستور ساز اسمبلی نے آئینی ترامیم کی تھیں اسے وزیراعظم برقرار رکھا۔ بوگرہ بیوروکریسی کے رشتے میں جڑا ہوا تھا اور امریکہ کا منظورِ نظر تھا لہٰذا

[53] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 192
[54] قدرت اللہ شہاب ''شہاب نامہ'' صفحہ 664
[55] حمیدہ کھوڑو "M. Ayub Khuhro" صفحہ 409

اسے معاف کر دیا گیا اور بوگرہ نے بھی اسمبلی کی برطرفی کو تسلیم کر لیا۔ بعض اہم سیاست دان بھی اسمبلی کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ممتاز سیاست دان جو تحریک پاکستان میں حصہ لینے کے دعویدار تھے سول ملٹری بیورو کریسی کے جونیئر پارٹنر بننے کے لیے آمادہ ہوگئے۔

سول اور ملٹری بیورو کریٹس کے گٹھ جوڑ نے کمزور اور منقسم سیاست دانوں پر مکمل بالادستی حاصل کر لی۔ بوگرہ نے نئی وزارت تشکیل دی۔ آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان وردی سمیت وزیر دفاع بن گئے۔ سیکریٹری داخلہ سکندر مرزا وزیر داخلہ اور سیکریٹری جنرل سول سروس چوہدری محمد علی وزیر خزانہ بن گئے۔ یہ حضرات مسلم لیگ کے رکن بھی نہیں تھے۔ سول اور ملٹری بیورو کریٹس نے گورنر جنرل، وزارت عظمیٰ، دفاع، داخلہ اور خزانہ جیسے اہم سیاسی مناصب پر قبضہ کر لیا۔ سول اور ملٹری بیورو کریٹس کی کابینہ میں شمولیت قائداعظم کے نظریہ سیاست وحکومت کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ پاکستان کے سیاست دانوں کا فرض تھا کہ وہ متحد ہو کر سرکاری ملازمین کی کابینہ میں شمولیت کو چیلنج کرتے اور مزاحمتی تحریک شروع کرتے۔ مسلم لیگ منتشر اور غیر منظم تھی۔ حکمران کی تابعداری اس کے مزاج اور فطرت کا حصہ تھا لہٰذا پاکستان کی تاریخ کا پہلا سول ملٹری انقلاب کامیاب ہوگیا۔ اور اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یہ انقلاب ایک سویلین مارشل لا تھا جس کی قیادت کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں تھی۔ گورنر جنرل اور وزیراعظم سویلین بیوروکریٹ تھے مگر کلیدی فیصلے کمانڈر انچیف (وزیر دفاع) کی منظوری سے ہوتے تھے۔ گویا فوج نے بالواسطہ اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔

جنرل ایوب نے وزیر دفاع کی حیثیت سے کابینہ میں شمولیت کے بارے میں کہا:۔

''میں نے دفاع کی وفاقی وزارت اس لیے قبول کی کیونکہ میں سیاست دانوں اور فوج کے درمیان ایک پُل بننا چاہتا تھا۔''

جنرل ایوب وزیر دفاع بنے تو اونٹ کا سر خیمے میں آ گیا اور رفتہ رفتہ پورا اونٹ خیمے میں داخل ہوگیا۔ جنرل ایوب کو وزیر دفاع کی حیثیت سے فوج میں افسروں کی تعیناتی، ٹرانسفر، پروموشن اور ریٹائرمنٹ کے اختیارات حاصل ہوگئے۔

جب سول حکومتیں فوج پر انحصار کرنے لگتی ہیں تو فوج اقتدار ایک فرد سے دوسرے فرد اور ایک گروپ سے دوسرے گروپ کو منتقل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں یہی تماشہ ہوتا رہا اور بعد میں اس روایت نے مستقل شکل اختیار کر لی۔ میکراتھ لکھتے ہیں:۔

" Neither the people of Pakistan through their lack of education, nor the politicians through their alleged ill discipline and corruption were to blame for the demise of Pakistan's democracy. The responsibility lay with Mirza, Ghulam Muhammad and Munir who provided a legal smokescreen for their authoritarian activities.

ترجمہ: ''نہ تو پاکستان کے عوام تعلیم کی کمی کی بناء پر اور نہ ہی سیاست دان مبینہ بدنظمی اور کرپشن کی وجہ سے پاکستان میں جمہوریت کے خاتمے کے ذمہ دار تھے۔ اس کی ذمہ داری مرزا (سکندر مرزا)، غلام محمد اور منیر (چیف جسٹس) پر عائد ہوتی ہے جس نے ان کی آمرانہ سرگرمیوں کے لیے آئینی جواز فراہم کیا۔''

فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد پاکستان کی دوسری دستور ساز اسمبلی منتخب کی گئی۔ جو اسی (80) ارکان پر مشتمل تھی۔ پہلی دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی اکثریت تھی۔ دوسری اسمبلی میں اس کے صرف 25 ارکان منتخب ہو سکے۔ دستور ساز اسمبلی کے اراکین کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں کے ارکان نے متناسب نمائندگی کے اصول پر کیا۔ غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کے بعد نئے عام انتخابات کے ذریعے نئی اسمبلی منتخب کرنے سے گریز کیا تا کہ سیاست دان بالادستی حاصل نہ کر سکیں۔ گورنر جنرل غلام محمد کی صحت زیادہ بگڑ گئی اور ان کی کابینہ کے 14 وزراء میں سے صرف 7 وزیر اسمبلی کے رکن منتخب ہو سکے۔ چنانچہ گورنر جنرل غلام محمد اور وزیراعظم بوگرہ دونوں کو اپنے عہدوں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ بوگرہ کابینہ کے وزیر داخلہ سکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل اور فنانس منسٹر چوہدری محمد علی وزیراعظم بن گئے۔ برطانوی ہائی کمشنر نے چوہدری محمد علی کے بارے میں یہ ریمارکس دیئے۔

"Deplorable departure from the established parliamentary norms."

ترجمہ: ''مسلمہ پارلیمانی روایات سے افسوسناک انحراف۔''

چوہدری محمد علی ایک سول سرونٹ تھے۔ ان کی بطور وزیراعظم نامزدگی اس بات کی دلیل تھی کہ سیاسی قیادت بحران کا شکار تھی۔ حسین شہید سہروردی وزارت عظمیٰ کے منصب کے لیے موزوں سیاسی شخصیت تھے مگر سول سرونٹ کو ترجیح دی گئی۔ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستانی قوم کنفیوز اور تقسیم ہو چکی تھی۔ مذہبی عناصر اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتے جبکہ لبرل عناصر پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے پر زور دیتے۔ سکندر مرزا نے 7 فروری 1955ء کو نیویارک ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

"We cannot run wild on Islam, it is Pakistan first and Pakistan last."

ترجمہ: ''ہم اسلام کے بارے میں وحشیانہ رویہ اختیار نہیں کر سکتے پاکستان سب سے پہلے اور پاکستان سب سے آخر ہونا چاہیے۔''

سکندر مرزا اور ایوب خان کا خیال تھا کہ کسی شخص کو کسی دوسرے کے عقیدے کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے اور اسلام کے بارے میں اندھی تقلید نہیں ہونی چاہیے۔

آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 129

عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 227

دستور ساز اسمبلی نے 30 ستمبر 1955ء کو ایک بل منظور کر کے مغربی پاکستان کو ون یونٹ قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ سیاسی نہیں بلکہ سول اور ملٹری بیوروکریسی کا تھا جس کا مقصد بنگال کی اکثریت کو قبول نہ کرنا اور وفاق پر مغربی پاکستان خاص طور پر پنجاب کی بالادستی کو قائم رکھنا تھا۔ ون یونٹ کا فیصلہ پاکستان کے لیے خوشگوار ثابت نہ ہوا اور مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔

چوہدری محمد علی کے دور اقتدار میں 23 مارچ 1956ء کو آزادی کے تقریباً نو سال بعد پاکستان کے عوام کو پہلا آئین نصیب ہوا۔ 1956ء کے آئین کے نفاذ کے بعد سکندر مرزا نے صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ سکندر مرزا نے آئین کی منظوری اس شرط پر دی کہ انہیں صدر بنایا جائے۔ سکندر مرزا نے نئی سیاسی جماعت ری پبلکن کے نام سے بنائی۔ ایوان صدر میں وزارتوں اور مراعات کے حصول کے لیے اراکین اسمبلی کی منڈی لگ گئی۔ سکندر مرزا کے دور صدارت میں چار وزرائے اعظم کا اقتدار ختم ہوا۔ چوہدری محمد علی نے مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کے لیے ڈاکٹر خان صاحب کا انتخاب کر کے اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیں۔ ان کا تعلق کانگریس سے تھا اور مسلم لیگی اس نامزدگی پر ناراض تھے۔۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو صدر سکندر مرزا کی حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں ری پبلکن پارٹی قائم کر لی۔ سیاست دان جمہوریت کے استحکام کے پیش نظر متحد ہونے کی بجائے منقسم ہوگئے۔ سول اور ملٹری بیوروکریٹس نے سیاست دانوں کے اختلافات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چوہدری محمد علی نفیس انسان تھے اور محلاتی سازشوں میں یقین نہیں رکھتے تھے ان کو قومی اسمبلی میں اکثریت کا اعتماد حاصل تھا مگر انہوں نے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی سیاسی کشمکش کی وجہ سے بیزار ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ [38]

حسین شہید سہروردی مشرقی اور مغربی پاکستان کے پاپولر لیڈر تھے۔ ان کو وزیراعظم ان شرائط پر قبول کیا گیا کہ وہ مغرب نواز خارجہ پالیسی جاری رکھیں گے۔ فوج کے امور میں مداخلت نہیں کریں گے اور مولانا بھاشانی کی عوامی لیگ کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں گے۔ [39] ان شرائط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوروکریسی کتنی منہ زور ہو چکی تھی۔ سہروردی نے ستمبر 1956ء میں وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا۔ سہروردی کو اقتدار سنبھالتے ہی ون یونٹ کی مخالفت، جداگانہ اور مخلوط انتخاب پر اختلافات اور مذہبی رہنماؤں کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار پہلے ہی ان کے خلاف تھے۔ سہروردی کے لیے صوبوں کے مطالبات اور وفاق کے مفادات کے درمیان توازن رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا انہوں نے مشرقی پاکستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے مراعات کا اعلان بھی کیا اور نیشنل شپنگ کارپوریشن کے لیے دس ملین ڈالر کی امداد کا کثیر حصہ مشرقی پاکستان میں خرچ کر دیا۔ کراچی کے تاجر اور صنعت کار سہروردی سے ناراض ہوگئے۔

[38] کے کے عزیز "Party Politics in Pakistan 1947-1958" صفحہ 33

[39] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 253

ری پبلکن نے ان کی حمایت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ سہروردی نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینے کی خواہش کا اظہار کیا جسے سکندر مرزا نے مسترد کر دیا اور مستعفی نہ ہونے کی صورت میں سہروردی کو برطرف کرنے کی دھمکی دے دی۔ سہروردی نے 10 اکتوبر 1957ء کو استعفیٰ دے دیا۔

سکندر مرزا کے قریبی دوست اور مغربی پاکستان کے تاجروں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے قومی اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر آئی آئی چندریگر پاکستان کے چھٹے وزیراعظم بن گئے انہوں نے سہروردی کی طرف سے مشرقی پاکستان کو دی جانے والی دس ملین ڈالر کی امداد روک لی اور نیشنل شپنگ کارپوریشن کا کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ کوشش کے باوجود آئی آئی چندریگر دو ماہ سے زیادہ وزیراعظم نہ رہ سکے۔ ان کے وزارت عظمیٰ کے منصب سے علیحدہ ہونے پر بھارت کے وزیراعظم نہرو نے ایک تاریخی جملہ کہا۔

"میں اتنے پاجامے نہیں بدلتا جتنے پاکستان کے وزیراعظم بدلتے ہیں۔"

فیروز خان نون جنہیں قومی اسمبلی میں ری پبلکن کے 21 اراکین کی حمایت حاصل تھی پاکستان کے ساتویں وزیراعظم بن گئے اور دوسرے سیاسی گروپوں سے مل کر مخلوط حکومت قائم کر لی۔ سکندر مرزا نے سیاسی جماعتوں کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ درست ہے کہ سیاست دانوں نے اصولی اور جمہوری سیاست کا مظاہرہ نہ کیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سول اور ملٹری بیوروکریٹس نے مرکز کی اتھارٹی قائم کرنے کے لیے صوبوں کو خود مختار اور مستحکم نہ ہونے دیا۔

آزادی کے بعد سات برسوں میں دس صوبائی وزرائے اعلیٰ کرپشن اور قانونی بے ضابطگیوں کے الزام میں برطرف کیے گئے۔ صوبوں میں گورنر راج نافذ ہوئے، ان اقدامات سے سیاست دان بدنام اور سیاسی جماعتیں کمزور ہوئیں۔ [40] (1947ء میں خاں صاحب صوبہ سرحد، 1948ء میں کھوڑو سندھ، 1949ء میں خدا بخش سندھ، اور خاں ممدوٹ پنجاب، 1951ء میں کھوڑو سندھ، 1953ء میں ممتاز دولتانہ پنجاب، 1954ء میں، عبدالستار پیرزادہ سندھ، فیروز خان نون پنجاب اور فضل الحق مشرقی پاکستان۔)
پاکستان میں حکومتوں کے بنانے اور ان کی تبدیلی میں قومی اسمبلی کا کوئی کردار نہیں رہا۔ حکومت سازی کے فیصلے اسمبلی سے باہر کیے جاتے رہے۔ کوئی ایک حکومت بھی اسمبلی میں عدم اعتماد کے نتیجے میں ختم نہ ہوئی۔

پاکستان کے عوام حکومتوں کی تبدیلی سے تنگ آ چکے تھے انہوں نے نئے انتخابات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ سکندر مرزا انتخابات کے لیے شیڈول کا اعلان کر کے ملتوی کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے مارچ 1959ء میں عام انتخابات کرانے کا حتمی اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ملک کے اندر انتخابی سرگرمیاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ خان عبدالقیوم خان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ملک بھر میں دورے کر کے جلسوں سے پرجوش خطاب کر رہے تھے۔ ایک جلسہ میں انہوں نے کہا کہ مرکزی حکومت نے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی شکل اختیار کر لی ہے جو بے روزگار سیاست دانوں کو روزگار فراہم کرتا ہے۔

[40] ڈاکٹر صفدر محمود "مسلم لیگ کا دور حکومت" صفحہ 272

"An employment exchange for unemployed politicians." [41]

خان قیوم 32 میل لمبے جلوس کے ساتھ گجرات پہنچے۔ جلوس کے شرکاء نے انتخابات کے حق میں اور سکندر مرزا کے خلاف پُرجوش نعرے لگائے۔ خان قیوم نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا چیلنج دے دیا۔ سہروردی مشرقی اور مغربی پاکستان کے دورے کر کے سیاست دانوں کو متحد کرتے رہے انہوں نے انتخابات کے بعد فیروز خان نون کو پاکستان کا صدر بنانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ سکندر مرزا عوامی جلسے اور جلوسوں سے خوف زدہ ہوگئے۔ سکندر مرزا کا خیال تھا کہ نئے انتخابات کے بعد اقتدار ان کی گرفت سے نکل جائے گا۔ پاک فوج بھی انتخابات سے خوف زدہ تھی۔ جنرل ایوب کی کمانڈرانچیف کی مدت ختم ہونے والی تھی اور منتخب حکومت سے انہیں توسیع ملنے کی امید نہ تھی۔ امریکہ کو یہ ڈر تھا کہ نئے انتخابات کے نتیجے میں پروگریسو اور جمہوری جماعتیں اقتدار پر قابض ہوجائیں گی اور پاکستان کے امریکہ سے دفاعی معاہدے ختم کر دیں گی۔ اس طرح علاقے میں امریکی مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اگر سہروردی کو انتخابات کے بعد مخلوط حکومت بنانے کا موقع مل جاتا تو بنگالیوں کا احساسِ محرومی ختم ہوجاتا اور جمہوریت پٹڑی پر چڑھ جاتی۔ سہروردی قومی سطح کے باصلاحیت لیڈر تھے۔

الطاف گوہر کے مطابق ایوب خان نے کہا کہ سیاست دانوں کو انتخابی فوبیا ہوگیا ہے وہ اقتدار میں آنے کے لیے بے چین ہیں اور مجھے اپنا دشمن نمبر ون سمجھتے ہیں وہ اپنے سیاسی مفادات کے لیے فوج کو تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے جو ملک کا واحد محافظ ادارہ ہے۔ [42]

جنرل ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے سے قبل ہی اصل حکمران کی طرح کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ سٹیٹ بینک کے گورنر عبدالقادر نے اگست 1958ء میں کہا کہ افراطِ زر کو کنٹرول کرنے کے لیے دفاعی بجٹ اور امریکن ایڈ کو کم کرنا ضروری ہے۔ ایوب خان نے وزیراعظم کو خط لکھ کر گورنر سٹیٹ بینک کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور اس کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کو روکنے کی ہدایت کی۔ [43] ایوب خان نے خواجہ ناظم الدین سے لے کر فیروز خان نون تک سب کے خلاف توہین آمیز ریمارکس دیے اور ان پر طنز و مزاح کے تیر برساتے رہے۔ [44]

پاکستان کے ابتدائی سالوں میں بھارت کی جانب سے خطرہ سیاست دانوں اور سول ملٹری بیوروکریٹس کے ذہنوں پر طاری رہا ان کا بجا طور پر یہ خیال تھا کہ دفاعی طور پر ایک کمزور ریاست سماجی اور معاشی ترقی نہیں کر سکتی لہٰذا پاکستان کے ہر حکمران نے دفاع کو بڑی اہمیت دی۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 1948 میں کہا کہ دفاع پاکستان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس شعبہ کو حکومت کے

[41] مارننگ نیوز (کراچی) 9 اپریل 1958

[42] الطاف گوہر "Pakistan's First Military Ruler" صفحہ 125

[43] الطاف گوہر ایوب خان۔ پاکستان کا پہلا فوجی حکمران صفحہ 144

[44] الطاف گوہر ایوب خان۔ پاکستان کا پہلا فوجی حکمران صفحہ 128

دوسرے تمام شعبوں پر بالادستی حاصل ہوگی۔ [45] وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے اپنے ایک پالیسی بیان میں کہا کہ وہ مضبوط دفاع کی خاطر عوام کو بھوکا رکھنا بھی گوارا کر لیں گے۔ [46] سکندر مرزا نے 1957 میں ایک بیان میں کہا کہ ہر پاکستانی کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کی افواج کو مضبوط بنائے تاکہ ہمارے عوام امن سے رہ سکیں۔ [47] یہ درست ہے کہ ریاست کا دفاع پہلی ترجیح ہوتی ہے مگر ہمارے حکمران بھارت کے خوف میں اس قدر مبتلا تھے اور فوجی جرنیلوں کے دباؤ میں تھے کہ وہ یہ بھول گئے کہ سیاسی استحکام اور دفاع لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے ایک آزاد، خودمختار، خوشحال اور مضبوط ریاست کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کاش ہمارے سیاست دان اور بیوروکریٹس پاکستان کو ابتدائی سالوں میں دفاع کے ساتھ ایک مضبوط اور مستحکم سیاسی نظام بھی دے سکتے! سکندر مرزا اور جنرل ایوب قریبی دوست تھے مگر انفرادی خواہشات کے حامل تھے مگر اس امر پر متفق تھے کہ سیاست دان نااہل اور کرپٹ ہیں لہٰذا اقتدار ان کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔

سیاست دان اقتدار کی کشمکش میں اس قدر ملوث ہوچکے تھے کہ انہیں پارلیمانی جمہوری روایات کا کوئی احساس نہ تھا۔ ستمبر 1958ء میں مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی گئی تو اسمبلی کے اندر اس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی کہ ایوان کے اندر پولیس کو طلب کرنا پڑا۔ اس ہنگامہ آرائی میں تیس اراکین اسمبلی زخمی ہوئے اور ڈپٹی سپیکر شاہد علی زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ صوبوں میں ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا تھا۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی یہ مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی کیونکہ اس طرح وفاق کی طاقت کم ہوسکتی تھی اور صوبے قدرے مستحکم ہوجاتے۔

صوبائی سیاست محلاتی سازشوں اور محاذ آرائی کا شکار رہی۔ صوبائی لیڈر اقتدار کے حصول کے لیے جمہوری روایات کو پامال کرتے رہے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان نے مسلم لیگ میں گروہی اختلافات ختم کرانے کی کوشش کی مگر غلام محمد اور سکندر مرزا اپنے اقتدار اور سیاسی مفادات کے لیے صوبائی لیڈروں کو آپس میں لڑاتے رہے۔ صوبائی سیاست اور حکومت میں سرگرم حصہ لینے والے قابلِ ذکر سیاست دانوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

پنجاب: میاں ممتاز دولتانہ، نواب افتخار ممدوٹ، سردار شوکت حیات، خضر حیات، ملک فیروز خاں نون، میاں افتخار الدین، مشتاق احمد گورمانی، چوہدری محمد حسین چٹھہ۔

سندھ: ایوب کھوڑو، پیر الٰہی بخش، پیرزادہ عبدالستار، یوسف ہارون، جی ایم سید، قاضی فضل اللہ، میر غلام علی تالپور، قاضی عیسیٰ، آغا غلام نبی پٹھان۔

[45] نیوز کرانیکل 19 اکتوبر 1948

[46] ڈان 17 اگست 1953

[47] ڈان یکم اگست 1957

سرحد: خان عبدالقیوم خان، پیر مانکی شریف، خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب، سردار بہادر خان، سردار عبدالرشید، یوسف خٹک۔

مشرقی پاکستان: چوہدری خلیق الزماں، حسین شہید سہروردی، مولانا عبدالحمید بھاشانی، مولوی فضل حق، مولانا محمد اکرم خان۔

ابتدائی سالوں میں صوبوں کی سیاست کے بارے میں سید نور احمد رقمطراز ہیں:۔

''دسمبر 1957ء میں ملک فیروز خان نون نے جو وزارت مرتب کی وہ پاکستان کے پارلیمانی دور کی آخری اور سب سے کمزور وزارت تھی۔ جب یہ وزارت بنی تو ملک کے سیاسی حالات میں ابتری اپنی انتہا کے قریب پہنچ چکی تھی۔ عوام کی نمائندگی کے نام پر جو سیاستدان مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر قابض تھے ان کی نگاہوں سے ملک کی تعمیر و ترقی اور مستقبل اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہر مسئلہ قطعاً اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف ایک سوال کو حاصل تھی۔ کون سے گٹھ جوڑ کے ذریعے اکثریت قائم کی جا سکتی ہے۔ یا قائم شدہ اکثریت کو توڑا جا سکتا ہے؟ برسر اقتدار پارٹیوں کا تمام وقت اپنی اکثریت کو بچانے اور مخالف پارٹیوں کا تمام وقت ان کی اکثریت کو توڑ کر متبادل اکثریت قائم کرنے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ اور اس شطرنج کے کھیل میں کسی پارٹی کو کسی قسم کی بے اصولی اور بدعنوانی سے عار نہ تھا۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ تھا کہ ملک کی اقتصادی اور معاشی زندگی تیزی کے ساتھ تباہی کے راستے پر جا رہی تھی۔ ملک اقتصادی دیوالیہ پن کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ پیداوار، برآمدات کی مقدار روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلا پنجسالہ تعمیری منصوبہ کسمپرسی کی حالت میں چل رہا تھا۔ سونے وغیرہ کے محفوظ ذخائر کم ہوتے ہوتے خطرے کے نشان سے بھی نیچے چلے گئے تھے۔[48]

پاکستان کے نیک نام سیاست دان شیر باز مزاری نے جمہوریت کی ناکامی کا بڑا ذمہ دار غلام محمد اور سکندر مرزا کو قرار دیا ہے۔ جنہوں نے آئین سازی میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور منتخب نمائندوں کو امور مملکت چلانے کا آزادانہ موقع نہ دیا۔ سیاست دانوں نے بیوروکریٹس کے اشاروں پر ذاتی اقتدار کے لیے جمہوری اصولوں کو پامال کیا اور جنرل ایوب خان نے بیوروکریٹس کی حوصلہ افزائی کر کے جمہوریت کو جڑ پکڑنے کا موقع نہ دیا۔[49]

پاکستان کے ابتدائی دس قیمتی سال سیاست دانوں اور سول ملٹری بیوروکریٹس کی سیاسی کشمکش میں گزر گئے۔ آئینی، جمہوری اور سیاسی ادارے مستحکم نہ ہو سکے۔ جنرل ایوب خان نے 1951ء میں کمانڈر ان چیف بننے کے بعد سیاست اور جمہوریت کو پنپنے نہ دیا۔ ان کی حکومت اور سیاست میں غیر ضروری مداخلت حالات کی خرابی کا سبب بنی اور بعد میں انہوں نے خود ہی حالات کی ابتری کا بہانہ بنا کر اقتدار پر قبضہ کر کے ملک

[48] سید نور احمد ''مارشل لاء سے مارشل لا تک'' صفحہ 489

[49] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 95

پر مارشل لا مسلط کر دیا۔ یہ تاثر درست نہیں ہے کہ جب ایوب خان نے 1958ء میں اقتدار سنبھالا اس وقت ملک کی معیشت تباہ حال تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ 58-1957 کے قومی بجٹ میں 32 لاکھ روپے فالتو (surplus) دکھائے گئے تھے۔[50]

57-1956 کے قومی بجٹ میں دفاع کے لیے 800.9 ملین روپے مختص کیے گئے جو 58-1957 میں بڑھ کر 854.2 ملین روپے اور 59-1958 میں 996.6 ملین روپے ہو گئے۔[51] دفاعی اخراجات میں ہر سال اضافے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی معیشت مستحکم تھی۔ لہٰذا ان تجزیہ نگاروں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا جن کی رائے یہ ہے کہ جب 1958ء میں ایوب خان نے اقتدار سنبھالا اس وقت پاکستان کی سیاسی اور معاشی حالت دگرگوں تھی۔

1947 سے 1958 تک غیر نمائندہ پارلیمنٹ کا تجربہ کیا گیا۔ اس دوران صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تو ہوئے مگر قومی اسمبلی کے انتخابات نہ کرائے گئے۔ دو دستور ساز اسمبلیوں نے قانون ساز اداروں (Legislative Bodies) کے طور پر کام کیا اور اختیارات گورنر جنرل (صدر) اور وزیراعظم کے درمیان منتقل ہوتے رہے۔ 1958 میں یہ سیاسی نظام تبدیل ہو گیا۔[52] امریکہ نے پاکستان کے لیے ایڈ ٹو پالیسی (aid-to-policy) کی حکمت عملی اپنائی۔ امریکہ پاکستان کو امداد دیتا اور پاکستان کی خارجہ اور معاشی پالیسی کو مانیٹر کرتا۔

مسٹر آر ڈبلیو ڈی فلاور (R.W.D FLAWER) برطانوی ہائی کمشنر کراچی نے 21 مئی 1958ء کو ایک خط لندن روانہ کیا جس کا ریفرنس نمبر 35/8936 DO ہے اس خط میں مسٹر فلاور نے تحریر کیا کہ اسکندر مرزا کچھ عرصہ تک اقتدار اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور یہ خیال ان کے ذہن میں اس وقت آیا جب دسمبر 1957ء میں چندریگر حکومت کا خاتمہ ہوا۔[53]

الیگزنڈر سائمن ہائی کمشنر برطانیہ نے کراچی سے بتاریخ 27 ستمبر 1958ء کو ایک خط ریفرنس DO 35/8943 لندن ارسال کیا جس میں تحریر کیا۔

"The upshot of it is that it is all too clear that the suspicions I hinted at the last paragraph of my letter were entirely justificed. The president if he can help it, will not allow elections to be held andhe has in mind personal coup with

[50] Fifty Years of Pakistan in Statistics: Bureau of Statistics, Government of Pakistan

[51] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 44

[52] سلیگ ہیریسن، ڈینس ککس "India And Pakistan" صفحہ 46

[53] روئیداد خان "The British Papers" صفحہ 5

Army support. He specifically requested me to tell Mr. Macmillan of this and to say that he hoped Mr. Macmillan would understand and sympathise with the action he proposes to take." ⓭

ترجمہ: ''اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ میں نے اپنے (سابقہ) خط کے آخری پیراگراف میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل درست تھے۔ صدر (سکندر مرزا) کے لیے اگر ممکن ہوا تو وہ انتخابات نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے ذہن میں فوج کی حمایت سے انقلاب کے ذریعے ذاتی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ اس نے خصوصی طور پر مجھ سے درخواست کی کہ میں مسٹر میکمیلن کو اس بارے میں مطلع کر دوں اس نے کہا کہ اسے اُمید ہے کہ مسٹر میکمیلن اس بات کا ادراک کریں گے اور وہ جو اقدام اُٹھانا چاہتے ہیں اس کی حمایت کریں گے'' ⓭

امریکہ اور برطانیہ نے جو سیکرٹ پیپرز ڈی کلاسیفائی کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان دونوں امریکہ اور برطانیہ کے سفیروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور ان سے ہدایات لیتے تھے اور پاکستان کے حساس نوعیت کے اہم معاملات کے سلسلے میں ان سے مشاورت کرتے تھے۔ اگر ابتدائی سالوں میں امریکہ اور برطانیہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں غیر معمولی مداخلت کر رہے تھے تو آج ان کی مداخلت کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

⓭ روئیداد خان   The British Papers   صفحہ 13

باب 4

پاکستان میں فوجی اقتدار کا بانی

19 مئی 1958 تک سکندر مرزا اور ایوب خان نے امریکہ کو اپنی اس رائے سے مطلع کر دیا تھا کہ ''پاکستان میں صرف ڈکٹیٹر شپ کام کرے گی۔'' ❶ سکندر مرزا نے مارشل لا نافذ کرتے ہی امریکی سفیر، برطانوی ہائی کمشنر اور دیگر سفارت کاروں کو اپنے آفس میں بلایا اور ان کو جنرل ایوب خان کی موجودگی میں بتایا کہ پاکستان میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے۔ سکندر مرزا نے 8 اکتوبر 1958 کی صبح کو ملک بھر میں مارشل لا نافذ کر دیا اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نامزد کر دیا۔

گورنر جنرل غلام محمد اور صدر سکندر مرزا کے سیکریٹری قدرت اللہ شہاب پاکستان کے پہلے مارشل لا کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''جمہوریت کو پامال کرنے کا جو عمل مسٹر غلام محمد نے شروع کیا تھا میجر جنرل سکندر مرزا نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اکتوبر 1958ء میں آئین منسوخ کرنے کا بالکل جواز نہ تھا۔ اس وقت پاکستان کسی غیر معمولی بیرونی خطرے سے دوچار نہ تھا۔ اندرونی خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر انتخابات منعقد ہوجاتے تو غالباً سکندر مرزا صاحب کو کرسیٔ صدارت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اپنی صدارت کو اس افتاد سے بچانے کے لیے انہوں نے یہ رٹ لگائی کہ 1956 کا آئین ناقابل عمل ہے۔'' ❷

ایئر مارشل اصغر خان پہلے مارشل لا کے عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک تصنیف ''جرنیل اور سیاست'' میں کچھ چشم کشا واقعات بیان کیے ہیں۔

''ایوب خان کو حکومت چلانے کے مکمل اختیارات حاصل تھے لیکن سکندر مرزا کی موجودگی انہیں ناگوار لگتی تھی۔ ناگواری کا یہ احساس جلد ہی دونوں طرف محسوس ہونے لگا۔ دونوں کے مشیروں نے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ طاقت کے استعمال میں ساجھے داری برداشت نہیں کی جاسکتی۔ بداعتمادی بڑھتی چلی گئی اور یہ حقیقت جلد واضح ہوگئی کہ مفادات کے طابع یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ انہی دنوں ایوانِ صدر

❶ عائشہ جلال   "The State of Martial Rule"   صفحہ 273

❷ قدرت اللہ شہاب   ''شہاب نامہ''   صفحہ 715

میں ایک استقبالیے کے دوران ایک انتہائی زیرک سفارت کار کینیڈا کے ہائی کمشنر مورن نے ایوب خان سے سوال کیا: 'جنابِ وزیر اعظم! آپ اگلا قدم کب اٹھا رہے ہیں'۔ 'کیا مطلب؟' ایوب خان نے حاضر جوابی سے کہا۔ ہائی کمشنر بغیر کچھ بولے مسکرا دیئے، لیکن ایوب خان سمیت وہاں موجود ہر فرد یہ سمجھ گیا کہ مورن کا مطلب کیا تھا۔ ان حالات میں ایوب خان اکتوبر 1958ء کے تیسرے ہفتے میں مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے گئے۔ اس دوران پنجاب کے ایک دورے کے بعد میں جب شام کو کراچی واپس پہنچا تو ایئر پورٹ پر میری ملاقات میرے چیف آف سٹاف ائر کموڈور مقبول رب سے ہوئی۔ وہ بڑے اضطراب میں تھے اور مجھے ایک غیر معمولی واقعہ سنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ''کل سہ پہر صدر سکندر مرزا نے مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا کہ میں ملیر میں آرمی گیریژن کے کمانڈر بریگیڈیئر قیوم شیر سے رابطہ کروں۔ رب کے بیان کے مطابق صدر سکندر مرزا نے اُن سے کہا کہ وہ بریگیڈیئر قیوم شیر کی مدد سے بریگیڈیئر یحییٰ خان اور ملک شیر بہادر کو گرفتار کر کے اس کے پاس لے آئے۔ صدر سکندر مرزا کی خواہش تھی کہ یہ کارروائی رات سے پہلے مکمل ہونی چاہیۓ۔ مقبول رب نے کہا: 'اس حکم سے میں بُری طرح بوکھلا گیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہ ٹیلی فون سکندر مرزا ہی نے کیا ہے'۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرے کمانڈر انچیف (اصغر خان) کل کراچی آ رہے ہیں۔ بہتر ہے یہ ذمہ داری انہیں ہی سونپی جائے۔ اس پر صدر نے ناراضگی کا اظہار کیا اور حکم دیا کہ ان کے احکامات پر فوراً عمل کیا جائے۔ بعد ازاں مقبول رب صدر سے ملاقات کے لئے ایوانِ صدر گئے۔ صدر اُس وقت لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ صدر نے مقبول رب کی موجودگی کا علم ہونے کے باوجود انہیں نہ بلایا۔ رب چونکہ خود بھی ملنے کے زیادہ خواہشمند نہ تھے، لہٰذا آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد واپس آئے اور بریگیڈیئر یحییٰ خان اور ملک شیر بہادر کو تمام کارروائی سے آگاہ کر دیا۔

رب چونکہ سکندر مرزا کے ساتھ اکثر برج کھیلا کرتے تھے، اس لئے وہ اپنے عہدے کے برابر کے افسروں سے زیادہ بہتر طور پر انہیں جانتے تھے۔ اگرچہ یہ قصہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ وہ سکندر مرزا ہی تھے جنہوں نے مقبول رب سے ٹیلی فون پر یہ بات کی تھی۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا۔ ملٹری انٹیلی جنس نے سید امجد علی اور سکندر مرزا کے درمیان ایک ٹیلی فون بات چیت سنی۔ سید امجد علی کے بیٹے کی شادی سکندر مرزا کی بیٹی سے ہونا تھی۔ سید امجد علی نے انہیں شادی کی تاریخ مقرر کرنے کو کہا تو سکندر مرزا نے جواب دیا کہ اگلے چند دن وہ بہت مصروف ہیں۔ حالات معمول پر آئیں گے تو تاریخ مقرر ہو جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ امجد علی نے کہا کہ حالات معمول پر آنے میں خاصا وقت لگے گا تو سکندر مرزا نے اس کا جواب دیا: 'چند دنوں میں ایوب خان کو میں سیدھا کر دوں گا'۔

ایوب خان کے کراچی واپس آتے ہی انہیں مقبول رب کو ٹیلی فون پر سکندر مرزا کے حکم اور سید امجد علی سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کر دیا گیا۔ اگلے چند دن تک کافی تناؤ رہا لیکن 27، اکتوبر تک کوئی

کارروائی اس لئے نہ ہوئی کہ امریکی سیکریٹری دفاع نے پاکستان کی فوجی امداد کی ضروریات پر مذاکرات کے لئے آنا تھا۔ 27 اکتوبر کو اُن کے چلے جانے کے فوراً بعد یحییٰ خان اور اس کی ٹیم نے اپنے ایکشن پلان کے دوسرے حصے پر کارروائی شروع کر دی۔ ایوب خان نے رات 10 بجے کے قریب مجھے وزیر اعظم ہاؤس میں بلا کر کہا 'سکندر مرزا مجھے وزارت عظمٰی سے ہٹانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ایسی حرکت سے پیدا ہونے والی افراتفری سے بچنے کے لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے صدارت سے الگ کر دیا جائے'۔

اس وقت میجر جنرل برکی، میجر جنرل اعظم خان، میجر جنرل شیخ اور بریگیڈیئر ملک شیر بہادر وہاں وردی میں موجود تھے۔ ایوب خان نے مجھے کہا کہ میں سکندر مرزا سے استعفے پر دستخط کروانے کے لئے ان کے ساتھ جاؤں۔ سکندر مرزا کا آئین منسوخ کرنا اور ایوب خان کا اپنے اقتدار کو اور مضبوط کرنا، یہ دونوں اقدام مجھے سخت ناپسند تھے۔ اس لئے میں نے یہ فریضہ سرانجام دینے سے معذرت چاہی۔ متذکرہ چاروں جرنیل چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئے۔ ایوب خان کے چہرے پر اشتعال اور تناؤ موجود تھا۔ اُن کے آتے ہی انہوں نے پوچھا کیا ہوا؟ انہیں بتایا گیا کہ صدر چونکہ بیڈ روم میں جا چکے تھے، لہٰذا ان کے اے ڈی سی کو انہیں نیچے بلانے کے لئے کہا گیا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن میں نیچے آ رہے تھے کہ سیڑھیوں پر ہی اُن کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی صدر نے کہا کہ دستخط کے لئے کاغذ لائے ہو اور جونہی ان کے سامنے کاغذ پیش کیا گیا تو انہوں نے فوراً دستخط کر دیئے۔ یہ سننے کے فوراً بعد ایوب خان کا چہرہ یک دم پُرسکون ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ 'سکندر مرزا کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، انہیں کل علی الصبح کوئٹہ پہنچا دیا جائے'۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی کابینہ اور غیر ملکی سفیروں کی میٹنگ طلب کر لی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے تک سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ایوب خان نے انہیں اس نئے اقدام سے آگاہ کرتے ہوئے مختصراً اُن وجوہات کا بھی ذکر کیا جن کی وجہ سے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ امریکی سفیر اور آسٹریلوی ہائی کمشنر میجر جنرل کا تمارن کے علاوہ کسی نے بھی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ امریکی سفیر نے اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس نئے اقدام اور سکندر مرزا کی اقتدار سے علیحدگی کے بارے میں ایوب خان سے بڑے چبھتے ہوئے سوالات کیۓ۔ امریکی سفیر کے سوال کرنے کے انداز سے ایوب خان بہت ناخوش ہوئے، انہوں نے کہا کہ سکندر مرزا کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا اور انہیں علی الصبح چند دن کے لئے کوئٹہ پہنچایا جا رہا ہے۔ میجر جنرل کا تمارن جو برٹش انڈین آرمی اور بعد ازاں پاکستان آرمی میں رہ چکے تھے وہ سکندر مرزا کے ذاتی دوست تھے، انہوں نے سکندر مرزا کی حفاظت کے بارے میں بھرپور تشویش کا اظہار کیا۔

ایوب خان کے اس اقدام پر امریکی سفیر کا ردِ عمل یہ ظاہر کرتا تھا کہ امریکہ کو اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ سکندر مرزا اور ایوب خان کے امریکہ اور برطانیہ کی طرف واضح جھکاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے میری یہ

رائے ہے کہ 17 اکتوبر کی بغاوت اگر ان دونوں کے ایماء پر نہیں تو ان کے علم کے بغیر بھی نہیں ہوئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں حکومتوں کو ایوب خان کی کارروائی کا پہلے سے کوئی علم نہ تھا۔"[3]

صدر سکندر مرزا نے جون 1958ء میں ایوب خان کو مدت ملازمت میں توسیع دی تھی اور ایوب نے سکندر مرزا کو وفاداری کا یقین دلایا تھا مگر اقتدار کا نشہ بڑا بے وفا ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں 17 اکتوبر 1958 کی رات جمہوریت اور سیاست کے لئے انتہائی بدقسمت رات تھی۔ اس رات کا احوال ایک اور چشم دید گواہ سے سنیئے۔

17 اکتوبر کی رات ایوانِ صدر میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل م ب خالد اپنی کتاب "ایوان صدر میں سولہ سال" میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

شام پانچ بجے میں دفتر میں تھا میرے علاوہ سکندر مرزا کا پرسنل سیکریٹری نصرت (این ڈی احمد) بھی تھا۔ ہم دونوں ساڑھے چھ بجے تک چائے پیتے اور گپیں مارتے رہے۔ تاریکیاں پھیلنے کو تھیں کہ میجر جنرل شیر بہادر کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ جائنٹ چیفس سیکریٹریٹ کے سربراہ تھے۔ چھوٹے قد کے آدمی تھے، مونچھوں کو بڑھا کر شخصیت کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رکھی تھی۔ ہم دونوں سے ٹائپ کی مشینیں درست کروائیں۔ بریف کیس میں سے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو کاغذ نکالے ایک مجھے تھمایا دوسرا نصرت کو۔ ٹائپ رائٹر کھٹ کھٹ چلنے شروع ہوگئے۔ میرے حصے میں آنے والے کاغذ کا عنوان تھا Proclamation۔ دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ پاکستان کا دستور منسوخ، قومی و صوبائی اسمبلیاں برخاست، کیبنٹ ڈس مس، صوبائی حکومتیں ختم۔

ایک کے بعد دوسرا کاغذ مارشل لاء کا نفاذ، جنرل محمد ایوب خان کا بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر تقرر، صوبوں میں ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کی تقرریاں۔

تیسرا کاغذ غیر ملکی سربراہان مملکت کے نام خصوصی پیغام۔

چوتھا کاغذ غیر ملکوں میں پاکستانی سفیروں کے نام خصوصی ہدایات۔

رات کے نو بج چکے تھے میں نے سوچا گھر میں بیگم کو ٹیلی فون کر دوں کہ مصروف ہوں اور دیر سے آؤں گا۔ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے کو تھا کہ جنرل شیر بہادر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ پانی کی طلب ہوئی تو جنرل صاحب خود اٹھے۔ کاغذ ختم ہوئے یا کاربن پیپر خراب ہوئے تو جنرل صاحب نے سب کچھ اپنے بریف کیس سے نکال کر دیا۔ بریف کیس میں ہر قسم کی سٹیشنری موجود تھی۔ منصوبہ ہو تو ایسا ہو۔ باہر ٹیرس پر سکندر مرزا ہونٹوں میں سگریٹ دبائے تیز تیز قدموں سے ٹہل رہے تھے۔ خدمت گار حسب

[3] ایئر مارشل (ر) اصغر خان "جرنیل اور سیاست" صفحہ 14 تا 17

نوٹ: میجر جنرل فضل مقیم نے اپنی کتاب "The Story of Pakistan Army" صفحہ 202 پر تحریر کیا ہے کہ سکندر مرزا نے 21 اکتوبر 1958ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان کے سٹاف کے جنرل آفیسرز کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔

معمول ٹرے میں وہسکی سوڈا لایا۔ سکندر مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ساڑھے نو بجے ہمارے ٹائپ رائٹر خاموش ہوگئے۔ ہم دونوں کو جنرل شیر بہادر اپنی نگرانی میں ملٹری سیکریٹری بریگیڈیئر نوازش علی کے کمرے میں لئے گئے۔ جو بالکل دوسرے کونے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد سکندر مرزا بھی وہیں تشریف لے آئے۔ ٹھیک دس بجے رات جنرل محمد ایوب خان تشریف لے آئے۔ ان کے ہمراہ لیفٹیننٹ جنرل ڈبلیو اے برکی اور لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان بھی تھے۔ سکندر مرزا کو سلیوٹ کے بعد جنرل ایوب خان گویا ہوئے۔ Everything Ok Sir operation complete. ہاتھ ملائے گئے، قہقہے بلند ہوئے۔ سکندر مرزا نے اشارہ کیا چار پانچ خدمت گار ٹرے میں وہسکی سوڈا کے چھلکتے ہوئے گلاس سجائے ایک ساتھ داخل ہوئے۔ کمرے میں آب نوش صرف میں اور نصرت تھے ہمارے لئے جوس کے گلاس آ گئے۔

سکندر مرزا چسکیاں لیتے لیتے یک دم سنجیدہ ہوگئے۔ ایوب خان کا بازو پکڑا اور کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا "Ayub will I be alive tomorrow." ایوب خان نے مسکرا کر سکندر مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا، زبان سے کچھ نہ کہا۔

جنرل ایوب نے مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے اپنے پاس رکھے اور تینوں سروسز چیفس کو ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نامزد کر دیا اور صدارتی کابینہ تشکیل دے کر ایک سول روپ بھی دھار لیا۔[4]

ایوب خان کی آئینی اور قانونی حیثیت کا مسئلہ دوسو (Dosso) کے مقدمے میں سپریم کورٹ کے سامنے زیر بحث آیا اور سپریم کورٹ نے فیصلہ حکومت وقت کے حق میں دے دیا اور سہارا کیلسن (Kelsen) کے نظریہ ضرورت کا لیا۔

ہماری آئینی بنیادوں کو جس قدر نقصان اس نظریے نے پہنچایا شاید ہی تمیز الدین کیس کے فیصلے نے پہنچایا ہو۔ جج صاحبان کا فرض تھا کہ وہ اپنے حلف کے مطابق آئین کی حفاظت اور پاسداری کرتے مگر انہوں نے ایک ایسے نظریہ کو اہمیت دی جو مفروضوں پر مبنی تھا۔[5]

عائشہ جلال نے پہلے مارشل لا کی وجوہات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"It was the interplay of domestic, regional and international factors during the late forties and fifties — in particular, the links forged with the USA — that served to erode the position of parties and politicians within the evolving structure of the Pakistani state by tipping the institutional balance towards the civil bureaucracy and the military.

The dominance of the non-elected institutions was a result of

[4] مرتضیٰ انجم "پاکستان میں فوجی حکومتیں" صفحہ 51,50

[5] جسٹس (ر) صمدانی "جائزہ" صفحہ 43

a concerted strategy by the higher echelons of the bureaucracy and the military to exploit rivalries among Pakistani politicians and systematically weaken the political process by manipulating their connections with the centres of the international system in London and Washington. In the final analysis the responsibility for Pakistan's inability to work a parliamentary system of government must be shared by its civil bureaucrats, military officials, chief justices and politicians, both secular and religious." ❻

ترجمہ: ''یہ اندرونی، علاقائی اور بین الاقوامی اسباب کا باہمی عمل تھا کہ چالیس اور پچاس کی دہائی میں خصوصی طور پر امریکہ سے تعلقات استوار کیے گئے جن کی وجہ سے سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کی حیثیت متاثر ہوئی۔ جبکہ پاکستان کی ریاست ارتقائی حالت میں تھی چنانچہ توازن سول بیورو کریسی اور فوج کے حق میں ہوگیا۔
غیر جمہوری اداروں کی بالادستی اعلیٰ سول بیوروکریسی اور فوج کی متفقہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ جس کے پیش نظر سیاست دانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھایا گیا اور ان قوتوں نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت لندن اور واشنگٹن میں بین الاقوامی نظام کے مراکز سے اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کر کے پاکستان میں سیاسی نظام کو کمزور کیا۔ آخری تجزیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں پارلیمانی نظام حکومت کی ناکامی کی ذمہ داری سول بیوروکریٹس، فوجی آفیسروں، چیف جسٹس اور سیکولر و مذہبی سیاست دانوں سب پر عائد ہوتی ہے۔'' ❻

عائشہ جلال کا تجزیہ درست ہے۔ سیاست دانوں کو بری الذمہ قرار دینا ممکن نہیں۔ البتہ پاکستان کی طاقت ور سول وملٹری بیوروکریسی جس کے پاس سرمایہ اور اسلحہ کی طاقت تھی سیاست میں مداخلت نہ کرتی اور اقتدار سے دور رہتی تو پاکستان میں پارلیمانی نظام حکومت مشکلات کا شکار نہ ہوتا۔ قائداعظم نے سول اور ملٹری بیوروکریسی کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ سیاست اور حکومت سے دور رہے مگر بیوروکریسی نے قائد کے ارشادات پر عمل نہ کیا اور ان کی وفات کے بعد سیاست میں مداخلت شروع کر دی۔

فوج کے سینئر آفیسر بھی جنرل ایوب خان کی ذاتی خواہشات پر شاکی تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن لکھتے ہیں:۔

"Even some of his senior generals were of the opinion that their commander-in-chief despite having attained the highest possible post in the army enamoured limitless ambitions and all out for himself in most matters." ❼

❻ عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia صفحہ 54

ترجمہ: ''یہاں تک کہ اس کے کچھ سینئر جرنیلوں کی یہ رائے تھی کہ ان کا کمانڈران چیف فوج کا اعلیٰ ترین منصب حاصل کرنے کے باوجود لامحدود خواہشات کا اسیر ہے اور اکثر معاملات میں اپنا ذاتی مفاد پیش نظر رکھتا ہے'' ❼

بھارت کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے ایوب خان کے اقتدار کو ننگی فوجی آمریت (naked military dictatorship) قرار دیا۔ مگر دو سال بعد نہرو پاکستان کے دورے پر آئے اور انڈس واٹر معاہدے پر دستخط کیے۔ ❽

پبلک ریکارڈ آفس لندن کے مطابق سر گلبرٹ لیتھویٹ (Sir Gilbert Laithwaiate) نے 28 اکتوبر 1958 کو برطانوی ہائی کمشن کراچی سے ایک نوٹ ارسال کیا جس میں جنرل ایوب کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیا۔

"I Would not put him in the highest intellectual class by any means. He was according to our record a failure as a commanding officer (Lieutenant-colonel) on active service and had to be relieved. But in senior posts in Pakistan, since that Country obtained its independence, he has built himself up a very considerable position, both with the Army and in the Country. He is a vigorous personality with the reputation of getting things done." ❾

ترجمہ: ''میں کسی صورت اسے (ایوب) اعلیٰ سطح کی ذہین کلاس میں شامل نہیں کروں گا۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق وہ (ایوب) کمانڈنگ آفیسر (لیفٹیننٹ کرنل) کی حیثیت میں ایکٹو سروس کے دوران ناکام ہوا اور اسے اس پوزیشن سے فارغ کر دیا گیا۔ جب سے پاکستان نے آزادی حاصل کی ہے اس نے سینئر پوزیشن میں رہ کر فوج اور ملک میں قابل ذکر حیثیت حاصل کر لی ہے۔ وہ ایک پرجوش شخص ہے اور اس کی شہرت یہ ہے کہ وہ کام لینا جانتا ہے۔'' ❾

1958ء میں راقم میٹرک کا طالب علم تھا۔ اس وقت کا سیاسی منظر نامہ ذہن میں محفوظ ہے۔ جنرل ایوب خان کی شخصیت پرکشش تھی۔ پاکستان کے عوام عمومی طور پر اور پنجاب کے عوام خصوصی طور پر ہیرو پرست ہیں۔ جاذب نظر شخصیت سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔ جنرل ایوب خان کی شخصیت لوگوں کے دلوں میں اُتر گئی تھی۔ وہ سیاست دانوں کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھے اور فوجی سپہ سالار سے توقعات وابستہ

❼ لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن "Back to The Pavilion" صفحہ 125
❽ کلدیپ نیئر "Wall at Wahga"
❾ روئیداد خان "The British Papers" صفحہ 47

کیۓ ہوئے تھے۔ جنرل ایوب خان نے اپنے امیج کو محفوظ رکھا ہوا تھا۔ ان کے خلاف کوئی سکینڈل نہ تھا۔ وہ محلاتی سازشوں میں پوری طرح ملوث تھے مگر کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ لوگوں نے انہیں نجات دہندہ سمجھ لیا۔ پاکستان کے دانشوروں اور صحافیوں کا خیال یہ تھا کہ فوج جمہوری اداروں کو مستحکم کرے گی، سماجی تبدیلی لائے گی اور معیشت کو مضبوط بنائے گی۔ ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد انقلابی نوعیت کے ایسے اقدامات اُٹھائے جن سے عوام کے دلوں میں فوج کے بارے میں محبت اور عقیدت کے جذبات پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ جب انہوں نے ذاتی اقتدار کو مستحکم کرنا شروع کیا تو عوام کو محسوس ہونے لگا کہ جنرل ایوب خان ہوس اقتدار میں مبتلا تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایسی شہادتیں سامنے آئیں جن سے ثابت ہوا کہ آرمی چیف کا منصب سنبھالنے کے بعد ہی انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ جنرل ایوب خان نے سیاسی نظام کا منصوبہ 1954ء میں تیار کر لیا تھا جسے انہوں نے 1960ء تک خفیہ رکھا۔ یہ منصوبہ مضبوط مرکز، صوبائی خود مختاری کے خاتمے، کنٹرولڈ ڈیموکریسی، بے اختیار کابینہ، ربڑ سٹیمپ پارلیمنٹ اور پاورفل صدر پر مشتمل تھا۔ اس منصوبے کو ایوب کا لندن پلان بھی کہا جاتا ہے۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے امریکہ کی آشیرباد سے پہلے سیاست دانوں کو تقسیم اور کمزور کیا اور انہیں عوام میں بدنام بھی کیا۔ جب سیاست دان عوامی سطح پر مقبولیت کھو بیٹھے تو فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جنرل ایوب خان نے اپنے پہلے نشری خطاب میں سیاست دانوں کے بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کیۓ اور کہا:۔

> "A word for the disruptionists, political opportunists, smugglers, black marketeers, and other such social vermin, sharks, and leeches. The soldiers and the people are sick of the sight of you. So it will be good for yourself to turn a new leaf and begin to behave, ctherwise retribution will be swift and sure." [9]

ترجمہ: ”کچھ الفاظ انتشار پھیلانے والوں، سیاسی موقع پرستوں، سمگلروں، چور بازاری کرنے والوں اور دوسرے سماجی موذی کیڑوں، شارک ، اور جونکوں کے لیے۔ فوج اور عوام آپ کی شکل سے بے زار ہیں۔ اب یہ آپ کے اپنے مفاد میں ہے کہ نئے دور کا آغاز کریں اور اپنے انداز بدلیں وگرنہ انتقام یقینی اور فوری ہوگا۔ [9]

جنرل ایوب خان نے 1958ء میں جو الفاظ سیاست دانوں کے بارے میں استعمال کیۓ آج عوام کم و بیش وہی الفاظ فوج کے جرنیلوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔ جنرل ایوب خان اگر اچھی جمہوریت اور صاف ستھری سیاست کے قائل ہوتے تو وہ اقتدار سنبھالنے کے بعد سیاست دانوں اور سول و ملٹری بیوروکریٹس کا کڑا اور غیر جانب دارانہ احتساب کرنے کے بعد ملک میں صاف اور شفاف انتخابات کراتے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیتے تو پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی مگر انہوں نے

[9] جنرل ایوب خان کا خطاب 18 اکتوبر 1958

عوام پر حکومت کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا جو ان کی تربیت اور مزاج کے خلاف تھا اور جس کی بناء پر فوج پوری طرح سیاست میں ملوث ہوگئی اور اس کی پیشہ وارانہ صلاحیتیں متاثر ہوئیں۔ پاکستان کے پہلے مارشل لا اور طویل فوجی اقتدار نے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے دلوں میں نفرت اور محرومی کے جذبات پیدا کیۓ اور اس کا نتیجہ سقوط ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آیا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان پاکستان کے صدر بن گئے۔ انہوں نے یہ منصب بندوق کے زور پر حاصل کیا جس کا کوئی اخلاقی اور آئینی جواز نہ تھا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس منیر نے 18 اکتوبر 1958ء کے مارشل لا کو جائز قرار دے دیا اور اپنے فیصلے میں تحریر کیا کہ کامیاب انقلاب اور کامیاب فوجی انقلاب (coup d'etat) کو بین الاقوامی سطح پر آئین کی تبدیلی کا قانونی طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد جو کابینہ تشکیل دی اس میں مشرقی پاکستان کو 25 فیصد نمائندگی دی حالانکہ مشرقی پاکستان کی آبادی 56 فیصد تھی۔ اس غیر دانشمندانہ اقدام سے بنگالیوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ ایوب خان نے پاپولر لیڈر حسین شہید سہروردی کو جیل میں ڈالا۔ وہ عوام میں مقبول لیڈروں کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد سول سروس کی مدد سے روایتی سیاست کو کمزور کرنے کے لیے دیہاتوں میں اپنے پسندیدہ بااثر افراد کی سرپرستی کی۔ 1959 میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا آرڈر جاری کیا جو جمہوریت کی روح کے برعکس تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دیہاتوں میں ایسے سیاست دانوں کا انتخاب کیا جائے جو ڈکٹیٹ کرنے یا مداخلت کرنے کی بجائے تسلیم اور قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایوب خان کے نئے سیاسی نظام میں لیبر اور دانشور طبقے کا کوئی رول نہیں تھا۔

صدر ایوب خان نے سیاست دانوں کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے ایبڈو (EBDO) (Elective Bodies Disqualification Order) کا قانون بنایا اور سہروردی، خان قیوم خان اور ایوب کھوڑو کو سیاست میں حصہ لینے سے نااہل قرار دے دیا۔ ایبڈو کے قانون کو سیاسی انتقام کے طور پر استعمال کیا گیا جس کا بنیادی مقصد قومی سطح کے سیاست دانوں کو عوام کی نظروں میں گرانا تھا۔

مغربی پاکستان کے جاگیردار اور تاجر مشرقی پاکستان کی اکثریت کے سامنے جونیئر پارٹنر بننے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انہوں نے آرمی اور بیوروکریسی سے اتحاد کر لیا تھا۔ آئین سازی اور انتخابات میں اس لیے تاخیر ہوتی رہی کہ فوج، جاگیردار اور تاجر ملکی اُمور پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتے تھے۔

صدر ایوب نے اخلاقی جواز حاصل کرنے کے لیے بی ڈی سسٹم کا نظام متعارف کرایا۔ ملک بھر میں اسی ہزار بی ڈی ممبران منتخب کیۓ گئے اور صدر ایوب نے 14 فروری 1960ء کو ایک ریفرنڈم کے ذریعے بی ڈی ممبران سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ ان کو 95.6 فیصد ووٹ ملے۔ جنرل ایوب خان اقتدار سنبھالنے کے سولہ ماہ بعد بھی اور سیاست دانوں کو نااہل قرار دینے کے باوجود براہ راست صدارتی انتخاب لڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔ صدر ایوب اگر واقعی پاپولر شخصیت ہوتے اور عوام سیاست دانوں سے بے زار ہوتے تو وہ

باضابطہ صدارتی انتخاب کا اعلان کرتے اور اپنے مقابل امیدوار کو عوامی سطح پر شکست دے کر صدارت کا منصب سنبھالتے مگر انہوں نے اپنے لیے محفوظ راستے کا انتخاب کیا اور ریاستی مشینری استعمال کر کے ''گاجر اور چھڑی'' کا اُصول اپنا کر ریفرنڈم کے ذریعے اسی ہزار بی ڈی ممبران سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنرل ایوب خان فوجی طاقت کے بل بوتے پر پاکستان کو تحریک پاکستان کی روح اور قائداعظم کے نظریۂ پاکستان سے بہت دور لے گئے۔ ان کی وجہ سے فوج سیاست، معیشت، تجارت اور صنعت میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ فوج کو اقتدار میں رہنے اور سول حکومتوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کی عادت پڑ گئی جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ سول اور ملٹری بیورو کریٹس سیاست میں ملوث ہو کر پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض نہ ہو جائیں۔ جنرل ایوب خان نے قائد کے اس خدشے کو سچ ثابت کر دکھایا۔ پہلے انہوں نے وزیر دفاع کی حیثیت سے کابینہ میں شمولیت اختیار کر کے اقتدار کو بالواسطہ کنٹرول کیا اور بعد میں موقع ملتے ہی اقتدار پر براہ راست قابض ہو گئے۔ جنرل ایوب خان برطانوی فوج کے تربیت یافتہ تھے۔ جب برصغیر کی آزادی کے بعد انگریز رخصت ہو گئے تو جنرل ایوب خان اور ان کے رفقاء فوجی آفیسروں کے ذہنوں میں یہ بات سما گئی کہ انگریز حکمرانوں کی اصل وارث فوج ہے اور فوج ہی پاکستان کی سلامتی اور خوشحالی کی ضامن ہے۔ جنرل ایوب نے اپنے دس سالہ اقتدار کے دوران عملی اور فکری طور پر فوج کی جو تربیت کی اور فوج کا جس قسم کا اندرونی ڈھانچہ تشکیل دیا پاکستان کی فوج آج بھی انہیں روایات کی پابند ہے۔ فوج کے افسر اپنے آپ کو اعلیٰ اور برتر نسل تصور کرتے ہیں۔ اُن کا مزاج اور فطرت بدستور آمرانہ اور غیر جمہوری ہے۔ سٹیفن کوہن لکھتے ہیں: ''سیاسی خلا کے نظریے کی ایک اور شکل وسیع بین الاقوامی تجربے کے حامل ایک سینئر سابق لیفٹیننٹ جنرل نے پیش کی۔ پنجاب کا بقیہ جنوبی ایشیا سے موازنہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس خطے میں ہمیشہ 'عظیم سپاہی' پیدا ہوئے لیکن کبھی 'عظیم سیاست دان'' پیدا نہیں ہوئے۔

پاکستان میں سپاہیوں کے طبقے کی اعلیٰ حیثیت ہے۔ بڑھئی کے پیشے اور سیاست جیسے شعبے کو زیادہ باعزت نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا جزوی سبب انگریزوں کی غلطی تھی۔ انہوں نے 1857ء کی بغاوت کے بعد ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی۔ مسلمانوں کی نہیں کی اور ہمارے ملاؤں نے ہمیں انگریزی پڑھنے سے باز رکھا۔ ہمارے اذہان میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمیں جمہوریت سے دور رکھتی ہے۔ حزب اختلاف کا تصور اسلام کے لیے اجنبی ہے''۔ [10]

صدر ایوب نے سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ پارلیمانی نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ سیاست دانوں کو بدنام کرنے کے لیے ساٹھ ہزار سیاست دانوں کو ایبڈو کے تحت نااہل

[10] سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 121

قرار دے دیا جن میں سے تیس ہزار کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈر جاری کر کے آزادی صحافت کو سلب کر لیا۔ فیڈرل نظام حکومت کی بجائے واحدانی نظام متعارف کرایا۔ مارشل لا کا ہتھکنڈہ استعمال کر کے کرپشن اور نااہلی کے الزام میں 1300 سول سرونٹس کو ملازمتوں سے فارغ کر دیا۔ دفاع کے اخراجات اس قدر بڑھا دیئے کہ قوم کے وسائل ان کے متحمل نہ تھے۔

17 فروری 1960ء کو صدر جنرل ایوب خان نے پاکستان کے سابق چیف جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن تشکیل دیا جس کا مقصد پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کے اسباب تلاش کرنا اور ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کرنے کے لیے آئینی تجاویز تیار کرنا تھا۔ اس کمیشن نے پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کے تین بڑے اسباب بیان کیے۔

1- 1956ء کے آئین میں انتخاب کے لیے مناسب طریقہ کار وضع نہیں کیا گیا تھا اور اس آئین میں بڑے سقم تھے۔
2- ریاست کے سربراہ نے وزارتوں اور سیاسی جماعتوں میں غیر ضروری مداخلت کی اور مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دے کر ان کو کام نہ کرنے دیا۔
3- منظم اور فعال سیاسی جماعتوں کی کمی اور عام طور پر سیاست دانوں کے کردار کی کمزوری کی وجہ سے جمہوریت پروان نہ چڑھ سکی۔ [11]

1960 میں پاکستان کا دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کا بڑا مقصد جی ایچ کیو راولپنڈی پر نظر رکھنا تھا۔

جنرل ایوب خان نے 1962ء میں قوم کو نیا آئین دیا جو صدارتی نوعیت کا تھا۔ جس کے مطابق طاقت کا مرکز خود صدر ایوب کی ذات تھی۔ پارلیمانی جمہوریت میں یقین رکھنے والے افراد نے 1962ء کے آئین کی مخالفت کی۔ پاکستان کے معروف عوامی شاعر حبیب جالب نے اس دستور پر ایک نظم لکھی جو زبان زد عام ہو گئی۔ اس نظم میں حبیب جالب نے جنرل ایوب خان کے دستور کو ''صبح بے نور'' قرار دیا۔

ایوب خان نے آئین میں نائب صدر کا منصب رکھنے کی اجازت نہ دی تا کہ کوئی بنگالی اس عہدے پر فائز نہ ہو سکے۔ ایوب خان نے الطاف گوہر سے کہا ''میں نے بنگالیوں کو دوسرا کیپیٹل دے دیا ہے۔ ایک دن ان کو ضرورت ہو گی۔ آخر میں ایوب خان نے سوچ لیا کہ مشرقی پاکستان کو جانے دو۔ [12]

1962ء کے آئین کے نفاذ کے بعد سیاسی جماعتیں بحال کر کے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ جنرل ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ قائم کر لی جسے ''کنگز پارٹی'' کا نام دیا گیا۔ حکومت کے مخالفین نے اپنی جماعت کا نام کونسل مسلم لیگ رکھ لیا۔ سات سال اقتدار میں رہنے کے بعد جنرل ایوب خان نے صدارتی انتخاب کرانے کا اعلان کیا۔ فوجی جرنیل کو براہ راست عوام کے پاس جانے کی جرأت نہیں

[11] حامد خان "Constitutional and Political History of Pakistan" صفحہ 225

[12] الطاف گوہر ''ایوب خان پہلا فوجی حکمران'' صفحہ 485,411

ہوئی اور اس نے اسی ہزار بی ڈی ممبران کو صدارتی انتخاب کے لیے الیکٹورل کالج قرار دے دیا۔

اپوزیشن کو علم تھا کہ صدر ایوب صدارتی انتخاب میں ریاستی مشینری کو استعمال کریں گے۔ ان خدشات کے باوجود متحدہ اپوزیشن نے محترمہ فاطمہ جناح کو صدر ایوب کے مقابلے میں اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ صدر ایوب بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے اور انہوں نے ذاتی اقتدار کی خاطر انتخابات میں کھلم کھلا دھاندلی کی۔ ریاستی مشینری، پرمٹوں، لائسنسوں اور قومی دولت کا بے دریغ استعمال ہوا اور دھاندلی دھونس اور دھن کا سہارا لے کر آمر ایک جمہوری خاتون مادرِ ملت کے مقابلے میں صدارتی انتخاب جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایوب خان نے مغربی پاکستان میں 73.56 فیصد اور مشرقی پاکستان میں 53.12 فیصد ووٹ حاصل کیے۔ فاطمہ جناح نے مغربی پاکستان میں 26.07 فیصد اور مشرقی پاکستان میں 46.60 فیصد ووٹ لیے۔

جنرل ایوب کو اگر ملک، جمہوریت اور عوام کا ذرہ بھر خیال ہوتا تو وہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے سیاسی میدان میں اُترنے کے بعد دھاندلی کا خیال دل سے نکال دیتے اور صاف شفاف انتخاب ہونے دیتے۔ محترمہ فاطمہ جناح اگر ملک کی صدر منتخب ہو جاتیں تو پاکستان جمہوریت کی پٹڑی پر چڑھ جاتا اور ملک دولخت نہ ہوتا۔

جنرل ایوب نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہ لیا تھا اور نہ ہی کسی جنگ کی منصوبہ بندی اور نگرانی کے فرائض انجام دیئے تھے مگر وہ فیلڈ مارشل بن گئے۔ 1965 کی جنگ کے دوران ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

صدر جنرل ایوب نے 1965ء میں ''آپریشن جبرالٹر'' کے نام سے مقبوضہ کشمیر میں گوریلا فورس داخل کر دی۔ اس آپریشن کا بڑا مقصد بھارت پر عسکری دباؤ ڈال کر اسے کشمیر کے حل کے سلسلے میں مذاکرات پر مجبور کرنا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ بھٹو نے صدر ایوب کو ایک رپورٹ پیش کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ بھارت کشمیر کو انڈین یونین کا حصہ بنانے کے لیے منصوبہ بندی کر رہا ہے لہٰذا اسے اس منصوبے سے باز رکھنے کے لیے عسکری حکمت عملی بنائی جائے۔ فوج کے جرنیلوں نے اس اطلاع کے بعد ''آپریشن جبرالٹر'' کا عسکری منصوبہ تشکیل دیا۔ پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے 29 اگست 1965ء کو کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ خان کے نام ایک ڈائریکٹو نمبر 4050/5/MO-I جاری کیا اور ''آپریشن جبرالٹر'' اور ''آپریشن گرینڈ سلام'' کی منظوری دی۔ دوسرے فیصلہ سازوں میں جنرل موسیٰ خان کے علاوہ چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل ملک شیر بہادر، ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز میجر جنرل صاحب زادہ یعقوب خان، کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا شامل تھے۔ جنرل ایوب خان کے فرزند گوہر ایوب نے ایک ٹی وی چینل اے آر وائی کو انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ 1965ء کی جنگ کے دوران پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے بھارت کے ایک بریگیڈیئر سے جنگی حکمت عملی کا پلان صرف بیس ہزار روپے میں خرید لیا تھا۔ لاہور کے سینئر شہری گواہ ہیں کہ بھارت کی افواج کسی رکاوٹ کے بغیر برکی تک پہنچ گئی تھیں۔ اگر بھارتی افواج کے راستے

میں بی آر بی کی نہر حائل نہ ہوتی اور انہیں گھیرے میں آنے کا خوف نہ ہوتا اور میجر عزیز بھٹی اور دوسرے دلیر جوان اپنی جانیں نثار کر کے لاہور کا دفاع نہ کرتے تو بھارتی افواج لاہور پر قابض ہو جاتیں۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں جو سیاست اور حکومت میں پوری طرح ملوث ہو چکی تھیں بھارتی افواج کی نقل و حرکت سے بے خبر رہیں۔ گوہر ایوب کا انکشاف 1965 کی جنگ کے معروضی حقائق کے برعکس ہے۔ 1965ء کی جنگ میں پاکستان کے عوام نے مثالی جذبے کا مظاہرہ کیا اور پاک فوج سے ہر قسم کا تعاون کیا۔ پاکستان کی فضائیہ جو ایک محب الوطن اور پروفیشنل سولجر ایئر مارشل نور خاں کی سربراہی میں کام کر رہی تھی اس کی مثالی کارکردگی نے 1965ء کی جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ جب بھارت کی افواج نے پاکستان پر حملہ کیا صدر ایوب خان اس دن سوات میں گالف کھیل رہے تھے۔ آپریشن جبرالٹر کی ناکامی کے بعد فوج کے جرنیلوں نے اس کی ذمہ داری سیاست دان بھٹو پر ڈالنے کی کوشش کی۔ افواج کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ جب کوئی معرکہ جیت لیں تو اس کا سہرا اپنے سر لیتی ہیں اور شکست کی صورت میں ذمے داری حالات ،سیاست دانوں اور بیرونی عوامل پر ڈال دیتی ہیں۔ پاکستان میں عوامی سطح پر یہ تاثر پھیلایا گیا کہ جنگ میں پاکستان کو ہر محاذ پر برتری حاصل رہی۔ تاشقند کے معاہدے کے بعد ہی عوام اصل حقائق سے باخبر ہوئے۔

صدر ایوب خان نے معاہدہ تاشقند کرتے وقت کشمیر کو نظر انداز کر دیا۔ 1965ء کی جنگ نے ایوب کی حکومت اور پاکستان کی معیشت کو ہلا کر رکھ دیا۔ پاکستانی فوج کی خامیاں منظر پر آئیں۔ فوج کو کمانڈ اینڈ کنٹرول، انٹیلی جنس، کمیونیکیشن اور کوآرڈی نیشن نیز ہر شعبے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فوج نے اقتدار تو سنبھال لیا مگر جب وطن کو دشمن نے للکارا تو فوج پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا عمدہ نمونہ پیش نہ کر سکی۔

سٹیفن کوہن اپنی تصنیف ''پاکستان آرمی'' میں رقمطراز ہیں۔ ''تعلقات عامہ کے ایک سینئر اہل کار نے ایوب اور یحییٰ دونوں کے ادوار کے بارے میں لکھا ہے۔ (اقتدار پر) قبضے کے بعد امیج بنانے کا عمل بہت کھل کر اور شدت سے شروع ہو جاتا اور وہ ہر طریقے سے ممکن ہو تو رضا مند کر کے ورنہ جبر کے ذریعے اس کی تسکین کرنا چاہتے ہیں۔ ایوب دور کے آخر میں تعلقات عامہ نے ایوب کے خیالات اور سنجیدہ فیصلے کرنے کی صلاحیت کو متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی من پسند تشہیر اور اس کی ہر سیاہ کو سفید دکھانے کی زبردست صلاحیت کی کشش کے بری طرح عادی ہو گئے تھے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں برسوں تک مسلح افواج سول اُمور چلاتی ہیں ان پر تعریفی تشہیر کا اثر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اس کا اثر اس قدر گہرا ہوا ہے کہ ان کے پیشہ وارانہ رویے اور معیار بدل گئے ہیں اور ان کے اندر بدقسمتی سے یہ یقین پیدا ہوا ہے کہ مسلح افواج کوئی غلطی نہیں کر سکتیں۔'' [13]

صدر جنرل ایوب خان نے 1951 میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے افواج پاکستان کا چارج

[13] سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 71، 72

سنبھالا۔1958ء میں وہ پاکستان کے صدر بھی بن گئے۔قومی دولت کا70 فیصد حصہ فوج پر خرچ کیا گیا۔ فوج نے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے بھی کیے مگر جب1965ء میں بھارت سے جنگ کا موقع آیا تو افواج پاکستان ایک ادارے کے طور پر اپنی بہترین پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کرسکیں اور پاکستان کو اس جنگ میں ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔امریکہ جس کے ساتھ جرنیلوں نے قربت کے رشتے استوار کیے تھے اس نے پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدوں کے باوجود مشکل کی گھڑی میں کوئی تعاون نہ کیا۔یہاں تک کہ جنگ کے دوران پاکستان کو فاضل پرزے دینے سے بھی انکار کردیا بلکہ پاکستان پر معاشی اور دفاعی پابندیاں عائد کردیں۔1965ء کی جنگ کے بعد یہ ثابت ہوا کہ افواج پاکستان سیاست اور حکومت میں ملوث ہونے کی وجہ سے اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو معیاری نہ بناسکیں اور فوج کے جرنیلوں کے امریکہ کے ساتھ روابط ان کے اپنے اقتدار کے لیے تھے اور ان روابط میں حب الوطنی کا جذبہ پہلا عامل نہ تھا۔عوامی سطح پر1965ء کی جنگ میں پاکستان کی کامیابی کے بارے میں تاثر پیدا کیا گیا مگر جب تاشقند میں ایوب خان نے کشمیر کو نظرانداز کرکے معاہدہ کی شرائط تسلیم کرلیں تو پاکستان کی کمزوری کا راز کھلا۔

1965 کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے محسوس کیا کہ افواج پاکستان اِن کا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہیں۔اس کمزوری کے پیشِ نظر شیخ مجیب نے1966ء میں چھ نکات پیش کردیئے جو بعد میں سقوط مشرقی پاکستان کا سبب بنے۔صدر ایوب نے جو سیاسی و معاشی نظام روشناس کرایا اس کے نتیجے میں بنگالی احساس محرومی کا شکار ہوگئے۔1966ء میں114,302 سول سرونٹس میں سے صرف27،648 کا تعلق بنگال سے تھا۔حالانکہ بنگال سب صوبوں سے زیادہ زرمبادلہ کماتا تھا۔مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی بھی بنگال سے 61 فیصد زیادہ تھی۔ [14]

صدر ایوب نے اپنے دور میں پاک فوج کو عملی اور فکری طور پر امریکہ کی فوج بنادیا پھر اس کے بعد امریکہ نے اپنی خواہش اور مفاد کے مطابق پاک فوج سے کام لیا۔صدر ایوب نے امریکی میل کی وجہ سے فوج کے سٹرکچر کو تبدیل کردیا۔امریکن اسلحہ سے لیس ایک آرمرڈ ڈویژن اور چار انفنٹری ڈویژن تیار کیے گئے۔امریکن ٹریننگ اور تکنیک کے ساتھ ساتھ امریکن نظریہ بھی فوجی تعلیم کا حصہ بنا۔ [15]

صدر ایوب کے دور میں صنعتی ترقی ہوئی۔معیشت مستحکم ہوئی، پانی ذخیرہ کرنے اور بجلی پیدا کرنے کے لیے بڑے ڈیم منگلا اور تربیلا تعمیر کیے گئے۔زرعی اصلاحات ہوئیں۔خاندانی منصوبہ بندی کا نظام روشناس کرایا گیا۔صدر ایوب کے اقتدار میں پیداوار پر زیادہ زور دیا گیا اور ڈسٹری بیوشن کو نظرانداز کیا گیا۔ارتکاز زر کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود صدر ایوب کے اپنے چیف اکانومسٹ پلاننگ میشن ڈاکٹر محبوب الحق کے مطابق پاکستان کے 22 خاندان ملک کی 66 فیصد صنعت، 79 فیصد انشورنس بزنس اور 80 فیصد بینکوں پر قابض ہوگئے۔ [16]

---

[14] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 136

[15] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 102

[16] ہارون الرشید "The Ayub Regime and the Alienation of East Bengal" صفحہ 181

دولت اور سرمایے کے ارتکاز کی وجہ سے استحصال کی بدترین صورتیں پیدا ہوئیں۔امیر اور غریب میں فرق ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیا۔ایوب خان کے سیاسی اور معاشی نظام میں مزدور اور کسان کا کوئی حصہ نہ تھا۔انہوں نے اپنی سپورٹ کے لیے دیہات کے متوسط زمینداروں کی سرپرستی کی۔بائیس صنعتی، تجارتی اور جاگیردار خاندان، پندرہ ہزار سینئر سول سرونٹس اور پانچ سو اعلیٰ ملٹری افسر ایوب خان کی اصل طاقت تھے۔قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لیے نہیں بلکہ غریب عوام کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔صدر ایوب کی سرپرستی کی وجہ سے سرمایہ دار اور جاگیردار پاکستان پر قابض ہوگئے۔عائشہ جلال لکھتی ہیں:۔

> "This brand of socio-economic engineering was not simply a highly controlled method of institution building as some Western observers were mistakenly led to believe. It depended on a closed personalised network involving some 15,000 senior civil servants, 500 or so top military officers, less than two dozen wealthy urban families controlling the bulk of the industrial, banking and insurance assets of the country and, finally, a somewhat more sprawling bunch of basic democrats drawn mostly from among middle-sized landlords in the rural areas." [17]

ترجمہ: اس قسم کی سماجی معاشی انجینئرنگ صرف اداروں کی تشکیل میں ضرورت سے زیادہ کنٹرول کی بناء پر نہیں تھی جیسا کہ کچھ مغربی مبصرین نے غلط فہمی کی وجہ سے یقین کرلیا۔اس کا انحصار محدود ذاتی نیٹ ورک پر تھا۔جس میں15000 سول سرونٹس، 500 یا قدرے زیادہ فوجی افسروں اور دو درجن سے کم شہری امیر خاندانوں شامل تھے جو ملکی صنعت، بینکنگ اور انشورنس کے سرمایے کے بڑے حصے پر قابض تھے۔آخر میں بی ڈی ممبران جن میں سے زیادہ تر کا تعلق دیہاتوں کے متوسط درجے کے جاگیرداروں سے تھا ملک پر پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ [17]

صدر ایوب کی کابینہ کے نوجوان وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اپنی قوم پرست اور ترقی پسند پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ کو کھٹکنے لگے تھے۔معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب اور بھٹو کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔1967ء میں بھٹو نے نئی سیاسی جماعت پی پی پی قائم کرکے اپنے آپ کو متبادل قیادت کے طور پر عوام کے سامنے پیش کردیا۔

صدر ایوب نے سیاست دانوں کی گندگی اور ابتری کو درست کرنے کے وعدے پر اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔انہوں نے 1956ء کے آئین کو ناامیدی کی دستاویز قرار دیا اور عوام کے ''ذہنی معیار'' کے مطابق

---

[17] عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 58

کنٹرولڈ جمہوریت کا نظام دیا مگر جب وہ رخصت ہوئے تو ملک کی ابتری اور گندگی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ان کے دیئے گئے نظام کی ابتری کا اندازہ کیجئے کہ جب وہ اپنے اقتدار کا دس سالہ جشن منا رہے تھے تو ان کے خلاف ملک کے ہر حصے میں زبردست تحریک چلی۔ یہ تحریک خود رُو، عوامی اور دیسی تحریک تھی جس میں نوجوان، طلبہ، دانشور اور مزدور ہراول دستہ تھے۔ اس تحریک کے دوران عوام نے سول ملٹری بیورو کریسی اور جاگیرداروں کے خلاف کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

دس سالہ آمریت کے بعد پاکستان کے سیاست دانوں کو سول اور ملٹری بیورو کریسی سے اقتدار واپس لینے کا موقع ملا تھا۔ ایبڈو کے تحت نااہل ہونے والے سیاست دان انتقامی جذبے کے تحت اس تحریک میں شامل ہوئے۔ مذہبی عناصر فیملی لاز کی بناء پر ایوب خان سے نالاں تھے۔ گوہر ایوب اور ان کے سسر جنرل حبیب اللہ کی گندھارا انڈسٹری کی وجہ سے عوام ایوب خان سے ناراض تھے۔ ایوب خان نے ذاتی اور شخصی سیاسی نظام روشناس کرایا اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر توجہ نہ دی۔ پی ڈی ایم (پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ) کے نام سے اپوزیشن جماعتوں نے سیاسی اتحاد قائم کر لیا اور پارلیمانی جمہوریت کا مطالبہ کیا۔ تاشقند کے معاہدہ نے ایوب خان کو غیر مقبول بنا دیا۔ عوام میں یہ تاثر پھیلا کر جنرل ایوب نے میدان جنگ میں جیتی ہوئی بازی سیاست کی میز پر ہار دی اور کشمیر پر سودے بازی کر لی۔

صدر ایوب نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کے خلاف تحریک اس قدر شدت اختیار کر جائے گی کہ ان کو مستعفی ہونا پڑے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس فطری عوامی تحریک کو قیادت فراہم کی۔

صدر ایوب کے قریبی اور قابل اعتماد رفیق الطاف گوہر کے مطابق صدر ایوب نے 25 مارچ 1969ء کو کابینہ کے اجلاس میں کہا کہ وہ اقتدار بھٹو، اصغر خان، مجیب اور بھاشانی کے سپرد کر دیتے مگر ان میں سے ایک بھی اس قابل نہیں جو اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اُٹھ کر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مجھے شک ہے کہ کافی عرصہ تک ہمیں اچھا سیاست دان نہیں مل سکے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس فوج ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ جس طرح رہنا چاہتے ہیں انہیں رہنے دیں۔ ہمیں مغربی پاکستان کے مسائل حل کرنے چاہئیں۔ مشرقی پاکستان چند سال ساتھ رہے گا جبکہ مغربی پاکستان چلتا رہے گا۔ ●

ڈکٹیٹر زبردست عوامی تحریک کے باوجود عوام کی طاقت پر یقین نہ کر سکا۔ صدر ایوب نے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی علیحدگی کو دلی طور پر قبول کر لیا تھا۔ ایک فوجی جرنیل کی اس سوچ کو اس کے جانشین جنرل یحییٰ خان نے عملی تعبیر سے ہمکنار کر دیا۔

جنرل ایوب خان کو ہارٹ اٹیک ہوا اور حکومت پر ان کی اتھارٹی کمزور پڑ گئی۔ کرپشن اور اقربا پروری کی وجہ سے لوگ عاجز آ چکے تھے۔ 7 نومبر 1968ء کو راولپنڈی کے طلبہ لنڈی کوتل سے سامان لے کر آ رہے تھے کہ کسٹم حکام نے ان کا سامان چھین لیا اور ان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ طلبہ نے

● الطاف گوہر "ایوب خان پہلا فوجی حکمران" صفحہ 481

راولپنڈی میں احتجاجی جلوس نکالا پولیس کی فائرنگ سے ایک طالب علم ہلاک ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد احتجاجی ہنگامے پورے ملک میں پھیل گئے۔ پاکستان کی آٹھ سیاسی جماعتوں نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (DAC) کے نام سے نیا سیاسی اتحاد بنا کر تحریک میں جوش پیدا کیا۔ ● جنرل ایوب خان نے دباؤ میں آ کر گول میز کانفرنس طلب کی۔ بھٹو اور بھاشانی نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ مشرقی پاکستان میں تحریک نے زیادہ رنگ دکھایا۔ جنرل ایوب خان کی تدابیر کارگر نہ ہوئیں۔ جنرل یحییٰ خان نے صدر ایوب خان سے ملاقات کی اور کہا "ان کا کاروبار مملکت سے الگ ہونا ضروری نہیں وہ کچھ عرصہ کے لیے ایک طرف ہو جائیں فوج سیاست دانوں سے نبٹ لے گی۔ حالات بہتر ہوتے ہی وہ دوبارہ اُمور مملکت سنبھال لیں۔" ●

صدر ایوب اپنے کمانڈر انچیف کو خوب جانتے تھے۔ جنرل ایوب خان نے 25 مارچ 1969ء کو قوم سے خطاب میں مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور کہا ملک کے حالات انتہائی خراب ہو رہے ہیں۔ انتظامی ادارے فالج زدہ ہو گئے ہیں۔ عوام آزادی سے گھیراؤ کر رہے ہیں۔ ملک کے تمام مسائل گلیوں میں حل کیے جا رہے ہیں۔ فوج کے علاوہ اور کوئی ادارہ اس قابل نہیں ہے جو حالات کو کنٹرول کر سکے۔

صدر ایوب کا خطاب اعتراف شکست تھا۔ وہ دس سال اقتدار میں رہے اور کوئی مستحکم جمہوری سیاسی نظام وضع نہ کر سکے جو فوج کی مداخلت کے بغیر چل سکتا۔ صدر ایوب مارشل لاء نافذ کر کے اقتدار میں آئے اور اپنے سپہ سالار (commander-in-chief) کو اقتدار منتقل کر کے اور اسے مارشل لاء نافذ کرنے کا اختیار دے کر رخصت ہو گئے۔ قوم سے خطاب سے ایک روز قبل ایوب خان نے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کے نام خط لکھ کر مستعفی ہونے کا عندیہ دے دیا تھا۔ ● عسکری تجزیہ نگاروں اور مؤرخین کا اندازہ ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے جنرل ایوب خان سے گن پوائنٹ پر استعفیٰ لیا۔ قوم سے خطاب سے پہلے جنرل یحییٰ خان کو خط لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صدر ایوب خان نے اپوزیشن سیاسی جماعتوں کی جو گول میز کانفرنس بلائی تھی اس میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات، اور فیڈرل پارلیمانی سسٹم پر سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اگر صدر ایوب انتخابات کا اعلان کر دیتے اور قومی اسمبلی کے سپیکر کو نگران صدر مقرر کر کے خود رخصت ہو جاتے تو حالات لازمی طور پر کنٹرول میں آ جاتے۔ انتخابات کے بعد سیاست دان فوجی مداخلت کے بغیر آئینی اُمور

● ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی میں آٹھ سیاسی جماعتیں شامل تھیں: 1- عوامی لیگ، 2- نیشنل عوامی پارٹی، 3- جمعیت العلمائے اسلام، 4- نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ، 5- عوامی لیگ (نواب زادہ نصر اللہ گروپ)، 6- کونسل مسلم لیگ، 7- جماعت اسلامی، 8- نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ)۔ ڈیک کے دو بنیادی مطالبات تھے۔ (1) مکمل اور حقیقی جمہوریت کی بحالی، (2) عوام کی حاکمیت کو تسلیم کرنا۔

● الطاف گوہر "ایوب خان پہلا فوجی حکمران" صفحہ 454

● ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 162

طے کرتے اور سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش نہ آتا۔ ایوب خان نے احتساب کے خوف سے اقتدار سیاست دانوں کے سپرد کرنے کی بجائے کمانڈر انچیف کے حوالے کر دیا۔ صدر ایوب کا یہ جواز درست نہیں ہے کہ ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ جنرل ایوب 18 سال تک کمانڈر انچیف اور صدر کی حیثیت سے اقتدار پر قابض رہے۔

صدر ایوب کے اپنے آئین 1962ء کے مطابق انہیں اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے سپرد کرنا چاہیے تھا مگر ان کا دیا ہوا نظام اس قدر کمزور تھا کہ آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے اقتدار ان سے چھین لیا۔ جنرل ایوب خان کے اقتدار سے رخصت ہوتے ہی سرکاری کنونشن لیگ تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی۔ جس سیاسی نظام کی بنیاد عوام کی آواز کی بجائے بندوق کے خوف پر رکھی جائے اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ 25 مارچ 1969ء کو صدر ایوب مستعفی ہو گئے اور فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے ملک پر مارشل لا نافذ کر دیا۔

جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔ مرکزی و صوبائی حکومتیں اور قومی و صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔ ملک پر مارشل لا نافذ کر دیا اور صدر و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اختیارات سنبھال لیے۔ قوم سے اپنے پہلے نشری خطاب میں انہوں نے جو باتیں کہیں وہ جنرل ایوب خان کے 1958ء کے پہلے خطاب سے ملتی جلتی تھیں۔ جنرل یحییٰ خان نے قوم سے وعدہ کیا کہ وہ حالات نارمل ہوتے ہی بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرائیں گے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیں گے۔

جنرل ایوب خان نے 1958ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سیاست دانوں کے بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کیے تھے وہ اپنے دس سالہ دور اقتدار میں مثالی نمونہ پیش نہ کر سکے۔ عالمی ماہر ڈاکٹر فرانذ پک (Dr Franz Pick) نے ایک رپورٹ میں تحریر کیا کہ گوہر ایوب جو کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے بہت جلد چار ملین ڈالر کے مالک بن گئے اور جنرل ایوب خان کے خاندان کے کل اثاثے 20 ملین ڈالر تک پہنچ گئے۔

جنرل یحییٰ خان نے جنرل ایوب خان کے خلاف ملک گیر تحریک کے دوران پاکستان کے بڑے شہروں میں مارشل لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ جنرل یحییٰ کا خیال تھا کہ مارشل لاء کے نفاذ سے ان کی اپنی اتھارٹی ختم ہو جائے گی اور وہ اقتدار میں آنے کا موقع کھو دیں گے۔ گول میز کانفرنس کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن نے جنرل یحییٰ خان سے خفیہ ملاقات کی تھی۔ جنرل یحییٰ نے مجیب کو مارشل لاء نافذ نہ کرنے کا یقین دلایا اور مجیب ٹریپ میں آ گئے اور یحییٰ کے مارشل لا کے بعد انہوں نے پشیمانی کا اظہار کیا۔

- Dr Franz Pick "World Currency Report 1969"
- حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 164
- ڈاکٹر صفدر محمود "Pakistan Divided" صفحہ 53

ہربرٹ فیلڈ مین (Herbert Feldman) کے مطابق ایوب خان نے یحییٰ کے نام خط میں تحریر کیا۔

"Legal and constitutional responsibility of (the Army) to defend the country not only against external aggression but also to save it from internal disorder and chaos."

ترجمہ: ''(فوج) کی قانونی اور آئینی ذمے داری ہے کہ وہ نہ صرف بیرونی جارحیت کے خلاف دفاع کرے بلکہ ملک کو اندرونی انتشار اور بدنظمی سے بھی محفوظ رکھے۔''

جب ایوب نے اقتدار یحییٰ کے سپرد کیا تو عوام کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا۔

"Whenever it was felt in GHQ that things were not going according to the taste and opinion of senior officers, the armed forces (in fact the army alone) would move in or contrive to do so."

ترجمہ: ''جب بھی جی ایچ کیو میں یہ احساس پیدا ہوا کہ حالات سینئر فوجی آفیسروں کے مزاج اور خیال کے مطابق نہیں جا رہے افواج پاکستان (درحقیقت صرف بری فوج) حرکت میں آجاتی ہے یا مداخلت کے لیے تدبیر پیدا کرتی ہے۔''

- Herbert Feldman "The End and the Beginning: Pakistan" صفحہ 13
- Herbert Feldman "The End and the Beginning: Pakistan" صفحہ 11

باب5

ملک توڑنے والا جنرل

1966ء میں صدر ایوب خان نے جنرل موسیٰ خاں کی جگہ جنرل یحییٰ خان کو افواج پاکستان کا کمانڈر انچیف نامزد کیا تو ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر اور انسان شناس فیوڈل نواب آف کالا باغ امیر محمد خان نے یہ ریمارکس دیئے:۔

''ایوب خان نے اپنی زندگی کی انتہائی سنگین غلطی کی ہے۔ اس نے ایک شرابی اور بدکار عیاش کو کمانڈر انچیف بنا دیا ہے ایک دن وہ (ایوب خان) اس غلطی پر پچھتائے گا۔''[1]

جنرل یحییٰ خان کا اخلاقی کردار اچھا نہ تھا۔ وہ محنتی نہ تھے اور اعلیٰ مقصد سے ان کی وابستگی (commitment) نہ تھی۔ ان کو جیو پولیٹیکل اور جیو سٹریٹجک مسائل کا ادراک نہیں تھا۔ ان کا ڈویژن کمانڈر سے اوپر ترقی پانا تباہ کن تھا۔[2]

جب یحییٰ خان نے اقتدار سنبھال لیا تو الطاف گوہر جی ایچ کیو میں گئے اور دیکھا۔

"Found Yahya and three other Generals Hameed, Peerzada and Gul Hassan..... They looked like a bunch of thieves bending over the booty and were a little startled as if caught red-handed.[3]

ترجمہ: ''جنرل یحییٰ اور تین دوسرے جرنیلوں حمید، پیرزادہ اور گل حسن کو دیکھا .... وہ چوروں کے گروہ کی طرح نظر آ رہے تھے جو مال غنیمت پر جھکے ہوئے ہوں اور قدرے چونکے جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔''[3]

اقتدار سنبھالتے ہی جنرل یحییٰ خان نے پی سی او(Provisional Constitutional Order) جاری کیا۔ بنیادی حقوق معطل کر دیئے۔ عدالتوں پر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فیصلوں اور احکامات کے خلاف اپیل نہ سننے کی پابندی عائد کر دی۔ جہاں تک ممکن ہو 1962 کے آئین کی حدود میں رہنے کا وعدہ کیا۔ جنرل یحییٰ خان کی کچن کیبنٹ میں تین ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز جنرل عبدالحمید خان (چیف آف سٹاف

---

[1] لیفٹیننٹ جنرل جہاں داد خان "Pakistan Leadership Challenges" صفحہ 108

[2] لیفٹیننٹ جنرل جہاں داد خان "Pakistan Leadership Challenges" صفحہ 126

[3] الطاف گوہر ''ایوب خان پہلا فوجی حکمران'' صفحہ 477

آرمی)، ایئر مارشل نور خان (کمانڈر انچیف ایئر فورس)، وائس ایڈمرل ایس ایم احسن (کمانڈر انچیف نیوی)، میجر جنرل عمر (چیئر مین نیشنل سکیورٹی کونسل) اور میجر جنرل اکبر (چیف آئی ایس آئی) شامل تھے۔ ملٹری اور سول بیورو کریسی نے ریاست پر اپنا کنٹرول قائم رکھا:۔

جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد قوم سے اپنے پہلے نشری خطاب میں کہا۔

''میرے ہم وطنو! میں آپ پر قطعی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک آئینی حکومت کے قیام کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ یہ میرا پختہ ایمان ہے کہ دانشمندانہ تعمیری سیاسی زندگی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ و غیر جانبدارانہ طور پر منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کو اقتدار کی پرامن منتقلی کے لیے ایک مستحکم، صاف ستھری اور دیانت داری انتظامیہ شرط اول ہے۔ منتخب نمائندوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ ملک کو ایک قابل عمل آئین دیں اور ان تمام سیاسی، معاشی و معاشرتی مسائل کا حل تلاش کریں جنہوں نے عوام کے ذہنوں کو پریشان کر رکھا ہے۔'' [4]

جنرل یحییٰ نے یکم اگست 1969ء کو لاہور میں امریکہ کے صدر نکسن سے علیحدگی میں ملاقات کی اور وزارت خارجہ کو اعتماد میں نہ لیا اس طرح جنرل یحییٰ نے جنرل ایوب کی روایت کو جاری رکھا۔ جنرل ایوب اقتدار کے دوران بڑی طاقتوں سے ذاتی تعلقات استوار کرنے میں دلچسپی لیتے رہے اور اداروں کو منظم اور مستحکم نہ ہونے دیا۔ [4a]

جنرل یحییٰ خان نے ایک آئینی حکومت کے قیام کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کا وعدہ کیا مگر وہ اس وعدے کو پورا کرنے میں بڑی طرح ناکام ہوئے۔ جنرل یحییٰ خان کمانڈر انچیف، صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ انہوں نے بیک وقت تین ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ نے اپریل 1969ء میں پاکستان کے سیاست دانوں ذوالفقار علی بھٹو (پی پی پی)، میاں طفیل محمد (جماعت اسلامی)، میاں ممتاز دولتانہ (کونسل مسلم لیگ)، نور الامین اور نوابزادہ نصر اللہ خان سے ملاقاتیں کیں۔ یحییٰ خان نے دو بنیادی فیصلوں ون یونٹ کا خاتمہ اور ''ون مین ون ووٹ'' کی بنیاد پر انتخابات کا اعلان کر کے سیاسی حلقوں کو کافی حد تک مطمئن کر دیا۔ انہوں نے 30 مارچ 1970ء کو ایل ایف او (Legal Framework Order) جاری کیا۔ ایل ایف او میں یہ اہم نکات شامل تھے:۔

- آبادی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات
- مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان (parity) مساوات کا خاتمہ
- براہ راست انتخابات
- قومی اسمبلی 120 دن کے اندر آئین بنائے گی وگرنہ ختم ہو جائے گی
- اگر صدر پاکستان آئین کی تصدیق نہیں کریں گے تو قومی اسمبلی کا وجود ختم ہو جائے گا
- علاقائی سالمیت کی شرط پر زیادہ سے زیادہ خود مختاری
- آزاد عدلیہ

[4] مرتضیٰ انجم ''پاکستان میں فوجی حکومتیں'' صفحہ 208

[4a] ایف ایس اعجاز الدین "The White House and Pakistan" صفحہ 61

- بنیادی حقوق کی بحالی
- فیڈرل ری پبلک
- اسلامک آئیڈیالوجی
- معاشی عدم مساوات کا خاتمہ

شیخ مجیب الرحمٰن نے ایل ایف او پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے انتخابات کے بعد اسے پھاڑ دینے کا اعلان کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ ایل ایف او کے تحت انتخابات کرانے سے پاکستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آئین سازی کے لیے 120 دن کی مدت بہت کم ہے۔ سیاست دان انتخابات سے قبل مذاکرات کر کے صوبائی خود مختاری کا فیصلہ کریں تاکہ انتخابی مہم کے دوران عوام کے جذبات میں اشتعال پیدا نہ کیا جا سکے۔ [5] ایل ایف او ایک لحاظ سے مجیب الرحمٰن کے لیے سازگار تھا۔ فیڈریشن کے اصول کے برعکس اسمبلی سادہ اکثریت سے آئین منظور کر سکتی تھی حالانکہ آئین دو تہائی اکثریت سے منظور ہونا چاہیے۔ ایل ایف او میں آئین سازی کے لیے بھی مشرقی پاکستان کی عددی بالادستی کو تسلیم کر لیا گیا۔

اگر قومی اسمبلی کے ساتھ سینٹ کا ادارہ بھی موجود ہوتا جس میں صوبوں کی مساوی نمائندگی ہوتی تو مغربی پاکستان کے صوبے پارلیمانی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ سادہ اکثریت سے آئین منظور کرنے کا کھلا اور واضح مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے نمائندے اپنی مرضی دوسرے صوبوں پر مسلط کر سکتے تھے۔ یحییٰ خان نے خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں پر انحصار کیا جن کا تجزیہ تھا کہ انتخابات میں کوئی سیاسی جماعت اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی اور یحییٰ خان کی حیثیت بادشاہ گر (kingmaker) جیسی ہوگی۔ جنرل یحییٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انتخابات کے بعد بھی حالات ان کے کنٹرول میں رہیں گے اور اگر ان کو مشکلات پیش آئیں تو وہ آئین مسترد کر کے اسمبلیاں برخاست کر دیں گے۔

یحییٰ خان نے بھی سیاست کی آندھی کو کنٹرول کرنے کے لیے وہ تدابیر اختیار نہ کیں جن کی وقت کے معروضی حالات میں ضرورت تھی۔ یحییٰ خان نے نومبر 1969ء سے مارچ 1970ء تک جو فیصلے کیے وہ ملک و قوم کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ انہوں نے سیاسی بلوغت کی کمی اور آئینی تاریخ سے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔ [6] بھٹو نے ایل ایف او کے نتائج کے بارے میں بروقت انتباہ کیا مگر یحییٰ خان اور اس کی ٹیم نے اس کا نوٹس نہ لیا۔

آئین کی منظوری کے لیے سادہ اکثریت کا آپشن کھلا چھوڑ دینا یحییٰ خان کی سنگین غلطی تھی جس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ [7] ایل ایف او جاری کر کے یحییٰ خان نے ویٹو کا حق حاصل کر لیا اور وہ منتخب

[5] لیفٹیننٹ جنرل کمال مطیع الدین "Tragedy of Errors" صفحہ 137

[6] حسن ظہیر "Separation of East Pakistan" صفحہ 118

[7] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 159

اسمبلی کے قوانین کو ویٹو کر سکتے تھے۔ ایل ایف او ایک ایسی سوچی سمجھی سکیم تھی جس کا مقصد فوج اور بیورو کریسی کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا اور ریاستی سٹرکچر پر اُس کی بالادستی کو قائم رکھنا تھا۔ یحییٰ خان اور ان کے رفقاء مشرقی یا مغربی پاکستان کے کسی سیاسی رہنما کو کلی اقتدار منتقل کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ [8]

جنرل یحییٰ نے دسمبر 1970ء میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے انتخابی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ چھ نکات کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لے رہی تھی۔

1- قرارداد لاہور کے مطابق آئین تیار کیا جائے جس کی اساس پارلیمانی نظام حکومت، پارلیمنٹ کی بالادستی، بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست انتخابات پر رکھی جائے۔

2- وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع اور خارجہ امور کے محکمے ہوں گے اور باقی تمام محکمے صوبوں کے پاس ہوں گے۔

3- پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے دو الگ کرنسی نوٹ جاری کیے جائیں جو آسانی سے تبدیل ہو سکتے ہوں یا پورے ملک کے لیے ایک ہی کرنسی رکھی جائے اور قانونی ضمانت فراہم کی جائے کہ مشرقی پاکستان کی دولت مغربی پاکستان میں منتقل نہیں کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ ریزرو بینک قائم کیا جائے اور الگ مالیاتی پالیسی وضع کی جائے۔

4- ٹیکس اور ریونیو اکٹھا کرنے کا اختیار صوبوں کو دیا جائے اور فیڈرل گورنمنٹ کا اختیار کلی طور پر ختم کیا جائے۔ وفاق اپنے اخراجات صوبائی ٹیکسوں سے وصول کرے۔

5- مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے بیرونی زرمبادلہ کی آمدن کے علیحدہ اکاؤنٹس ہوں۔ مشرقی پاکستان کی آمدن مشرقی پاکستان کے کنٹرول میں رہے اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے کنٹرول میں رہے گی۔ فیڈرل گورنمنٹ کی زرمبادلہ کی ضروریات دونوں ونگ مساوی طور پر یا فکسڈ تناسب سے پوری کریں گے۔ خام مال ڈیوٹی کے بغیر دونوں حصوں میں منتقل ہو سکے گا۔ آئین صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار دے گا کہ وہ دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کر سکیں۔ ٹریڈ مشن بنا سکیں اور بیرونی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کر سکیں۔

6- مشرقی پاکستان کو اپنی ملیشیا یا پیرا ملٹری فورس بنانے کا اختیار ہو۔ [9]

چھ نکات کے منظر عام پر آنے کے بعد مغربی پاکستان کے سیاست دانوں نے شدید ردِ عمل، تحفظات اور خدشات کا اظہار کیا۔ جی ڈبلیو چوہدری جو جنرل یحییٰ اور شیخ مجیب کے درمیان مذاکرات کے موقع پر

[8] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 310

[9] ایم۔ایس۔کوریجو "Soldiers o fMisfortune" صفحہ 67

موجود تھے کہتے ہیں کہ شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ کو یقین دلایا کہ چھ نکات ”قرآن اور بائبل نہیں ہیں اور ان پر بات چیت ہو سکتی ہے“۔ یحییٰ خان نے مجیب پر اعتماد کیا اور اس کے مخالفین کی رائے کو مسترد کر دیا۔ انتخابات کے بعد یحییٰ کو اندازہ ہوا کہ مجیب نے اس سے دھوکہ کیا۔ [10] وائٹ پیپر میں بھی یہ تسلیم کیا گیا کہ مجیب نے ملاقاتوں کے دوران یقین دہانی کرائی تھی کہ چھ نکات پر بات چیت کر کے ایڈجسٹمنٹ ہو سکتی ہے۔ [11]

ذوالفقار علی بھٹو نے پی پی پی کا انقلابی منشور جاری کیا جو عوام کی آرزوؤں کا عکاس تھا۔ منشور کا بنیادی نعرہ ”روٹی کپڑا اور مکان“ تھا اور پی پی پی کے بنیادی اُصول یہ تھے۔

1- اسلام ہمارا دین ہے۔

2- سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

3- جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

4- طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

جنرل یحییٰ نے خفیہ رپورٹوں کے غلط جائزوں کی روشنی میں 1970ء کے انتخابات صاف اور شفاف کرانے کا فیصلہ کیا مگر انتخابی مہم کے دوران جب انہیں اندازہ ہوا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو ان کی توقع سے زیادہ نشستیں حاصل کر لیں گے تو انہوں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو رضوی کے ذریعے مجیب اور بھٹو کے مخالفین کو فنڈز مہیا کیے اور انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ رضوی کے مولانا بھاشانی سے ذاتی مراسم بھی تھے اور سرکاری مراسم بھی تھے اسے مشرقی پاکستان میں استعمال کیا گیا۔ جنرل عمر نے مغربی پاکستان کے صنعت کاروں سے پیسے اکٹھے کیے۔ اس کے ذریعے خان قیوم کو پیسے دیئے گئے۔ بھٹو نے رضوی اور جنرل عمر کے خلاف انکوائری کرائی اور ثابت ہوا کہ دونوں نے پیسے خرد برد کیے۔ رضوی نے تین لاکھ روپے واپس کیے۔ [12]

سینئر کمانڈرز نے اقرار کیا کہ وہ چاہتے تھے کہ قومی اسمبلی میں کوئی جماعت اکثریت حاصل نہ کرے اور آئین نہ بن سکے۔ عوام کو باور کرا دیا جائے کہ سیاست دان متفق نہیں ہو سکتے اور مارشل لا جاری رہے۔ [13] یحییٰ نے اکتوبر 1970ء میں واشنگٹن میں ہنری کسنجر کو بتایا تھا کہ انتخابات میں مختلف سیاسی جماعتیں انتخاب جیت کر اسمبلی میں پہنچ جائیں گی اور وہ مخلوط حکومت کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ [14]

انتخاب کا اعلان کرنے کے بعد تیر یحییٰ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ عوام میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی۔

[10] جی ڈبلیو چوہدری "The Last Days of the United Pakistan" صفحہ 85

[11] حکومت پاکستان۔ مشرقی پاکستان کے بحران پر وائٹ پیپر صفحہ 10

[12] ایم۔ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 63

راؤ رشید ”جو میں نے دیکھا“ صفحہ 57

[13] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" حوالہ امریکن دستاویزات

[14] ہنری کسنجر "White House Years" صفحہ 850

ایوب خان کے خلاف ملک گیر احتجاجی تحریک کا دباؤ اسٹیبلشمنٹ پر موجود تھا لہٰذا انتخابی نتائج تبدیل کرنا جرنیلوں اور بیوروکریٹس کے بس کی بات نہ تھی۔ جنرل یحییٰ کے بھائی آغا محمد علی ڈائریکٹر آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) کی انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوششیں رنگ نہ لاسکیں۔ ایئر مارشل (ر) اصغر خان نے بھی 1970 کے انتخاب میں حصہ لیا انہوں نے اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتے ہوئے تحریر کیا:۔

''میں انتخابی مہم کے دوران کمر کی تکلیف کے باعث کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں داخل تھا۔ جنرل یحییٰ کے بھائی آغا محمد علی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو میری تیمارداری کے لیے آئے اور اپنے ساتھ ہارڈ بورڈ لے کر آئے انہوں نے کہا کہ یہ ہارڈ بورڈ صدر پاکستان نے میرے لیے بھیجا ہے اس کو استعمال کرنے سے کمر درد رفع ہوجاتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلے ہی ہارڈ بورڈ استعمال کر رہا ہوں جب وہ چلے گئے تو میں نے کمرے میں ایک سوٹ کیس دیکھا جو کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے آغا محمد علی کو دوسرے دن بلایا اور بتایا کہ وہ ایک سوٹ کیس میرے کمرے میں چھوڑ گئے تھے انہوں نے کہا یہ کرنسی صدر پاکستان نے گفٹ کے طور پر بھجوائی ہے تاکہ انتخابات میں میرے کام آسکے۔ میں نے شکریے کے ساتھ سوٹ کیس واپس کردیا۔'' [15] خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں کے مطابق متوقع انتخابی نتائج کچھ اس طرح تھے۔

پارٹیز	متوقع نتائج	اصل نتائج
عوامی لیگ	80 نشستیں	160 نشستیں
قیوم لیگ	70 نشستیں	9 نشستیں
مسلم لیگ دولتانہ	40 نشستیں	2 نشستیں
نیشنل عوامی پارٹی	35 نشستیں	6 نشستیں
پی پی پی	25 نشستیں	81 نشستیں

1970ء کے انتخابی نتائج نے جنرل یحییٰ خان اور ان کی ٹیم کو حیران و ششدر کردیا۔ خفیہ ایجنسیوں کے اندازے بُری طرح غلط ثابت ہوئے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تو موجود تھا۔ 1951ء سے 1970ء تک فوج کے جرنیلوں، بیوروکریٹس اور اکثر سیاست دانوں نے امتیاز، تعصب اور استحصال پر مبنی سیاسی، سماجی اور معاشی فیصلے کرکے پاکستان کے دونوں حصوں میں بسنے والے شہریوں کے دلوں اور ذہنوں کے درمیان بھی فاصلے پیدا کردیئے جس کا برملا اظہار عوام نے 1970ء کے انتخابات میں کردیا۔ مغربی پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت مشرقی پاکستان میں ایک نشست بھی حاصل نہ کرسکی۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کی کسی سیاسی جماعت کو مغربی پاکستان میں ایک نشست بھی نہ ملی۔

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اکثریتی لیڈر بن کر

[15] اصغر خان "We Have Learnt Nothing from the History" صفحہ 220

اُبھرے۔ پاکستان کا سیاسی منظر ہی تبدیل ہوگیا۔ یحییٰ خان کے خفیہ ارادے خاک میں مل گئے مگر ان کی نیت اور ارادے تبدیل نہ ہوئے۔ وہ اگر حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے تو عوام کے مینڈیٹ کو تسلیم کرتے ہوئے اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کو منتقل کرکے فوج کو سیاست سے باہر نکال لیتے مگر انہوں نے مہم جویانہ راستہ اختیار کیا۔ ڈی جی آئی ایس آئی جنرل اکبر نے کہا۔

"We will not let that bastard rule the country."

ترجمہ: ''ہم اس حرام زادے کو ملک پر حکمرانی نہیں کرنے دیں گے۔''

جنرل راؤ فرمان علی کے مطابق بارہ جرنیل مجیب کو اقتدار منتقل کرنے کے خلاف تھے [16] فوج کا خیال یہ تھا کہ عوامی لیگ بھارت سے گٹھ جوڑ کرلے گی۔ قومی وسائل مشرقی پاکستان منتقل ہوجائیں گے۔ فوج میں میرٹ کے بغیر بھرتیاں ہوں گی۔ مغربی پاکستان کے سیاسی و معاشی مفادات متاثر ہوں گے۔ [17] مغربی پاکستان کے جرنیلوں کو یہ خوف بھی تھا کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والا کرنل ایم اے جی عثمانی عوامی لیگ حکومت میں وزیر دفاع بن جائے گا اور وہ ان فوجی جرنیلوں سے بدلہ لے گا جنہوں نے اس کی پروموشن کو روکا اور اسے ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور کیا [18] انتخابات کے دو ماہ بعد شیخ مجیب نے ایک جلسہ میں مغربی پاکستان پر الزامات عائد کیے کہ 80 فیصد بیرونی امداد مغربی پاکستان کے مفاد پرست طبقہ نے ہڑپ کرلی ہے۔ گزشتہ 23 سال میں دو تہائی درآمدات مغربی پاکستان میں ہوئیں۔ بنگلہ دیش کے کمائے ہوئے زرمبادلہ کے 500 کروڑ روپے مغربی پاکستان میں صرف کیئے گئے۔ مشرقی پاکستان کے 7 کروڑ عوام مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کی محفوظ منڈی کے طور پر استعمال کیے گئے۔ مشرقی پاکستان کی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ بنگالی بھوکے مر رہے ہیں یہ سلسلہ اب جاری نہیں رہ سکتا۔ [19] سینئر بیوروکریٹ ایم ایم احمد نے حسن ظہیر کو اپنے تاثرات ریکارڈ کراتے ہوئے کہا۔

''میرا تاثر یہ ہے کہ وہ (مجیب) چھ نکات کے بہت سے نکات ترک کرنے پر تیار تھا مگر 23 مارچ کو مجیب ایوان صدر ڈھاکہ میں صدر پاکستان یحییٰ خاں سے ملاقات کے لیے آئے تو ان کی کار پر بنگلہ دیش کا فلیگ لہرا رہا تھا وہ پاکستان کا فلیگ بھی لگا سکتے تھے۔ ایوان صدر کے گیٹ پر ملٹری سیکرٹری سے مجیب کی تکرار بھی ہوئی اور اس نے بنگلہ دیش کے پرچم پر احتجاج کیا۔ انہی دنوں صدر یحییٰ ایک چھاؤنی کا وزٹ کرنے کے لیے جانا چاہتے تھے مگر انہیں بتایا گیا کہ عوامی لیگ کے کارکنوں نے سڑکوں کو بلاک کررکھا ہے۔ یحییٰ خان نے ہیلی کاپٹر پر جانے سے انکار کردیا۔ میرے خیال میں ان واقعات نے یحییٰ خان کو عوامی لیگ کے

[16] ایم۔ایس۔کوریجو "Soldiers of Misfortunes" صفحہ 70
[17] لیفٹیننٹ جنرل کمال مطیع الدین "Tragedy of Errors" صفحہ 156
[18] حسن ظہیر "Sepration of East Pakistan" صفحہ 130
[19] پاکستان آبزرور (ڈیلی) 25 فروری 1971

رہنماؤں سے ناراض کر دیا"۔[40]

حسن عسکری رضوی لکھتے ہیں:۔

"Bhutto having realised that Mujib was not prepared to make any change in six points adopted a hardline to bow him down. That was a miscalculation. His refusal to attend the National Assembly session created the impression that he was in league with ruling generals."[41]

ترجمہ: "بھٹو کو جب اندازہ ہوگیا کہ مجیب چھ نکات میں تبدیلی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس نے مجیب کے مؤقف میں لچک پیدا کرنے کے لیے سخت مؤقف اختیار کیا۔ اس کا اندازہ درست نہیں تھا۔ اس کی جانب سے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہ کرنے کے اعلان سے یہ تاثر پھیلا کہ وہ حکمران جرنیلوں سے ملا ہوا ہے۔"[41]

جنرل کے ایم عارف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ ایک صحافی نے جو 1970ء کے انتخابات میں مجیب کے ساتھ تھا مجیب کی گفتگو ٹیپ کی اس نے کہا۔

"صدر ایوب نے مجھے مقبولیت کے عروج پر پہنچا دیا۔ اب میں ہر ایک کو No کہہ سکتا ہوں اور یحیٰ بھی میرے مطالبات مسترد نہیں کر سکتا۔[42]

لیفٹیننٹ جنرل کمال مطیع الدین کی رائے یہ ہے:۔

On March 14, 1971 Bhutto said, "Power should be transferred to both the majority parties." This was tantamount to acceptance of separation or a confederation between two wings.[43]

ترجمہ: 14 مارچ 1971ء کو بھٹو نے کہا "دونوں اکثریتی جماعتوں کو اقتدار منتقل کیا جائے۔" یہ بیان مشرقی پاکستان کی علیحدگی یا دونوں حصوں کی کنفیڈریشن کے مترادف تھا۔[43]

جنرل کمال مطیع الدین کا تاثر درست نہیں ہے۔ بھٹو مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر تھے اور انہوں نے مغربی پاکستان کے اقتدار کی بات کی تھی۔ بھٹو کے بیانات اخبارات کے ریکارڈ میں موجود ہیں جس میں انہوں نے مجیب کو پاکستان کا وزیر اعظم تسلیم کیا اور جنرل یحیٰ کو انتباہ کیا کہ اگر اس نے اقتدار مجیب کو منتقل نہ کیا تو ملک کا انتقال ہو سکتا ہے۔ بھٹو نے 20 فروری 1971ء کو مطالبہ کیا کہ یا تو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی

[40] حسن ظہیر — "Separation of East Pakistan" — صفحہ 158
[41] حسن عسکری رضوی — "The Military and Politics in Pakistan" — صفحہ 193
[42] جنرل کے ایم عارف — "Khaki Shadows"
[43] لیفٹیننٹ جنرل کمال مطیع الدین — "Tragedy of Errors" — صفحہ 193

کیا جائے یا آئین بنانے کے لیے 120 دن کی شرط ختم کی جائے۔ بھٹو مغربی پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دونوں حصوں کے اکثریتی لیڈر اسمبلی کے اجلاس سے قبل آئین کے بارے میں اتفاق رائے کر لیں تاکہ اسمبلی انتشار کا شکار نہ ہو اور اسمبلی ٹوٹنے کے امکانات پیدا نہ ہو جائیں۔ بھٹو نے ڈھاکہ جا کر مجیب سے مذاکرات کیے اور ساڑھے پانچ نکات تسلیم کرنے کا عندیہ دیا اور مجیب پر زور دیا کہ وہ چھ نکات میں سے بیرونی تجارت نکال دیں کیونکہ بیرونی تجارت خارجہ اُمور کا حصہ ہے۔ مجیب نے انکار کر دیا۔ بھٹو نے مجیب کی سخت اور انتہا پسندانہ پوزیشن کی بناء پر اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ وہ اگر اجلاس میں شرکت کر کے بائیکاٹ کرتے تو تنقید سے بچ جاتے۔ بھٹو کا خیال یہ تھا کہ چھ نکات تسلیم کرنے سے پانچ پاکستان وجود میں آ جائیں گے۔ بھٹو نے وزیر اعظم کی حیثیت سے قیدی مجیب سے ملاقات کی۔ دونوں لیڈروں کی گفتگو کو ٹیپ کیا گیا۔ اس ٹیپ کے مطابق گفتگو کا آخری حصہ کچھ اس طرح ہے:

بھٹو: صدارت لے لو، وزارتِ عظمیٰ لے لو، میں قرآن پر حلف اٹھا کر کہتا ہوں میں ریٹائر ہونے کے لیے تیار ہوں۔

مجیب: میرا خیال تھا ہم دونوں پاکستان پر حکمرانی کریں گے لیکن حرام زادے یحیٰ نے سازش کی اور حالات خراب کیے۔

بھٹو: مگر اب ہم نے حالات کو درست کرنا ہے۔

مجیب: ہاں مگر تمہیں میری مشکلات کا احساس ہونا چاہیے میں نے بنگال کے عوام کو اعتماد میں لے کر غاصب فوج کو بنگال سے نکالنا ہے، یہ آسان کام نہیں ہے۔

بھٹو: ہاں یہ کام آسان نہیں ہے میں ڈھاکہ جانے کے لیے تیار ہوں۔

مجیب: مجھے وقت دو۔ عوام سے ملنے دو۔ میں وہاں جا کر تمہیں بتاؤں گا تم عوام کے ہیرو ہو اور تاحیات رہو گے۔

بھٹو: میں عمر بھر نہیں رہنا چاہتا تم ہمارے صدر بن جاؤ۔[44]

بھٹو نے ایک پبلک میٹنگ میں کہا۔

"پی پی پی اکثریت کا احترام کرتی ہے۔ پنجاب اور سندھ طاقت کے مرکز ہیں۔ ہم مرکز میں حکومت بنا سکیں یا نہ بنا سکیں مگر پنجاب اسمبلی چیمبر کی چابیاں میری جیب میں ہیں۔ میری دوسری جیب میں سندھ اسمبلی کی چابیاں ہیں۔ کوئی مرکزی حکومت ہمارے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اگر پی پی پی اسے سپورٹ نہ کرے تو اس کے لیے کام کرنا مشکل ہوگا اور آئین تیار کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔"[45]

15 فروری 1971ء کو بھٹو نے پی پی پی کے اراکین قومی اسمبلی کو انتباہ کیا کہ اگر وہ اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گئے تو ان کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ بھٹو جب ڈھاکہ سے واپس آئے تو مشرقی پاکستان

[44] قیوم نظامی — "جو دیکھا جو سنا" — صفحہ 90
[45] "A History of Pakistan Army" — Brian Cloughley — صفحہ 162

میں ملٹری ایکشن شروع ہو چکا تھا۔ بھٹو نے مغربی پاکستان پہنچتے ہی کہا۔

"By the grace of God, Pakistan has at last been saved."[56]

ترجمہ: ''خدا کے فضل و کرم سے پاکستان آخر کار بچ گیا ہے''[56]

یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر کے اور نئی تاریخ کا اعلان نہ کر کے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بنگالی غصے میں آ گئے۔ انہوں نے جان لیا کہ مغربی پاکستان کے طاقت کے مراکز عوام کے مینڈیٹ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عوامی لیگ کے 417 منتخب سیاست دانوں نے ڈھاکہ کی ایک ریلی میں یہ حلف اٹھایا۔

''اللہ تعالیٰ کے نام سے اور ان شہیدوں کے نام سے جنہوں نے ہر قسم کے جبر و تشدد کا مقابلہ کیا اور اپنی جانوں کی قربانی دی۔ محنت کش عوام کسانوں، طلبہ اور دیگر طبقوں کے عوام کے نام سے ہم قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے نو منتخب اراکین حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم چھ نکات اور گیارہ نکاتی پروگرام کے لیے دیئے گئے عوامی مینڈیٹ سے وفادار رہیں گے۔''[57]

قومی اسمبلی کے اجلاس کے التواء کے بعد مشرقی پاکستان میں پرتشدد ہنگامے اور مظاہرے ہوئے۔ گورنر ایڈمرل احسن نے ردعمل کے طور پر استعفیٰ دے دیا۔ جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ کا دورہ کیا جو بے سود رہا۔ مجیب نے صدر پاکستان کی دعوت پر اسلام آباد کا دورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ عوامی لیگ نے جنرل یحییٰ خان کو تجویز پیش کی کہ چاروں صوبوں میں اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ صدر مرکزی حکومت کو چلاتے رہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اراکین اسمبلی اسلام آباد اور ڈھاکہ میں الگ الگ اجلاس کر کے سفارشات تیار کریں۔ بعد میں یہ سفارشات قومی اسمبلی کے اجلاس میں پیش کی جائیں جو ان کی منظوری دے۔ مشرقی پاکستان کو چھ نکات کی بنیاد پر صوبائی خودمختاری دے دی جائے اور دوسرے صوبے عبوری انتظام کے ذریعے صوبائی خودمختاری کا تعین کر لیں۔ یہ عبوری سکیم صدارتی اعلامیہ کے ذریعے جاری کی جائے۔[58]

یحییٰ نے عوامی لیگ کی ان تجاویز کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ مجیب بھٹو کو ایک جانب لے گیا اور کہنے لگا۔ ''حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں۔ بہتر حل یہ ہے کہ تجاویز مان لی جائیں۔ پی پی پی مغربی پاکستان کی واحد سیاسی قوت ہے دوسری جماعتیں اس کا وقت ضائع کر رہی ہیں، بھٹو مغربی پاکستان میں مختارِ کل ہو گا۔ مشرقی پاکستان کو الگ چھوڑ دیا جائے۔ اگر فوج نے مجھے تباہ کیا تو وہ اس (بھٹو) کو تباہ کر دے گی۔ بھٹو نے جواب دیا کہ وہ تاریخ کے ہاتھوں تباہ ہونے کی بجائے فوج کے ہاتھوں تباہ ہونا پسند کرے گا۔''[59]

---

[56] حسن ظہیر "Separation of East Pakistan" صفحہ 322

[57] Brian Cloughley "A History of Pak Army" صفحہ 163

[58] زیڈ اے بھٹو "The Great Tragedy" صفحہ 40

[59] زیڈ اے بھٹو "The Great Tragedy" صفحہ 43

راؤ فرمان علی کے مطابق مجیب قومی اسمبلی کے اجلاس کی نئی تاریخ کے بارے میں زور دیتا رہا۔[60] یحییٰ نے نئی تاریخ دینے سے انکار کیا اور جب بنگالیوں نے پاکستان کے پرچم اُتار کر بنگلہ دیش کے پرچم لہرا دیئے تو یحییٰ نے ملٹری ایکشن کا حکم دے دیا۔ یحییٰ خان کی بنگالیوں کے بارے میں سوچ یہ تھی۔

"Show them the teeth and they will be alright."

ترجمہ: ''ان کو دانت دکھاؤ اور وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

ایک اندازے کے مطابق ملٹری ایکشن سے پہلے مکتی باہنی نے ایک لاکھ سے پانچ لاکھ غیر بنگالیوں کو قتل کر دیا تھا۔[61] ان ہلاکتوں کی وجہ سے فوج میں انتقامی جذبات پیدا ہوئے حالانکہ اسے برداشت اور صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ آرمی آپریشن کے دوران 26000 افراد مارے گئے اور ایک سو سے زیادہ خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا۔[62] اس آپریشن کے دوران جماعت اسلامی کے عسکری ونگ الشمس اور البدر نے فوج کے ساتھ عملی تعاون کیا۔ آرمی نے حالات پر قابو پانے کے بعد بھی سیاسی حل تلاش کرنے کی بجائے عوامی لیگ پر پابندی لگا دی۔ مجیب الرحمٰن کو غدار ڈکلیئر کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ مغربی پاکستان میں ایک ملٹری کورٹ نے اسے سزائے موت سنا دی۔ یحییٰ نے امریکی دباؤ پر سزا پر عمل درآمد ملتوی کر دیا۔ لاکھوں کی تعداد میں بنگالی اور ہندو سرحد پار کر کے بھارت چلے گئے۔ بھارت نے ان کو خوش آمدید کہا اور کیمپوں میں ٹھہرایا۔ 27 مارچ 1971 کو بھارتی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد منظور کی کہ بھارت کے عوام بنگالیوں کی جدوجہد اور قربانیوں کی دلی طور پر قدر کریں گے اور ان سے پورا تعاون کریں گے۔[63]

بھارت نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ پاک فوج کے جرنیل وطن کا دفاع نہ کر سکے اور مشرقی پاکستان کے کمانڈر جنرل اے کے نیازی نے بھارتی جرنیل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جنرل نیازی نے سرینڈر سے چند روز قبل ایک پریس کانفرنس میں اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ بھارتی فوج کو ڈھاکہ پر قبضہ کرنے کے لیے ٹینک اس کے جسم کے اوپر سے گزارنا ہوں گے۔ پاک فوج کے نوے ہزار نوجوان جنگ لڑے بغیر بھارت کے قیدی بن گئے۔ پاکستان کو ذلت آمیز اور شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یحییٰ خان شراب کے رسیا تھے انہیں اقتدار کا نشہ بھی تھا۔ شرابیں جب شرابوں میں ملتی ہیں تو نشہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان ذہنی طور پر تو پہلے ہی پاکستان سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ شراب، اقتدار اور عورت کے نشے نے اسے جسمانی اور سیاسی طور پر بھی علیحدہ کر دیا۔ مغربی پاکستان اور آزاد کشمیر کی سلامتی بھی شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ امریکہ کے صدر نکسن نے جنوبی ایشیا میں بیلنس آف پاور کو قائم رکھنے کے لیے

---

[60] راؤ فرمان علی ہفت روزہ تکبیر 11 جنوری 1996 صفحہ 26-31

[61] حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پارٹ 4 باب 57 پیرا 51

[62] حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پارٹ 4 باب 57 پیرا 33-34

[63] Brian Clougley "A History of Pakistan Army" صفحہ 170

نیوکلیئر بحری بیڑہ کو بحیرہ بنگال کی جانب حرکت کا حکم دیا اور بھارت سیز فائر پر مجبور ہوا۔ عائشہ جلال کا خیال ہے:۔

"The dogged resistance of these two non-elected institutions to accepting the verdict of the people seriously limited the politicians room to manoeuvre."

ترجمہ: ''دو غیر نمائندہ اداروں (فوج اور بیوروکریسی) کی سینہ زور مزاحمت نے عوام کی رائے کو تسلیم نہ کر کے سیاست دانوں میں مفاہمت کے مواقع کو محدود کر دیا''

مؤرخین نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا جائزہ لیتے ہوئے بنگالیوں کے نیشنلزم کا ذکر کیا ہے اور مغربی پاکستان کی جانب سے ان آئینی، معاشی اور سماجی امتیازات کی نشاندہی کی ہے جو بنگالی کلچر اور زبان کے بارے میں روا رکھے گئے۔ قطب الدین عزیز نے بھارت کی مداخلت اور مکتی باہنی کی بغاوت کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا بڑا سبب قرار دیا ہے۔

میجر جنرل خواجہ وصی الدین کمانڈر دسویں ڈویژن نے 1963ء میں امریکہ کے قونصل جنرل سے کہا تھا۔

''مرکزی حکومت کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ قیام پاکستان سے لے کر اپنی ان غلطیوں کو تسلیم کر لے جو اس نے مشرقی پاکستان کے حوالے سے کیں اور مشرقی پاکستان کے مسائل ہمدردی اور مفاہمت کے جذبے سے حل کرے۔ طاقت اور جبر کا استعمال ناکام ہوگا اور مشرقی پاکستان کی سیاسی صورت حال مزید بگڑ جائے گی۔''

پاکستان کے غیر نمائندہ حکمرانوں نے سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ محب الوطن زیرک جرنیلوں کے مشورے پر بھی کان نہ دھرے۔ واحدانی ریاست کے لیے فوجی طاقت کا استعمال اور وائسرائیگل روایات پر عملدرآمد کی بناء پر اسٹیبلشمینٹ نے عوامی خواہشات کا احترام نہ کیا اور آدھا ملک گنوا لیا۔

روزنامہ ڈان نے جنرل یحییٰ کے ذاتی نوٹس پر مشتمل ایک سٹوری شائع کی۔ اس سٹوری کے مطابق یحییٰ نے اپنی ذاتی ڈائری میں سقوط ڈھاکہ کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تاثرات تحریر کیے۔

''بھارت روس گٹھ جوڑ، مجیب الرحمٰن کی غداری اور عالمی طاقتوں کی بے حسی سقوط ڈھاکہ کا سبب بنی۔ بھارت کی فوج بہت زیادہ تعداد میں تھی جس کے پاس ماڈرن روسی ہتھیار تھے۔ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آیا۔ یہ فوجی شکست نہ تھی۔ بھٹو کا کردار حب الوطنی پر مبنی تھا وہ آخر دم تک قوم پرستی کا ثبوت دیتے رہے۔ سکیورٹی کونسل میں بھٹو کا کردار شاندار تھا۔ بھٹو ہر وقت مجیب سے مذاکرات کے لیے تیار تھا مگر

- عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 62
- ایم احمد "Bangladesh: Constitutional quest for autonomy"
- قطب الدین عزیز "Blood And Tears"
- امریکن قونصل جنرل لاہور کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو پیغام 22 جنوری 1963
- اعجاز احمد "The Rebellion of 1983: A Balance Sheet"

مجیب راضی نہ ہوا۔ مجیب نے مخلوط حکومت بنانے کی پیشکش مسترد کر دی۔ میں نے بھٹو، ولی خان دولتانہ، مفتی محمود اور خان قیوم کو مجیب سے بات کرنے کے لیے ڈھاکہ بھیجا۔ سب نے مجھے کہا کہ مجیب کے مطالبات ہرگز قابل قبول نہیں۔ اس کے مطالبات کا صاف مطلب مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہے۔ بھٹو نے کسی مرحلہ پر بلا جواز ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ متحدہ پاکستان کے اندر ہر فارمولے کی تائید کی۔''

مسلم لیگ کی بنیاد دسمبر 1906 میں ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ 23 مارچ 1940 کی قرار داد لاہور کے محرک بنگال کے لیڈر مولوی فضل حق تھے۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے عوام نے تحریک پاکستان میں پرجوش حصہ لیا۔ پاکستان کے ساتھ ان کی وابستگی بڑی جذباتی اور مستحکم تھی مگر وہ چھ نکات پیش کرنے پر مجبور ہوگئے۔ 1947ء سے 1969ء تک 22 سال میں مشرقی پاکستان میں ایک چیف سیکرٹری بھی بنگالی نہیں تھا۔ بنگالیوں پر اُردو زبان مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمینٹ نے مشرقی پاکستان سے اپنی کالونی جیسا سلوک کیا۔ 1947ء سے 1971ء تک مشرقی پاکستان کے 15 گورنر نامزد ہوئے جن میں سے 13 کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔

بھٹو نے ٹوٹے ہوئے اور شکستہ پاکستان کا اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا تاکہ مشرقی پاکستان کے المیہ اور سقوط ڈھاکہ کے اسباب کا جائزہ لیا جا سکے اور ذمہ داری کا تعین کیا جائے۔ یہ کمیشن تین سینئر ججوں پر مشتمل تھا جسے حمود الرحمٰن کمیشن کا نام دیا گیا۔

1- جسٹس حمود الرحمٰن چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان
2- جسٹس انوار الحق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ
3- جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن چیف جسٹس ہائی کورٹ سندھ و بلوچستان

کمیشن نے اپنی تحقیقات دو مرحلوں میں مکمل کیں۔ ایک مرحلہ 1972ء میں مکمل ہوا جبکہ دوسرا مرحلہ بھارت میں پاکستانی قیدیوں کی رہائی اور واپسی کے بعد 1974ء میں مکمل ہوا۔ بھٹو نے اس رپورٹ کی اشاعت پر پابندی لگا دی کیونکہ اس میں کچھ دوست ممالک کے بارے میں مواد موجود تھا جو ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جنرل ضیاء الحق، بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے بھی اس رپورٹ کو شائع نہ کیا اور اسے خفیہ (classified) رکھا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں بھارتی رسالہ ''انڈیا ٹوڈے'' نے 2000 میں اس رپورٹ کی سمری شائع کر دی۔ پاکستان کے عوام حیران اور ششدرہ گئے کہ جو رپورٹ ان سے پوشیدہ رکھی گئی وہ بھارت میں شائع ہوگئی۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر جنرل پرویز مشرف نے رپورٹ کے کچھ حصوں کے علاوہ باقی رپورٹ کی اشاعت کی اجازت دے دی۔

حمود الرحمٰن کمیشن نے ان جرنیلوں کا پبلک ٹرائل کرنے کی سفارش کی جنہوں نے پاکستان کے آئین کو توڑا، سیاست پر غاصبانہ قبضہ کیا، پاکستان کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا، اپنے پیشہ وارانہ فرائض پورے

- ڈان 21 اگست 2000

نہ کیے اور عسکری قوت کے باوجود جنگ لڑنے سے گریز کیا حالانکہ ان کے پاس مزاحمت کے لیے اہلیت اور وسائل موجود تھے۔ [40]

کمیشن نے ان فوجی افسروں اور جرنیلوں کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمات چلانے کی سفارش کی۔

1- جنرل یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید، لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ، لیفٹیننٹ جنرل گل حسن، میجر جنرل عمر اور میجر جنرل مٹھہ۔ ان جرنیلوں نے 25 مارچ 1969 کو مجرمانہ سازش کر کے فیلڈ مارشل ایوب خان زبردستی سے اقتدار حاصل کیا۔ انہوں نے 1970ء کے انتخابات میں سیاسی جماعتوں کو دھمکیاں دے کر، لالچ دے کر اور رشوت دے کر ''مثبت نتائج'' حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں اراکین اسمبلی کو 3 مارچ 1971ء کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت سے روکا۔ ان جرنیلوں کے خلاف فرائض سے مجرمانہ غفلت اور مشرقی و مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگی فرائض پورے نہ کرنے کے الزام میں مقدمات چلائیں جائیں۔

2- لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان کے خلاف مجرمانہ غفلت اور شکر گڑھ کے محاذ پر بغیر جنگ لڑے 500 دیہات دشمن کے حوالے کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔

3- لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے۔ کے نیازی کے خلاف 15 الزامات کے تحت کورٹ مارشل کیا جائے۔ اس کے خلاف فرائض کی ادائیگی میں مجرمانہ غفلت، مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کرنے اور بھارتی افواج کے سامنے شرمناک طور پر ہتھیار ڈالنے (surrender) کرنے کے الزامات ہیں۔ اس کے پاس مزاحمت کرنے کی اہلیت اور ذرائع موجود تھے۔

ان کے علاوہ جن فوجی افسروں کے خلاف مقدمات چلانے کی سفارش کی گئی ان میں میجر جنرل عابد زاہد، میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ، میجر جنرل ایم جمشید، میجر جنرل رحیم خان، بریگیڈیئر جی ایم باقر صدیقی، بریگیڈیئر ایم حیات، بریگیڈیر ایم اسلم نیازی، بریگیڈیئر جہاں زیب ارباب، بریگیڈیئر مظفر علی زاہد، کرنل بشارت احمد، کرنل طفیل، بریگیڈیئر حیات اللہ، میجر مدد حسین شاہ، اور دیگر شامل ہیں۔ کمیشن نے دعویٰ کیا کہ ایسی شہادتیں سامنے آئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان، جنرل حمید اور میجر جنرل خداداد ذاتی طور پر بدکردار، شراب کے رسیا اور کرپٹ تھے۔ ان کمزوریوں کی بناء پر انہوں نے بزدلی، پیشہ وارانہ نااہلی اور فیصلوں سے گریز کا مظاہرہ کیا۔ کمیشن نے رپورٹ کیا کہ فوج کے اعلیٰ افسروں کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کا معیار اخلاقی اور پیشہ وارانہ لحاظ سے گر چکا ہے۔ اس نے عوام کو مایوس کیا جنہوں نے فوج کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔ جب ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا فوج کی اہلیت اور صلاحیت زوال کا شکار ہونے لگی اور یہ کمزوری جنرل یحییٰ کے دور میں ظاہر ہوئی۔ اسٹیبلشمینٹ اور ملٹری ہائی کمان دفاع، خارجہ، سفارت کاری اور سیاسی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی۔

رپورٹ میں بھٹو کے بارے میں تحریر کیا کہ اس نے چھ نکات پر عوامی مؤقف اختیار نہ کیا۔ اسے قومی

[40] حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ باب 60 پیرا 2

اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بھٹو کا اسمبلی کے باہر چھ نکات پر نظر ثانی کا مطالبہ پارلیمانی جمہوری اُصولوں کے منافی تھا۔ بھٹو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے پر شدید ردعمل کا درست اندازہ نہ کر سکا۔ [41] جنرل یحییٰ مطلق العنان حکمران تھے وہ صدر، کمانڈر انچیف اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اقتدار اور طاقت ان کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے اقتدار منتقل کرنے میں بلاجواز تاخیر کی لہٰذا سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے جنرل گل حسن کے خلاف مقدمہ چلانے کی سفارش کی تھی بھٹو نے اس کو آرمی چیف نامزد کر دیا۔

بھٹو نے جرنیلوں کے خلاف مقدمات چلانے کی بجائے جنرل یحییٰ، جنرل حمید، جنرل ایس جی ایم پیرزادہ، جنرل عمر، جنرل خداداد، جنرل کیانی اور جنرل مٹھہ ریٹائر کرنے پر اکتفا کیا۔ پاکستان بنگلہ دیش سے مطالبہ کر رہا تھا کہ فوجی افسروں کے خلاف جنگی جرائم کے تحت مقدمات نہ چلائے جائیں اس لیے پاکستان میں جرنیلوں کے خلاف مقدمات چلانا ممکن نہ تھا۔ بھٹو ایک قوم پرست لیڈر تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد قوم انتہائی مایوس اور غم سے نڈھال تھی۔ فوج کا مورال گر چکا تھا۔ فوجیوں کے خلاف مقدمات چلانے سے مایوسی اور بداعتمادی میں اضافہ ہونے کا اندیشہ تھا۔

ایک رپورٹ کے مطابق شملہ مذاکرات کے دوران وزیراعظم اندرا گاندھی نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ چند جرنیلوں کے خلاف وار کرائم ٹرائل ہونے دو مگر بھٹو نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تمام فوجی افسروں اور جوانوں کی باعزت واپسی پر زور دیا۔ بھٹو کے مخالفین کا خیال ہے کہ اگر فوجیوں کے خلاف مقدمات چلائے جاتے تو ان کا اپنا کردار بھی سامنے آتا لہٰذا انہوں نے مقدمات قائم کرنے سے گریز کیا۔

بھٹو اگر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے کچھ حصے کلاسیفائی کر کے باقی رپورٹ شائع کر دیتے تو پاکستان بعد میں رونما ہونے والے افسوسناک واقعات سے محفوظ رہتا۔ بھٹو نے پاکستان کے وقار کی خاطر نازک اور سنگین حالات کے پیش نظر رپورٹ شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جرنیلوں کا ٹرائل نہ کرنا اور رپورٹ کی اشاعت پر پابندی لگانا بھٹو کی ذاتی مصلحت پر مبنی فیصلہ تھا یا قومی مفاد کا تقاضہ تھا اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ بھٹو نے خواہشات یا حالات کے دباؤ میں جو فیصلہ کیا اس کی قیمت خود انہیں اپنی جان کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔

ذلت آمیز اور شرمناک شکست کے باوجود جنرل یحییٰ اقتدار چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ امریکہ میں حال ہی میں 1970ء کی دہائی کی خفیہ دستاویزات ظاہر کی گئی ہیں جن کے مطابق یحییٰ خان نے 11 اکتوبر 1971ء کو امریکی سفیر کو بتایا کہ وہ 20 دسمبر کو اپنا آئین دیں گے جسے جسٹس اے آر کارنیلس نے تیار کیا ہے۔ اس آئین کے کچھ حصے سرکاری نیوز ایجنسی اے پی پی کے ذریعے پریس کو ریلیز بھی کر دیئے

[41] حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ باب نمبر 6 پیرا 98 سے 101

گئے۔ 27 دسمبر 1971ء کو مغربی پاکستان کی قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ [42] امریکی صدر نکسن نے جنرل یحییٰ سے ذاتی خصوصی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ یہ تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ یحییٰ نے امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے لیے پاکستان کے راستے چین کا پہلا خفیہ دورہ کرنے کا اہتمام کیا۔ جنرل یحییٰ خان کو کن حالات اور واقعات کے دباؤ کے تحت اقتدار سے محروم ہونا پڑا اس کا ذکر اگلے باب کے ابتدائی صفحات میں شامل ہے۔ اصغر خان کے مطابق جنرل حمید خان جنرل یحییٰ سے خود اقتدار لینے کے لیے لابنگ کرتے رہے۔

ایم ایس کوریجو لکھتے ہیں۔

- Awami League's stand on 25 March 1971 was the same as it was in 1966. It refused to compromise even on half a point.
- Awami League wanted to form a confederation.
- Bhutto was within his constitutional obligations to seek negotiations before National Assembly session, to safeguard the interests of West Pakistan provinces and to point out the legal position regarding the allocation of central subjects and transfer of power.
- It was up to Yahya to accept or reject Bhutto's point of view, to accept Awami League's confederation proposal and safeguard the integrity of West Pakistan.
- It was entirely the general's choice to resolve the political crisis by political means or use force.

ترجمہ:

- عوامی لیگ کا 25 مارچ 1971 کا موقف وہی تھا جو 1966 میں تھا۔ اس نے آدھا نکتہ بھی ترک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
- عوامی لیگ کنفیڈریشن قائم کرنا چاہتی تھی۔
- بھٹو پر اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بندش تھی۔ وہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے قبل مفاہمت کی تلاش میں تھے تاکہ مغربی پاکستان کے صوبوں کے مفادات کا تحفظ کر سکیں اور انتقال اقتدار اور وفاق کے اختیارات کے لیے اپنا قانونی نقطۂ نظر بیان کر سکیں۔
- یہ یحییٰ کے اختیار میں تھا کہ وہ بھٹو کا نقطۂ نظر قبول یا مسترد کر کے عوامی لیگ کی کنفیڈریشن کی تجویز قبول کر لیتے اور مغربی پاکستان کی یک جہتی کا تحفظ کرتے۔
- یہ جنرل کے اپنے اختیار میں تھا کہ وہ سیاسی بحران سیاسی طریقے سے یا طاقت کے استعمال

[42] ڈان 29 جون 2005

سے حل کرتا۔ [43]

پاک بھارت جنگ میں 79,700 آرمی جوان اور 12,500 سویلین بھارت کے قیدی بنے۔ مشرقی پاکستان میں 1300 جوان اور مغربی پاکستان میں 1200 جوان شہید ہوئے۔ ان اعداد و شمار سے فوج کی پرفارمنس کا اندازہ ہوتا ہے۔ [44] امریکہ جس نے پاک فوج کو ٹریننگ دی تھی اور اسے اسلحہ فراہم کیا تھا دفاعی معاہدوں کے باوجود پاکستان کی مدد کو نہ آیا اور ملک کی سلامتی کا تحفظ نہ کر سکا۔

تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جب تک سیاست دان حکمران رہے وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے بقائے باہمی کا فارمولا تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے اور 1956ء کا آئین تیار کر لیا۔ ایوب خان نے یہ متفقہ فارمولا منسوخ کر دیا اور بنگالیوں کو دیوار کی جانب دھکیل دیا۔ ایک دوسرے جرنیل یحییٰ نے جنگ کو اختیار کر کے پاکستان کی وہ شاندار عمارت ہی ختم کر دی جس کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح نے جرنیلوں کو سیاست سے علیحدہ کر کے رکھی تھی۔ ایک بار جب جرنیل سیاست کی غلام گردشوں میں داخل ہوئے تو انہوں نے نکلنے سے انکار کر دیا جب تک کہ ان کو الگ ہونے پر مجبور نہ کر دیا گیا۔ [45]

تاریخ کا المیہ دیکھیے کہ ملک شکن جنرل یحییٰ خان کا انتقال ہوا تو اس کی نعش کو قومی پرچم میں لپیٹ کر اسے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

[43] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortunes" صفحہ 78
[44] جان ایچ گل "An Atlas of Pak India War 1971" صفحہ 65
[45] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortunes" صفحہ 87

باب 6

پاکستان کا پہلا عوامی اور جمہوری دور

سقوط ڈھاکہ نے پاکستان کے ہر شہری کو غم اور سوگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے جسم کا ایک بازو کٹ چکا تھا اور دوسرے بازو کے بارے میں خوف و ہراس پیدا ہو چکا تھا۔ سوگ اور ماتم کے اس دور میں بھی پاکستان کے جرنیل حکمران اقتدار پر قابض رہنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان 17 دسمبر 1971ء کو ایوان صدر گئے۔ جنرل یحییٰ ریڈیو پر قوم سے خطاب کی تیاری کر رہے تھے۔ جنرل عبدالحمید خان بھی موجود تھے۔ گل اور رحیم نے یحییٰ کو بتایا کہ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ انہیں اقتدار چھوڑنا پڑے گا۔ یحییٰ نے اس تجویز کی مزاحمت کی۔ جب گل اور رحیم نے دباؤ بڑھایا تو یحییٰ نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے فوج میں واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گل اور رحیم نے اس رائے سے شدید اختلاف کیا اور زور دے کر کہا کہ یحییٰ کو فوج اور حکومت دونوں سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ یحییٰ نے مجبور ہو کر تجویز پیش کی کہ گل حسن پاکستان کا صدر اور جنرل عبدالحمید خان کمانڈر انچیف بن جائیں۔ جنرل یحییٰ اقتدار پر فوج کا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جنرل حمید خان نے کہا کہ وہ جی ایچ کیو میں فوجی افسروں کا اجلاس بلانے کے بعد ہی کمانڈر انچیف کا منصب سنبھالنے کا فیصلہ کریں گے۔ [1]

بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی جو ان دنوں 'آئی ایس پی آر کے سربراہ تھے اپنی کتاب میں انتقال اقتدار کے بارے میں آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ سری کچھ اس طرح ہے:۔

''میں گل حسن کے گھر پر گیا تو وہاں پر ایئر مارشل رحیم اور پی آئی اے کے ایم ڈی شاکر اللہ درانی موجود تھے۔ وہ آنے والے 'باس' کا فیصلہ کر رہے تھے۔ رحیم اقتدار اصغر خان کے سپرد کرنا چاہتے تھے جب کہ گل حسن بھٹو کے حامی تھے۔ گل نے رحیم کو کہا کہ ایسے شخص کو وزیر اعظم کیسے بنایا جا سکتا جسے انتخابات میں ایک کارپورل (فوج میں جونیئر افسر) نے شکست دے دی۔ پی پی پی کے خورشید حسن میر نے راولپنڈی کے انتخابی حلقہ سے اصغر خان کو چالیس ہزار ووٹ کے فرق (margin) سے ہرا دیا تھا۔ خورشید حسن میر جنگ عظیم دوم کے دوران رائل انڈین فورس میں کارپورل (Corporal) تھے۔ گل نے اپنی تجویز پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

---

[1] حامد خان "Constitutional and Political History of Pakistan" صفحہ 433

"I am afraid we are left with no choice but to try this joker, Bhutto after all he is now the leader of majority party."❷

ترجمہ: مجھے ڈر ہے کہ ہمارے پاس (جوکر) بھٹو کو موقع دینے کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے آخر کار اب وہ اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہے۔ ❷

اس موقع پر شاکر اللہ درانی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ گل تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ بھٹو جس قسم کا انسان ہے وزیراعظم بننے کے بعد موقع ملتے ہی وہ تمہیں فکس اَپ (fix up) کر دے گا۔ میں (بریگیڈیئر صدیقی) نے بھی شاکر اللہ درانی کی تائید کی۔

میں 19 دسمبر کی صبح گل حسن کے گھر گیا تو اسے انتہائی شکستہ اور پریشان پایا۔ گل نے بتایا کہ کھاریاں میں 6 آرمڈ ڈویژن کے فوجی ہاتھوں میں اسلحہ لیے ڈویژنل کمانڈر کے خلاف غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ فوج کے اندر حالات بڑے کشیدہ اور ابتر ہو چکے ہیں شاید اس منصب پر میرا (گل) کا یہ آخری دن ہو۔

21 دسمبر کو میں نے سی جی ایس کو فون کیا۔ میجر جاوید ناصر نے بتایا کہ بھٹو پاکستان واپس پہنچ گئے ہیں۔ میں 'اولڈ مین' کے بارے میں پریشان ہوں، ایوان صدر میں جانشینی کے لیے جنگ ہو رہی ہے۔ اسی دوران ایک سرکلر موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی کہ چیف آف سٹاف جنرل حمید ایوب ہال میں لیفٹیننٹ کرنل اور ان سے اوپر کے عہدوں پر فائز فوجی افسروں سے خطاب کریں گے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک اور سرکلر آیا جس میں بتایا گیا کہ تمام موجود گیریژن افسر اجلاس میں شریک ہوں گے۔ میں 11.45 پر ایوب ہال پہنچ گیا۔ میجر جنرل خداداد (ایجوٹنٹ جنرل)، میجر جنرل عثمان مٹھہ (کوارٹر ماسٹر جنرل) اور لیفٹیننٹ جنرل خواجہ وصی الدین (ماسٹر جنرل آف آرڈی نینس) پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ گل حسن بھی بارہ بجے پہنچ گیا۔ وہ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جنرل حمید کا خطاب شکست خوردگی کی علامت تھا۔ اس نے کہا پاکستان انتہائی سنگین اور حساس بحران سے گزر رہا ہے۔ ہمیں دلیری کے ساتھ اس بحران کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہال میں موجود نوجوان فوجی افسروں کی ناراضگی اور غصہ سے بھری کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی لاوا پھٹ پڑے گا۔ جرنیل فوج سے کٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جب جنرل حمید نے کہا کہ صدر نے سیاسی حل کی پوری کوشش کی تو ہال سے شیم شیم (shame) کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ آخر کار جنرل حمید کو خطاب مختصر کر کے ہال سے جانا پڑا۔ وہ انتقال اقتدار سے پہلے فوجی افسروں کے موڈ کا اندازہ لگانا چاہتے تھے تا کہ یحییٰ خان کو کمانڈر انچیف برقرار رکھا جا سکے بصورت دیگر وہ خود یہ منصب سنبھال لیں۔'' ❸

پشاور میں عوام کے مشتعل ہجوم نے جنرل یحییٰ کے گھر کو نذر آتش کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد جرنیل کا

❷ پاکستان کے منتخب لیڈر بھٹو کے بارے میں جرنیل کے ریمارکس سے فوج کے سیاست دانوں کے بارے میں دلی ور باطنی تعصب کا اندازہ ہوتا ہے۔

❸ بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی "East Pakistan: The End Game" کتاب کے اقتباسات ڈان کے Books & Authors کے ایڈیشن 7 نومبر 2004 میں شائع ہوئے۔

نشہ اُترا۔ جماعت اسلامی نے جلوس کا رخ شراب خانوں کی جانب موڑ دیا اور عوام شراب کی بوتلیں توڑتے بھی رہے اور پیتے بھی رہے۔ جب جلوس یحییٰ کے گھر کے قریب پہنچا تو عوام نے گھر کے سارے ایئر کنڈیشن توڑ دیئے اور قالینوں کو باہر لا کر آگ لگا دی۔ راؤ رشید سابق آئی جی پنجاب ان دنوں انٹیلی جینس بیورو پشاور میں تعینات تھے اور یحییٰ خان کے ہمسائے میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے کیمرے سے یحییٰ کے جلتے ہوئے گھر اور سامان کی تصویریں بھی بنائیں۔ ❹ جنرل مٹھہ (کوارٹر ماسٹر جنرل) جنرل یحییٰ کا یار غار تھا۔ اس نے جنرل یحییٰ کے تحفظ کے لیے ایس ایس جی کے ایک دستے کو راولپنڈی مارچ کا حکم دیا۔ ایس ایس جی کے کمانڈر بریگیڈیئر غلام محمد ملک نے جنرل مٹھہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور جنرل گل حسن کو اطلاع کر دی۔ گل حسن نے بریگیڈیئر ملک کے فیصلے کو سراہا۔ ❺

بھٹو نیویارک میں سلامتی کونسل میں پاکستان کا دفاع کر رہے تھے۔ گل حسن نے ان کو واپس لانے کے لیے پی آئی اے کا طیارہ روانہ کیا تو بھٹو نے اپنے قابل اعتماد ساتھی غلام مصطفیٰ کھر کو فون کیا کہ وہ اپنے ذرائع سے معلوم کرے کہ کیا ان کی واپسی محفوظ ہے۔ کھر نے اوکے (OK) کا سگنل بھیج دیا اور بھٹو نے ایئر پورٹ سے سیدھا ایوان صدر پہنچ کر جنرل یحییٰ سے اقتدار لیا۔ بھٹو وقت کی ضرورت تھا۔ وہ جرأت مند، طاقت ور، پرجوش مقرر، دور بین اور تاریخ کا شعور رکھنے والا لیڈر تھا۔ ❻

صدر پاکستان کا منصب سنبھالنے کے بعد بھٹو نے پہلا فیصلہ لیتے ہوئے جنرل حمید خان کو ریٹائر کر دیا اور جنرل گل حسن کو نیا کمانڈر انچیف نامزد کر دیا۔ گل حسن نے اپنی یادداشتوں پر مبنی تصنیف میں لکھا ہے کہ بھٹو اپنے نشری خطاب میں نئے آرمی چیف کا اعلان کرنا چاہتا تھا جبکہ گل گریز کر رہا تھا۔ چالیس منٹ کی گفتگو کے بعد گل نے صدر کو بتایا کہ وہ چار شرائط پر آرمی چیف کا منصب قبول کرے گا۔ سی او ایس (COS) کا عہدہ لیفٹیننٹ جنرل کے رینک میں ہوگا اور فور سٹار جنرل کی پروموشن نہیں دی جائے گی۔ افواج پاکستان کو سرحدوں سے واپس بلایا جائے اور جنگی قیدیوں کو بھارت سے جتنی جلد ممکن ہو واپس لایا جائے۔ ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔ گل حسن کی چوتھی شرط یہ تھی کہ وزیراعظم اور اس کی کابینہ کے وزیر فوج کے اُمور میں مداخلت نہیں کریں گے۔ بھٹو نے مسکراتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اسی لیے میرا (گل حسن) کا اہم عہدے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ ❼

شرمناک جنگی شکست کے بعد بھی جرنیلوں کی آن بان اور شان میں فرق نہ آیا تھا۔ بھٹو ایک مقبول عوامی لیڈر تھے جرنیل انہیں اقتدار منتقل کرنے سے گریز کرتے رہے اور منتخب عوامی لیڈر کو دباؤ میں رکھنے

❹ راؤ رشید ''جو میں نے دیکھا'' صفحہ 71

❺ Brian Cloughley "A History of Pak Army" صفحہ 240

❻ روئیداد خان "Pakistan: A dream gone sour" صفحہ 61

❼ Brian Cloughley "A History of Pakistan Army" صفحہ 244

کے لیے اپنی شرائط پیش کرتے رہے۔ اس رویے سے جرنیلوں کے سقوط ڈھاکہ سے پہلے کے کردار اور حرکات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو جرنیل آدھا ملک گنوانے کے بعد بھی انتقال اقتدار کے لیے تیار نہ تھے، حالانکہ بھٹو کے ساتھ اسٹیبلشمینٹ کے روابط معاندانہ نہیں تھے، انہوں نے مجیب کو اقتدار سے محروم رکھنے کے لیے ہر تدبیر روا رکھی ہوگی۔

بھٹو اقتدار میں آنے کے بعد پاکستان کے صدر اور سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ جو لوگ بھٹو پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے کی وجہ سے تنقید کرتے ہیں وہ یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ملک کے دولخت ہونے کے بعد اور کوئی آئینی اور قانونی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ ہنگامی صورت حال میں یحیٰی خان وہی اختیارات منتقل کر سکتے تھے جنہیں وہ خود استعمال کر رہے تھے۔ آئین کی عدم موجودگی میں بھٹو کی مجبوری تھی کہ وہ عارضی طور پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات سنبھال لیں۔ بھٹو نے عبوری آئین بنتے ہی 21 اپریل 1972ء کو مارشل لاء کا عہدہ چھوڑ دیا اور مارشل لاء ختم کر دیا۔ 20 دسمبر 1971ء کی رات کو بھٹو نے قوم سے اپنے پہلے نشری خطاب میں کہا......:

''میں مارشل لاء کو ضرورت سے ایک دن بھی زیادہ جاری نہیں رکھوں گا بلکہ ضرورت سے ایک سیکنڈ زیادہ نہیں رکھوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری سوسائٹی کھل اُٹھے۔ میں چاہتا ہوں گھٹن ختم ہو۔ مہذب ملک اس طرح نہیں چلتے۔ سویلائزیشن کا مطلب جمہوریت اور سول حکومت ہوتی ہے۔ ہمیں جمہوری اداروں کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے ہیں کہ ایک عام آدمی، غریب آدمی، گلی میں مجھے کہہ سکے کہ جہنم میں جاؤ۔''

''ہم تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم نے ٹکڑے اکٹھے کرنے ہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ ہم نیا پاکستان بنائیں گے۔ ایک خوشحال اور ترقی پسند پاکستان۔ اب پاکستان میں استحصال نہیں ہوگا۔ قائداعظم کے خواب کا پاکستان۔ میرا یقین ہے نیا پاکستان تعمیر ہوگا۔ مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے...... جس طرح بھارت فتح کا جشن منا رہا ہے کاش آج میں زندہ نہ ہوتا مگر یہ انجام نہیں ہے یہ نئے پاکستان کا آغاز ہے...... میں اپنے رشتہ داروں کو اپنی پوزیشن سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے میرے کوئی بچے نہیں ہیں۔ پاکستان کے عوام میرا خاندان ہیں پاکستان کے عوام ہی میرے بچے ہیں۔'' [8]

پی پی پی، عوامی نیشنل پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ ہوا جس پر بھٹو، مفتی محمود اور ولی خان نے دستخط کیے۔ معاہدہ میں قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد، 14 اگست 1972ء تک مارشل لاء جاری رکھنے، دستور تشکیل دینے اور صوبائی گورنر نامزد کرنے کے اُمور طے پائے مگر سیاست دان اس سہ فریقی معاہدے کی روح کو برقرار نہ رکھ سکے۔ [9]

---

[8] زیڈ اے بھٹو "Speeches And Statements"

[9] کتابچہ سہ فریقی معاہدہ 6 مارچ 1972ء مطبوعہ فیروز سنز

بھٹو نے عوام کو مایوسی سے نکالنے اور فوج کے عزم (morale) کو بڑھانے کے لیے اپنے پہلے نشری خطاب میں جنرل یحیٰی خان، جنرل حمید خان، جنرل جی ایم پیرزادہ، جنرل عمر، جنرل خداداد خان، جنرل کیانی اور جنرل مٹھہ کو جبری ریٹائر کرنے کا اعلان کر دیا۔ چند دنوں کے بعد کئی دوسرے فوجی افسروں کو بھی فوج سے نکال دیا گیا۔ تاریخ کی اس پہلی چھانٹی سے اندازہ ہوتا ہے کہ فوج کس قدر بددل تھی اور حوصلہ ہار چکی تھی اور اس میں مزاحمت کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان کی صورت حال بڑی نازک، حساس اور سنگین تھی۔ عائشہ جلال کے مطابق:

"Whoever was daring enough to pick up the gauntlet thrown by a disgraced military regime had to shoulder awesome set of responsibilities. Rebuilding a state apparatus is quite as difficult as creating one a new, not least because of tenacious resistance from the institutional kingmakers of yesteryears. Equally formidable was the need to restore the morale of a people shocked at being defeated by an enemy whom they have always regarded as the biggest threat to their security". [10]

ترجمہ: ''جو کوئی بھی رسوا فوجی انتظامیہ کا پھینکا ہوا فولادی دستانہ اُٹھانے کی جرأت کر رہا تھا اسے تکلیف دہ ذمہ داریوں کا بوجھ برداشت کرنا تھا۔ ریاست کے نظام کی تعمیر تو اسی قدر مشکل ہوتی ہے جیسا کہ ایک نئی ریاست تخلیق کرنا۔ صرف ماضی کے مسلمہ بادشاہ گر کی محکم مزاحمت کی وجہ سے نہیں بلکہ اتنا ہی مشکل عوام کے اعتماد کو بحال کرنا تھا جو ایسے دشمن کے ہاتھوں شکست کی وجہ سے سکتے کے عالم میں تھے جسے وہ ہمیشہ اپنی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔'' [10]

ڈاکٹر مبشر حسن نے مصنف کو بتایا کہ ایک دن انہوں نے ایوان صدر میں بھٹو کا ٹیلی فون چیک کیا تو اس میں ٹیپ کرنے کا آلہ لگا ہوا تھا۔ جب گھر کے دوسرے ٹیلی فون چیک کیے گئے تو سب میں ٹیپ کرنے والے آلے نصب تھے۔ بھٹو نے کہا باسٹرڈ میرے ٹیلی فون بھی ٹیپ کر رہے ہیں۔ بھٹو ایک عوامی وزیراعظم تھے۔ فوج شکست خوردہ تھی مگر ملک دولخت کرانے کے باوجود فوج نے اپنی حکمت عملی تبدیل نہ کی اور خفیہ ایجنسیاں وزیراعظم بھٹو کی نجی گفتگو بھی ٹیپ کرتی رہیں۔

سنگین اور نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منتخب عوامی حکومت کو فوج کی جانب سے گرم جوش تعاون کی ضرورت تھی مگر ''کنگ میکرز'' نے تعاون فراہم کرنے سے گریز کیا۔ بھٹو کابینہ کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کے مطابق لاہور میں پولیس کی ہڑتال کے دوران آرمی چیف نے سول حکومت کی اعانت سے

---

[10] عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 313

انکار کیا۔ ایک اور موقع پر جب پنجاب اور سندھ کی سرحد پر قبائلی عوام سوئی گیس فیلڈز کا محاصرہ کر رہے تھے آرمی چیف نے گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر کو فوج کا ہیلی کاپٹر استعمال کرنے کی اجازت نہ دی اور کھر کو سڑک کے راستے پولیس کے ہمراہ موقع پر جانا پڑا۔ آرمی اور فضائیہ کے چیفس کی جانب سے بھٹو اور اس کی حکومت کے بارے میں توہین آمیز ریمارکس کی خفیہ رپورٹیں بھی مل رہی تھیں۔ [11]

چیف آف آرمی سٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان کے بارے میں یہ اطلاعات بھی تھیں کہ وہ حمود الرحمٰن کمیشن کی انکوائری میں مداخلت کر رہے ہیں۔ [12] گل حسن اور رحیم کو پراسرار انداز میں ایوان صدر بلا کر ان سے استعفیٰ لے لیا گیا۔ دونوں چند روز گورنر ہاؤس پنجاب میں ''مہمان'' رہے اور انہیں سفیر نامزد کر کے یونان اور سپین روانہ کر دیا گیا۔ [13] جنرل ٹکا خان نئے آرمی چیف اور ظفر چوہدری ایئر مارشل نامزد ہوئے۔ بھٹو نے 4 مارچ 1972ء کو اپنے نشری خطاب میں پاکستان کے عوام کو بتایا:۔

''پاکستان کے عوام اور افواج پاکستان کا عزم ہے کہ فوج سے بونا پارٹ ازم کے اثرات کو ختم کیا جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کی سیاسی زندگی پھر کبھی ان اثرات سے آلودہ نہ ہو۔ بونا پارٹ ازم کا مطلب یہ ہے کہ پروفیشنل سولجرز پروفیشنل سیاست دان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بونا پارٹ ازم کا لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ 1954ء سے 1958ء تک کھلے عام یہ ہوتا رہا ہے کہ کچھ پروفیشنل جرنیل سیاست دان بن گئے۔ سیاسی پروفیشن کے طور پر نہیں بلکہ لوٹ مار کرنے کے لیے سیاست میں داخل ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بونا پارٹ ازم کے اثرات پاکستان کی سیاسی و سماجی زندگی میں شامل ہو گئے اور معاشرے کی ساخت کو تباہ کر دیا۔ جس طرح اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بونا پارٹ ازم کی وجہ سے یورپ تباہ ہوا تھا۔ فوج اور عوام کے مفاد میں بونا پارٹ ازم کے اثرات کو جڑ سے ختم کرنا ضروری ہے۔'' [14]

گل حسن اور رحیم جمہوری حکومت کا اقتدار ختم کرنے کی سازش کر رہے تھے بھٹو نے امریکی سفیر کو کہا۔

"Bhutto Said, Gul Hasan and Rahim had been overheard at a private meeting saying they had anticipated that Military might have to wait two years to take over rule again in Pakistan, but the way, the situation was developing they thought the Military would be in charge within six months. Bhutto said be could not stand fo such behavior by his Military leaders and they had therefore been replaced." [14a]

---

[11] ڈاکٹر مبشر حسن "The Mirage of Power" صفحہ 80

[12] ڈان کراچی، نوائے وقت لاہور 4 مارچ 1972

[13] Brian Cloughley "A History of the Pakistan Army" صفحہ 247

[14] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 196

ترجمہ: ''بھٹو نے کہا کہ گل حسن اور رحیم کو ایک نجی محفل میں یہ کہتے سنا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ فوج کو پاکستان کا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دو سال انتظار کرنا پڑے گا مگر حالات جس انداز سے تبدیل ہو رہے ہیں ان کے خیال میں فوج چھ ماہ کے اندر چارج سنبھال لے گی۔ بھٹو نے کہا کہ وہ اپنے فوجی لیڈروں کے اس رویے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کو تبدیل کر دیا گیا'' [14a]

بھٹو نے ایک بیان میں روایتی فوج کی بجائے ''پیپلز آرمی'' کا تصور پیش کیا۔ [15] یہ ایک اچھا آئیڈیا تھا لیکن بھٹو کو فوج اور اپوزیشن کی جانب سے حمایت حاصل نہ ہو سکی اور یہ آئیڈیا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اگر بھٹو جرأت کا مظاہرہ کرتے اور عوامی دباؤ سے کام لے کر پیپلز آرمی بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو فوج سے بونا پارٹ ازم کے اثرات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے۔ بھٹو نے مشرقی پاکستان کے المیہ کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن قائم کیا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ باب ''ملک توڑنے والا جرنیل'' میں کیا جا چکا ہے۔ بھٹو نے اپنی کتاب (اگر مجھے قتل کیا گیا) میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے بارے میں تحریر کیا:۔

''قومی مفادات کبھی ذاتی انتقام کی پیش رفت سے حاصل نہیں کیئے جا سکتے۔ میں نے ہمیشہ برتر و اعلیٰ قومی مفادات کے لیے کام کیا ہے۔ مسلح افواج کی شہرت اور اس کے وقار کو بلند کرنے کے لئے میں نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔ اس وقت بھی حمود الرحمٰن رپورٹ پر میری کھلی کومنٹری (commentary) مسلح افواج کے نام کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن انتہائی اشتعال انگیزی، ترغیب اور اس غیر انسانی رویے کے باوجود، جو میرے ساتھ روا رکھا گیا میں اس سے اجتناب کروں گا۔ قرطاس ابیض میں حمود الرحمٰن رپورٹ کے دو اہم حوالے دیئے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح خوبی کو بدی میں تبدیل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی ہے۔ وہ تمام سینئر فوجی افسر، جنہوں نے حمود الرحمٰن رپورٹ کو پڑھا، ان کی متفقہ رائے تھی کہ رپورٹ کو شائع نہ کیا جائے۔ جب بھی میں اس رپورٹ کی اشاعت پر غور کرنے کے لئے کوئی میٹنگ رکھتا، مسلح افواج کا ہر سینئر افسر بڑی شدت سے اس خیال کی مخالفت کرتا ان کی خواہشوں اور فوج کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے عوام اور حزب اختلاف کے شدید ترین دباؤ کے باوجود میں نے اس رپورٹ کو شائع نہ کیا۔ مسلح افواج کی عزت اور ان کے نام کے تحفظ کے لئے میری ذات پر شدید ترین حملے ہوئے اور مجھے اس طرح اس کا صلہ دیا گیا، فوجی حکومت کو برسر اقتدار آئے ایک سال اور ایک ماہ ہو چکا ہے۔ اس نے ہر طرح کی غلاظت اور جھوٹ کو اس لئے شائع کیا کہ مجھے ان میں ملوث کر کے عوام کی نفرت کا رُخ میری طرف پھیر دیا جائے۔ فوجی حکومت حمود الرحمٰن رپورٹ کی بندوق بھی چلا دیتی اگر یہ ان کے شرمناک مقاصد

[14a] روئیداد خان American Papers صفحہ 804

[15] پاکستان ٹائمز 29 مارچ 1972

کو پورا کرتی اور میرے خلاف استعمال کی جاسکتی"۔ [16]

بھٹو تاریخ شناس تھے انہیں پاکستان کی سیاسی تاریخ کی فوجی مداخلتوں کا گہرا احساس تھا۔ بھٹو نے مستقبل میں فوجی مداخلت کو روکنے کے لیے فوج کے سٹرکچر میں تبدیلیاں کیں اور 1973ء کے آئین میں آئین، جمہوریت اور سیاست کو مکمل تحفظ فراہم کیا۔ فوج میں ''کمانڈر انچیف'' کا منصب ختم کر کے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ تخلیق کیا گیا۔ تمام سروس چیفس (بری، بحری، فضائیہ) کو جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے کنٹرول میں لایا گیا۔ اس کا مقصد افواج پاکستان پر بری فوج کی بالادستی کو ختم کر کے مشترکہ کمان کا سسٹم متعارف کرانا تھا۔ ان تبدیلیوں کا مقصد تینوں افواج کو مربوط کرنا اور انہیں منتخب سول حکومت کے تابع کرنا تھا۔ بھٹو نے پہلی بار برطانوی سٹرکچر کو تبدیل کر کے اسے پاکستانی بنایا۔ چیف آف سٹاف کی مدت ملازمت پہلے چار سال اور بعد میں تین سال مقرر کی گئی۔ دفاعی نظام کو مربوط بنانے کے لیے چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا عہدہ تشکیل دیا گیا۔ جنرل محمد شریف یکم مارچ 1976ء کو پہلے چیئرمین نامزد ہوئے۔ ہائر ڈیفنس آرگنائزیشن کے بارے میں وائٹ پیپر میں شامل سفارشات کی روشنی میں نیشنل ڈیفنس کی ذمہ داری وزیراعظم کو سونپی گئی جس کی معاونت کیبنٹ کی ڈیفنس کمیٹی کرتی ہے۔ 1974ء میں بحریہ کا ہیڈکوارٹر بھی اسلام آباد منتقل کیا گیا تاکہ بری، فضائیہ اور بحریہ کا رابطہ بہتر، فعال اور منظم ہوسکے۔

فوج کا آئین میں کردار واضح الفاظ میں متعین کیا گیا۔ 1973 کے آئین میں درج ہے:۔

"Defend Pakistan against external aggression or threat of war and subject to law, act in aid of civil power when called upon to do so." [17]

ترجمہ: ''مسلح افواج وفاقی حکومت کی ہدایت کے تحت بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی اور قانون کے تابع سول حکام کی امداد میں، جب ایسا کرنے کے لیے طلب کی جائیں کام کریں گی۔'' [17]

آئین کو توڑنے کی کوشش کو بغاوت قرار دیا گیا۔ آئین کے آرٹیکل نمبر 6 میں درج ہے۔

"Any person who abrogates or attempts or conspires to abrogate, subverts or conspires to subvert the constitution by use of force or show of force or by other the unconstitutional means shall be guilty of high treason. (Clause 1)

Any person aiding and abetting the acts mentioned in Clause (1) shall likewise be guilty to high treason. (Clause 2) [18]

ترجمہ: ''کوئی شخص جو طاقت کے استعمال یا طاقت سے یا دیگر غیر آئینی ذرائع سے دستور کی تنسیخ

---

[16] ذوالفقار علی بھٹو ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' (کلاسیک لاہور) صفحہ 162

[17] پاکستان کا آئین 1973 آرٹیکل 245

کرے یا تنسیخ کرنے کی سعی یا سازش کرے تخریب کرے یا تخریب کرنے کی سعی یا سازش کرے سنگین غداری کا مجرم ہوگا۔ (شق نمبر 1)

کوئی شخص جو شق نمبر (1) میں مذکور افعال میں مدد دے گا یا معاونت کرے گا اسی طرح سنگین غداری کا مرتکب ہوگا۔ [18]

1973ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کے تحت آئین کی منسوخی کی سزا موت مقرر کی گئی۔ [19]

1973ء کے آئین کے تیسرے شیڈول میں فوجی افسروں کے لیے ایک حلف شامل کیا گیا۔

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر صدق دل سے حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی حمایت کروں گا جو عوام کی خواہشات کا مظہر ہے اور یہ کہ میں اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول نہیں کروں گا اور یہ کہ میں مقتضیات قانون کے مطابق اور اس کے تحت پاکستان کی بری فوج (یا بحری یا فضائی فوج) میں پاکستان کی خدمت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ انجام دوں گا۔ اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔''

بھٹو چاہتے تھے کہ فوج کو سول اُمور سے الگ تھلگ رکھا جائے اور امن و امان (law and order) کے لیے فوج کی اعانت کی ضرورت نہ پڑے۔ انہوں نے پولیس کے ادارے کو اَپ گریڈ اور فعال بنانے کے لیے وسائل فراہم کیے۔ وفاقی سطح پر ایف آئی اے کا ادارہ قائم کیا۔ فیڈرل سکیورٹی فورس (FSF) کے نام سے سکیورٹی اور امن کے قیام کے لیے وفاقی ادارہ قائم کیا۔ ایف ایس ایف کو جدید اسلحہ سے لیس کیا گیا۔ بھٹو کی بدقسمتی ایف ایس ایف کا سربراہ مسعود محمود ہی ان کے خلاف مقدمہ قتل میں سلطانی گواہ بنا۔ جب بھٹو نے ایک سینئر لیفٹیننٹ جنرل سے نیم فوجی فیڈرل سکیورٹی فورس کا کنٹرول سنبھالنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

''میں نے مسٹر بھٹو کو بتا دیا کہ ہمارے بہت سے حکمرانوں نے ڈنڈے کے زور پر حکومت کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا اور مجھے بتایا کہ وہ اسے ڈنڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں پیشہ ور سپاہی ہوں میں ایسے کام نہیں کرتا یعنی اخبارات اور مخالف جماعتوں سے نمٹنا۔ میں نے انہیں متنبہ کیا کہ آپ (بھٹو) ڈنڈا بار بار استعمال کریں گے تو ڈنڈا خود اقتدار سنبھال لے گا یہ ہمیشہ سے ڈنڈے کی تاریخ رہی ہے۔'' [20]

بھٹو ایک محب الوطن اور قوم پرست رہنما تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد انہیں فوج کا سائز اور اخراجات کم کرنے چاہئیں تھے مگر قوم پرستی کے جذبے کے تحت انہوں نے فوج کا سائز بھی بڑا کیا اور

---

[18] پاکستان کا آئین 1973ء آرٹیکل نمبر 6

[19] نوائے وقت 15 ستمبر 1973

[20] سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 48

دفاعی اخراجات میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔ 1972ء میں فوج کی تعداد 2,78,000 اور دفاعی اخراجات 1969ء میں 350 ملین ڈالر تھے۔ 1976ء تک فوج کی تعداد چار لاکھ ہوگئی اور 1975ء تک دفاعی اخراجات 569 ملین ڈالر ہوگئے۔ [21] 1974ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے نے بھی بھٹو کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے دفاع پر خصوصی توجہ دی اور اولین فرصت میں ایٹمی ٹیکنالوجی کی بنیاد بھی رکھ دی۔ وزارت دفاع میں دفاعی پروڈکشن کا علیحدہ ڈویژن قائم کیا گیا۔ فوجی افسروں اور جوانوں کی تنخواہوں اور مراعات میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ گدوار، سنجوال اور حویلیاں میں تین نئی آرڈیننس فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ مشین ٹول فیکٹری لانڈھی (کراچی) اور ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا نے فوج کو سپلائی شروع کر دی۔ 1973ء میں روس کے تعاون سے پاکستان کی پہلی سٹیل ملز کا قیام عمل میں آیا۔ فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کیا گیا۔

سول بیوروکریسی میں بھی سکریننگ کی گئی اور اُصول وضابطوں کا لحاظ رکھے بغیر 1300 سول سرونٹس کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ ''نوکر شاہی'' کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کے لیے سروس سٹرکچر میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

جنرل ایوب ایٹمی ٹیکنالوجی کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نیوکلیئر پروگرام شروع کرنے سے امریکہ سے تعلقات کشیدہ ہوجائیں گے۔ بھٹو نے امریکی وزیر خارجہ کسنجر کی دھمکی (عبرت ناک مثال بنانے کی) کے باوجود نیوکلیئر پروگرام شروع کیا۔

1974ء میں بھٹو نے ملتان میں ایک محدود میٹنگ میں کہا کہ پاکستانی قوم گھاس کھا کر گزارہ کرے گی مگر ایٹمی صلاحیت ضرور حاصل کرے گی۔ جنرل جہانداد خان کے بقول بھٹو نے ڈاکٹر قدیر خان کو ہالینڈ سے بلایا اور اسے کہا۔

''میں تمہاری پاکستان کے ساتھ محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں کے آر ایل پراجیکٹ کا انچارج بنانے کا فیصلہ کیا ہے میں تمہارے کام اور رزلٹ سے تمہارا جائزہ لوں گا اور تمہارے پراجیکٹ کے لیے میری مکمل سپورٹ حاصل ہوگی'' [22]

سٹیفن کوہن اپنی تازہ تصنیف میں بھٹو اور نیوکلیئر پروگرام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"The covert nuclear programme also partly stemmed from domestic political calculations. Bhutto had earlier called for an 'Islamic Bomb' and had broken with Ayub on the issue. The latter had opposed nuclear weapons on the grounds that

[21] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 215
عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 314
[22] لیفٹیننٹ جنرل جہاں داد خان "Pakistan Leadership Challenges"

they would alienate Pakistan's major ally, the United States, but Bhutto saw a bomb as a device to erode the army's central military role and increase Pakistan's international freedom of movement. The army had no technical capability to produce a nuclear weapon, so the programme would have to be run by civilians. Bhutto negotiated military and nuclear agreements with Beijing, turned to Libya for financial support (the Libyan leadership was then shopping for a shortcut to nuclear weapons), and approved A.Q. Khan's scheme to steal the plans for an enrichment facility and build a uranium device. None of this was widely known until several years after Bhutto's death, and it was one of the many ironies of his life that the programme, originally designed to undercut the central role of the army, came under its control." [23]

ترجمہ: ''خفیہ نیوکلیئر پروگرام ایک حد تک داخلی سیاسی پالیسیوں سے جڑا ہوا تھا۔ بھٹو نے پہلے بھی ''اسلامی بم'' پر زور دیا تھا اور انہوں نے ایوب خان سے اس مسئلہ پر تعلقات توڑ لیے تھے۔ ایوب نے ایٹمی ہتھیاروں کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ پاکستان کے اپنے بڑے اتحادی امریکہ سے تعلقات خراب ہوجائیں گے مگر بھٹو بم کو ایک ایسے ہتھیار کے طور پر دیکھ رہے تھے جس سے آرمی کا مرکزی رول ختم ہوجاتا تھا اور پاکستان کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں اضافہ ہوجاتا۔ فوج کے پاس ایٹمی ہتھیار بنانے کی تکنیکی صلاحیت نہیں تھی لہٰذا ایٹمی پروگرام سویلین نے چلانا تھا۔ بھٹو نے بیجنگ (چین) سے فوجی اور نیوکلیئر معاہدے کیے، لیبیا سے مالی تعاون حاصل کیا۔ (لیبیا کی قیادت اُس وقت نیوکلیئر ہتھیاروں کے لیے مختصر راستہ تلاش کر رہی تھی) اس نے اے کیو خان کا یورینیم کی افزودگی کی ٹیکنالوجی چرانے اور یورینیم ہتھیار بنانے کا منصوبہ قبول کرلیا۔ بھٹو کی موت سے کئی سالوں بعد تک اس منصوبے کا کسی کو علم نہ ہوا اور یہ بھٹو کی بڑی بدقسمتی تھی کہ جس پروگرام کو اس نے فوج کی مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے شروع کیا وہ فوج کے کنٹرول میں چلا گیا۔ [23]

بھٹو نے طاقتور وزیروں اور بیوروکریٹس کی مخالفت کے باوجود ایٹمی ٹیکنالوجی پر خصوصی توجہ دی اور امریکہ کی دھمکی کے باوجود یہ منصوبہ ترک نہ کیا اور 1977ء تک اس منصوبہ پر اس قدر پیش رفت ہوگئی کہ اس کے بعد کسی بھی حکومت کے لئے پیچھے ہٹنا ممکن نہ رہا۔

بھٹو نے ناسازگار حالات کے باوجود بہترین سفارت کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندرا گاندھی کے

[23] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 140

ساتھ کسی شرط کے بغیر مساوی بنیاد پر شملہ معاہدہ کیا اور پاک فوج کے نوے ہزار نوجوان بھارت کی قید سے رہا کرائے اور ارض پاک کا 5139 مربع میل علاقہ واگزار کرایا۔ بنگلہ دیش 195 فوجی افسروں کے خلاف جنگی قوانین کے تحت مقدمات چلانے کا پرزور مطالبہ کر رہا تھا۔ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے بھی بھٹو کو جرنیلوں پر مقدمہ چلانے کا مشورہ دیا مگر بھٹو نے اپنے وطن سے سچی محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کے تمام قیدیوں کی باعزت واپسی پر زور دیا اور اپنے مؤقف پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہے اور سول و فوجی قیدیوں کی بلاشرط رہائی میں کامیاب ہوئے۔ بھٹو فوج کے سلسلے میں چیکس اینڈ بیلنس کا نظام وضع نہ کر سکے۔ انہیں فوج کو پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ بنانا چاہیئے تھا۔ [44]

بھٹو نے موت کی کوٹھڑی میں اپنی زندگی کی آخری کتاب تحریر کی جو دراصل ان الزامات کا جواب نامہ تھی جو ضیاء حکومت نے بھٹو کے خلاف وائٹ پیپر میں لگائے تھے اور جن کا مقصد بھٹو کی کردار کشی تھا۔ بھٹو کی زندگی کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ تاریخ میں زندہ رہیں۔ لہٰذا انہوں نے ریکارڈ کو درست رکھنے کے لیے اپنی کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں حکومتی وائٹ پیپر کا مدلل جواب دیا۔ فوج کے سیاسی کردار کے بارے میں چند اقتباسات درج کیۓ جاتے ہیں۔ بھٹو لکھتے ہیں:۔

''فوج نے کھلے عام 1954ء میں ایک سیاسی قوت بننے کا آغاز کر دیا تھا اس وقت سے اس کا کردار کم نہیں وسیع ہوا ہے۔ 1969ء میں فوج مارشل لاء کی صورت میں پاکستان کی حکمران تھی۔ دسمبر 1970ء کے انتخابات اس لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت منعقد ہوئے جو فوج نے بنایا۔ فوج اپنی گردن تک سیاست میں ملوث ہو چکی تھی'' [45]

''کیا میں نے فوج کو اس طرح ملیامیٹ کرنے کی پوری کوشش کی کہ میں نوے ہزار جنگی قیدیوں کو باوقار انداز میں واپس لے آیا؛ دس برسوں سے امریکہ نے اسلحے کی سپلائی پر جو پابندی لگا رکھی تھی، کیا جنرل ضیاء الحق نے اسے اُٹھوایا؟ کیا اس نے چین سے ہتھیار حاصل کیۓ؟ کیا اس نے ڈیڑھ ملین ڈالر سے زیادہ ہتھیاروں پر صرف کیۓ؟ کیا اس نے بحریہ کو جدید تر بنایا، لڑاکا طیارے فضائی فوج کو اور تینوں سروسز کو میزائل دیئے؟ کیا اس نے ڈیفنس سروسز کی تنظیم نو کی اور دفاعی پیداوار کی وزارت قائم کی؟ کیا اس نے دفاعی اشتراک کے معاہدے مسلم ممالک سے کیۓ؟ کیا اُس نے نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ تکمیل تک پہنچایا۔ اگرچہ اُس نے واشنگٹن پوسٹ کے ایک نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اسے ''میرا پلانٹ'' کہا ہے؟ اگر میں نے فوج کو ملیامیٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تو اس نے ساڑھے پانچ سال تک میرے ماتحت ملازمت کیوں کی اور اس نے چیف آف سٹاف کا عہدہ کیوں قبول کر لیا؟'' [46]

---

[44] عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 80

[45] زیڈ اے بھٹو ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' (کلاسیک لاہور) صفحہ 136

[46] زیڈ اے بھٹو ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' (کلاسیک لاہور) صفحہ 137

''لیکن آیئے اس موضوع پر زیادہ بات نہ کریں کیونکہ انتخابات ایک سیاسی عمل ہوتا ہے اور جنرل کو اس کی لاعلمی پر معاف کیا جاسکتا ہے لیکن اگر میں یحییٰ خان کے زمانے سے فوج کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں تو یہ ایک سپاہی کے لئے خاصا لمبا وقت ہے کہ وہ اس کھیل کو دیکھ سکے۔ آخر جنرل ضیاء الحق نے مجھے اتنے شاندار خطیبانہ خراج تحسین 'پاکستان کا نجات دہندہ، مسلح افواج کا معمار' کیوں پیش کیا۔ اپریل 1976 میں کوئٹہ میں کمانڈ اور سٹاف کالج کوئٹہ نے میرے اعزاز میں ڈنر دیا۔ جس میں جنرل ضیاء نے کہا اور یہ اس کے اپنے ہی الفاظ ہیں۔

'ہم میں سے وہ جو حقائق اور اعداد و شمار سے باخبر ہیں یقینی طور پر جانتے ہیں کہ پاکستان فوج پر جو زبردست توجہ 1971ء سے اب تک دی گئی ہے اس کی مثال 1971ء سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی'۔

'اس کے ساتھ، سر، میں ذاتی طور پر اور فوج کی طرف سے اس سے واضح اور روشن حقیقت آپ کو پیش نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے شاید ایک دن، اللہ کے فضل سے، جب آپ بھی ہم میں موجود ہوں گے پاکستان کی یہ افواج ثابت کریں گی کہ آپ نے اس پر جو توجہ اور شفقت فرمائی ہے، بے کار نہیں گئی'۔

اپنے اس قصیدے کا چمکدار اختتام اس نے یوں کیا۔ 'میں آپ کو مؤدب اور بہت سادہ الفاظ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں، سر، جو کچھ آپ کر رہے ہیں اور جو کچھ آپ نے ہمارے لئے بطور خاص کیا ہے'۔ [47]

''آج کل ہمیں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر تخلیق ہوا تھا۔ یہ درست ہے۔ لیکن پاکستان کس نے تخلیق کیا؟ مسلمان عوام، قائداعظم کی پختہ اور عظیم عوامی قیادت میں جدوجہد کرنے والوں نے، نہ کہ جرنیلوں کے ایک ٹولے نے پاکستان تخلیق کیا۔ یہ ملک مسلمانوں کی عظیم تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا نہ کہ نصف شب حکومت کا جبری تختہ اُلٹنے سے۔ یہ مسلم آبادی تھی نہ کہ فوجی جرنیل جنہوں نے پاکستان تخلیق کیا۔ یہ ملک عوام نے بنایا اور اس کی آزادی کو صرف عوام کے منتخب رہنماؤں کے ذریعے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ صرف وہی جنہوں نے اسلام کے نام پر پاکستان بنایا وہی اپنے منتخب نمائندوں کو یہ حکم دے سکتے ہیں کہ کس طرح اس نام کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک غاصب اور ایک فوجی ٹولے کو ایسا کوئی اعتماد و اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس کام کی تکمیل کر سکے۔ نہ ہی غاصب اور اس کا فوجی ٹولہ عوام کے ذریعے اقتدار میں آئے ہیں کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ اس ملک کا نظم و نسق اسلام کے نام پر چلایا جائے گا۔ اس کی تشریح اجتماعی طور پر پارلیمنٹ میں ہونی چاہیئے۔ اس کا فیصلہ کوئی فرد یا گروہ نہیں کر سکتا جن کے ہاتھ میں بندوقیں ہوں۔ اسلام کا نام کسی بندوق یا اس کی نالی سے باہر نہیں آیا، میں اس پر مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کے عوام کسی غیر ملکی تسلط و مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے اور انہی بنیادوں، اسی منطق کے تحت پاکستان کے

---

[47] زیڈ اے بھٹو ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' (کلاسیک لاہور) صفحہ 138

عوام اندرونی سازش کو بھی قبول نہیں کریں گے۔ یہ دونوں سازشیں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں۔ اگر ہمارے عوام نے بے بسی سے اندرونی سازش کے آگے سر جھکا دیا تو وہ بیرونی سازش کے سامنے بھی جھک جائیں گے۔ یہ اس لئے ہے کہ غیر ملکی سازش کی طاقت اور اختیار اندرونی سازش کے مقابلے میں بڑی ہے۔ اگر لوگ کمزور قوت سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ قوی طاقت کے سامنے مزاحمت کر سکیں۔ اندرونی سازش کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بیرونی سازش کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ پاکستان کے عوام ان دونوں میں سے کسی کو بھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ ان دونوں سازشوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے"۔

"پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک اسلامی وفاقی جمہوریہ کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پہلی فوجی بغاوت کی کوشش جنرل محمد اکبر خان نے 1951ء میں کی تھی، پاکستان کی تخلیق کے صرف تین برس بعد۔ دوسری فوجی بغاوت اکتوبر 1954ء میں ہوئی۔ جب گورنر غلام محمد نے پاکستان کی خود مختار آئین ساز اسمبلی توڑ دی۔ اگر پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کی مکمل پشت پناہی نہ ہوتی تو یہ غیر آئینی اور غیر اخلاقی کارروائی باثمر نہ ہو سکتی تھی۔ اس مضبوط و توانا تعاون اور مدد کے بغیر غلام محمد ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور تیسری ظاہری فوجی بغاوت اکتوبر 1955ء میں ہوئی جب مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں صوبوں کی خود مختاری ختم کر کے مکمل طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنا دیا گیا۔ یہ کام انہی فوجیوں نے وہی طاقت استعمال کر کے کیا تھا، جنہوں نے ایک سال پہلے دستور ساز اسمبلی کو ختم کیا تھا۔"

ایوب دور میں بھٹو نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے جو خارجہ پالیسی وضع کی وہ امریکہ نواز نہیں تھی۔ وہ پاک چین دوستی کے بانی تھے۔ اپنے دور اقتدار میں انہوں نے پاکستان کو دولت مشترکہ اور سیٹو سے نکال کر لندن اور واشنگٹن کو ناراض کیا جو پاکستان میں سول اور ملٹری اسٹیبلشمینٹ کے سرپرست تھے۔ مارچ 1973ء میں فضائیہ کے چودہ اور بری فوج کے اکیس افسروں کو حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان میں دو گروپ کیپٹن، ایک ریٹائرڈ کرنل عبدالعلیم آفریدی، ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر ایف بی علی، ایک حاضر سروس بریگیڈیئر شامل تھے۔ ان کا پروگرام فوج اور حکومت کی اعلیٰ قیادت کو گرفتار کر کے حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ ان افسروں کا کورٹ مارشل ہوا اور انہیں پانچ سے دس سال لے کر عمر قید تک کی سزائیں دی گئیں اور ان کی پروموشن پر پابندی لگائی گئی۔

زیڈ اے بھٹو "اگر مجھے قتل کیا گیا" (کلاسیک لاہور) صفحہ 140

زیڈ اے بھٹو "اگر مجھے قتل کیا گیا" (کلاسیک لاہور) صفحہ 145

عائشہ جلال "The State of Martial Rule" صفحہ 315

ڈان 13 مئی 1973

میجر جنرل ضیاء الحق نے خصوصی فوجی عدالت میں مقدمات کی سماعت کی اور باقاعدگی کے ساتھ کارروائی کی رپورٹ ذاتی طور پر بھٹو کو دیتے رہے۔ ایئر مارشل ظفر چوہدری نے چودہ افسروں کو ریٹائر کر دیا جبکہ فوجی عدالت نے ایک ملزم کے خلاف کیس ختم کر دیا تھا اور 9 کو بے گناہ قرار دیا تھا۔ وفاقی حکومت نے ایئر مارشل ظفر چوہدری کے فیصلے کو تبدیل کرتے ہوئے سات افسروں کی ریٹائرمنٹ کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ ایئر مارشل ظفر چوہدری ردعمل کے طور پر مستعفی ہو گئے۔ اس کیس میں ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آئی کہ اس سازش میں جبری ریٹائر کیے جانے والے لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کا ہاتھ تھا۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ مشرقی پاکستان کے المیہ کے چودہ ماہ بعد ہی فوجی افسروں نے منتخب جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی۔ تاریخی ایسے فوجیوں کی نظر میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس سازش کو اٹک سازش کیس کا نام دیا گیا۔ بھٹو نے اس سازش کے بارے میں تحریر کیا:۔

"کچھ سینئر اور کچھ جونیئر افسر جو ایک سیاست دان کے رشتے دار اور دوست تھے اور وہ خود مسلح افواج میں رہ چکے تھے اس سازش کے تیار کرنے والے تھے۔"

پاکستان کے سابق سینئر سول سرونٹ ایم ایس کوریجو نے اس فوجی بغاوت کے بارے میں تحریر کیا ہے:۔

> "Thus the army under Bhutto consumed bulk of the budget, acquired sophisticated equipment, increased their jobs, retirement benefits, salaries, facilities for their families, land allotments, plots, perks farms and factories what did he get in return coup attempt by Brigadier F. B. Ali which was foiled; coup attempt by Maj, Gen Tajjamal Hussain which was foiled, coup by Zia which overthrew Bhutto."

ترجمہ: "فوج نے بھٹو کے دور میں بجٹ کا کثیر حصہ صرف کیا، حساس آلات حاصل کیے، اپنے روزگار میں اضافہ کیا، ریٹائرمنٹ کی مراعات بڑھیں، تنخواہوں میں اضافہ ہوا، فوجیوں کے خاندانوں نے سہولتیں حاصل کیں، اراضی، پلاٹ اور فارم آلاٹ کرائے، فیکٹریاں حاصل کیں۔ ان کے بدلے بھٹو کو کیا ملا، بریگیڈیئر ایف بی علی کی ناکام فوجی بغاوت، میجر جنرل تجمل حسین کی ناکام فوجی بغاوت ضیاء کی فوجی بغاوت اور بھٹو حکومت کا تختہ الٹنا۔"

1973ء کا آئین بھٹو کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا متفقہ، جمہوری اور اسلامی آئین ہے۔ چھ نکات کی گونج، سقوط ڈھاکہ کی آہوں، مغربی پاکستان کے عوام کی امنگوں، مذہبی جماعتوں کے دباؤ اور علاقائی جماعتوں کے مطالبات کے پیش نظر متفقہ آئین کوئی آسان کام نہ تھا۔ آئین

Brian Clougley "A History of Pakistan Army" صفحہ 248

زیڈ اے بھٹو "اگر مجھے قتل کیا گیا" (کلاسیک لاہور) صفحہ 144

ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 118

بنانے سے پہلے سپریم کورٹ کی اجازت لینا ضروری تھی۔ 1970ء کے انتخابات متحدہ پاکستان کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ ملک ٹوٹنے کے بعد عوامی مینڈیٹ بھی منقسم ہو چکا تھا۔ مغربی پاکستان کے منتخب اراکین قومی اسمبلی کے آئین سازی کے بارے میں استحقاق پر سوالات اُٹھائے جا رہے تھے۔ سپریم کورٹ کے ایک بینچ نے جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں فیصلہ دیا کہ مغربی پاکستان کے منتخب اراکین اسمبلی دستور بنا سکتے ہیں۔

پاکستان کی مختلف الخیال سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو قومی اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی۔ نیپ (NAP) بائیں بازو کی جماعت تھی، جماعت اسلامی، جمعیت العلمائے اسلام اور جمعیت العلمائے پاکستان دائیں بازو کی جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ دائیں بازو کی جماعت ہے۔ پی پی پی ایک ترقی پسند جماعت ہے جو ایک انقلابی منشور کی بنیاد پر منتخب ہو کر قومی اسمبلی میں پہنچی تھی۔ وسیع نظریاتی اور سیاسی اختلافات کی بنا پر آئین پر اتفاق رائے قائم کرنا ایک معجزہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے رفقاء نے لچک کا مظاہرہ کیا۔ اپوزیشن سے کھلے دل اور نیک نیتی کے ساتھ مذاکرات کیے۔ اپوزیشن کے رہنماؤں نے بھی مشرقی پاکستان کے المیے کے پیش نظر تعاون کیا اور افہام و تفہیم کے نتیجے میں 1973ء کا آئین وجود میں آیا۔ جس پر قومی اسمبلی کی تمام پارلیمانی جماعتوں کے لیڈروں اور اراکین اسمبلی نے اپنے دستخط کیے۔

1973ء کے آئین کی روشنی میں سینٹ کا ادارہ وجود میں آیا جس میں چاروں صوبوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہے۔ صوبائی خودمختاری کو آئینی تحفظ دیا گیا ہے۔ صوبوں کے درمیان تنازعات کو حل کے لیے کونسل آف کامن انٹریسٹ (Council of Common Interests) تشکیل دی گئی۔ وسائل کی تقسیم کے لئے نیشنل فنانس کمیشن(NFC) عمل میں آیا۔ انسانی حقوق کو آئینی تحفظ دیا گیا۔ استحصال کے خاتمے اور بنیادی حقوق (روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور صحت کی سہولتیں) کی فراہمی ریاست کی آئینی ذمہ داری قرار دی گئی۔ آئین میں قرار پایا کہ قرآن اور سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ قوانین کو اسلامی بنانے کے لیے مشورہ دے گا۔ اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا۔ فوج پر سول حکومت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے آئین میں آرٹیکلز شامل کیے گئے۔

1973ء کا آئین پاکستان کے جمہور (عوام) کی امنگوں اور تمناؤں کا ترجمان ہے۔ اس آئین پر عوام کے حقیقی منتخب نمائندوں کی تصدیقی مہر ثبت ہے یہی وجہ ہے کہ فوجی مداخلتوں کے باوجود 1973ء کا آئین آج بھی زندہ ہے اور وفاق کی بقا اور قومی یک جہتی کا ضامن ہے۔ بھٹو دور میں 1973ء کے آئین میں سات آئینی ترامیم کی گئیں۔

پہلی ترمیم 8 مئی 1974ء کو منظور کی گئی جس کے مطابق وفاقی حکومت نے ایسی سیاسی جماعتوں پر پابندی لگانے کا اختیار حاصل کر لیا جو پاکستان کی آزادی، خودمختاری کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ سپریم کورٹ کو آخری فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔

فتح یاب علی خان "The Constitutional Anomalies" ڈان 8 اگست 2003

21 ستمبر 1974ء کو دوسری آئینی ترمیم کر کے احمدیوں کو اقلیت قرار دیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اس ترمیم کو سپورٹ کیا۔

18 فروری 1975ء کو تیسری ترمیم کے مطابق حکومت کو کسی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے تین ماہ تک نظر بند رکھنے کا اختیار مل گیا۔

25 نومبر 1975ء کو چوتھی ترمیم منظور ہوئی جس کے مطابق حفاظتی نظر بندی کے سلسلے میں ہائی کورٹ کے آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت دیئے گئے اختیارات سلب کر لیے گئے۔

15 ستمبر 1976 کی پانچویں آئینی ترمیم کے ذریعے ہائی کورٹ کی رٹ کی سماعت کے اختیارات مزید کم کیے گئے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ کے لیے پانچ سال اور چیف جسٹس ہائی کورٹ کے لیے چار سال کی مدت مقرر کی گئی۔ انتظامیہ کو چیف جسٹس کی مشاورت کے بغیر کسی بھی جج کو ملک کی کسی بھی ہائی کورٹ میں ایک سال کے لیے ٹرانسفر کرنے کا اختیار مل گیا۔ ہائی کورٹ کے جج کو سپریم کورٹ میں بھیجنے کا اختیار حاصل ہو گیا اور اگر کوئی جج سپریم کورٹ جانے سے انکار کرے تو ریٹائر تصور کیا جائے گا۔ نیز انتظامیہ نے سنیارٹی کے بغیر کسی بھی جج کو ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نامزد کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔

4 جنوری 1977ء کی چھٹی ترمیم کے مطابق چیف جسٹس سپریم کورٹ اور چیف جسٹس ہائی کورٹ کو اپنی مدت پانچ سال اور چار سال پوری کرنے کا حق دیا گیا چاہے وہ (65 سال اور 62 سال) ریٹائرمنٹ کی عمر تک کیوں نہ پہنچ جائیں۔

16 مئی 1977ء کی ساتویں ترمیم کے ذریعے کسی اہم قومی مسئلہ پر ریفرنڈم کرانے کی گنجائش رکھی گئی۔

ان سات ترامیم میں سے چوتھی اور پانچویں ترمیم عدلیہ کی آزادی سلب کرنے کے مترادف تھی۔ پہلی ترمیم اپوزیشن کو دباؤ میں رکھنے کی کوشش تھی۔ تیسری ترمیم بنیادی انسانی حقوق کے خلاف تھی۔ چھٹی ترمیم اس وقت کے چیف جسٹس کو خوش کرنے کے لیے کی گئی۔ کوریجو کی رائے میں 1973ء کے آئین کے لیے جہاں بھٹو کو خراج تحسین پیش کیا گیا وہاں آئینی ترامیم کی وجہ سے ان پر تنقید بھی ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس وقت کے مخصوص حالات میں چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھٹو کو آئینی ترامیم جیسے سخت اقدامات کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ بھٹو کا کام مشکل تھا۔ ان سے پہلے دو ملٹری ڈکٹیٹروں نے جمہوریت کو پٹڑی سے اُتار دیا تھا۔ اسے دوبارہ پٹڑی پر ڈالنا ایک پیچیدہ مرحلہ تھا۔ البتہ عدالتوں کی آزادی سلب کرنا ایک غیر ضروری عمل تھا۔

بھٹو عالم اسلام کے اتحاد کے لیے سنجیدہ کوششیں کرتے رہے، وہ پاکستان کو عالم اسلام کا مرکز بنا رہے تھے۔ بھٹو نے امریکی مخالفت کے باوجود لاہور میں شاندار اور تاریخی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرائی جس میں شہنشاہ ایران کے علاوہ تمام بڑے اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے شرکت کی۔ بھٹو کی رائے

ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 116

تھی کہ مسلمان ملک اگر معاشی بنیاد پر آپس میں اتحاد کرلیں تو وہ مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

بھٹو نے فروری 1973 میں بلوچستان میں عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ مفتی محمود اس اقدام کے خلاف بطور احتجاج سرحد حکومت سے مستعفی ہو گئے۔ پاکستان کے دو صوبے سیاسی انتشار اور بحران کا شکار ہو گئے۔ اس اقدام سے وفاقی حکومت کی نااہلی ظاہر ہوئی اور یہ تاثر پیدا ہوا کہ بھٹو حکومت سیاسی مسائل سیاسی طریقے سے حل نہیں کر سکی۔ (37)

بلوچستان میں 1970ء کے آغاز میں بے چینی اور کشیدگی پائی جاتی تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کئی سالوں سے سیلف رول (self-rule) کا پرچار کر رہی تھی۔ 1972ء میں وفاقی حکومت اور بلوچستان کی صوبائی حکومت کے درمیان اس وقت تنازعہ پیدا ہوا جب صوبائی حکومت نے سول سروس سے غیر بلوچیوں کو نکال کر بلوچیوں کو نامزد کرنا شروع کیا اور پاکستان رینجرز کے متبادل کے طور پر مقامی ملیشیا بنانے کا آغاز کیا۔ (38)

10 فروری 1973ء کو وفاقی فورسز نے عراقی سفارت خانہ پر چھاپہ مارا اور بھاری تعداد میں اسلحہ برآمد کیا جو مبینہ طور پر بلوچی گوریلوں کے لیے درآمد کیا گیا تھا۔ بھٹو نے قومی اسمبلی میں بیان دیا کہ یہ اسلحہ کسی تیسرے ملک کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے اندر استعمال کرنے کے لیے منگوایا گیا۔ (39)

بعض مبصرین کا خیال ہے کہ یہ اسلحہ پاکستانی بلوچستان میں نہیں بلکہ ایرانی بلوچستان میں استعمال ہونا تھا۔ جہاں پر عراق بلوچی گوریلوں سے تعاون کر رہا تھا کیونکہ ایران کے شہنشاہ کرد باغیوں کی حمایت کر رہے تھے۔ (40)

بلوچستان میں نیپ کی حکومت کے خاتمے کے بعد بلوچستان میں گوریلا کارروائیاں شدت اختیار کر گئیں اور ان کارروائیوں نے مکمل جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ فوجی آپریشن کے نتیجے میں بلوچ گوریلے پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ فوج نے ہیلی کاپٹر اور فضائیہ کا استعمال کیا۔ اکتوبر 1974ء میں حکومت پاکستان نے وائٹ پیپر جاری کیا جس میں مؤقف اختیار کیا گیا کہ بلوچی سردار ریفارمز کے خلاف ہیں کیونکہ ریفارمز کے نتیجے میں ان کی اتھارٹی ختم ہو سکتی ہے۔ (41) بھٹو نے اکتوبر 1974 میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نام ایک نوٹ ارسال کیا جس میں دعویٰ کیا کہ افغانستان کی حکومت منصوبہ بندی کے تحت پورے پاکستان میں دہشت گردی اور دھماکے کرا رہی ہے۔ (42)

فروری 1975ء میں پی پی پی کے صوبائی رہنما حیات محمد شیر پاؤ ایک دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ حکومت نے ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں نیپ پر پابندی لگا دی۔ سپریم کورٹ نے شہادتوں کی روشنی

(37) ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 213

(38) پرویز اقبال چیمہ "The Armed Forces of Pakistan" صفحہ 127

(39) رفیع رضا "Z.A. Bhutto and Pakistan" صفحہ 266-272

(40) ہیری سن سلیگ "In Afghanistan Shadows" صفحہ 33-40

(41) پرویز اقبال چیمہ "The Armed Forces of Pakistan" صفحہ 128

(42) پرویز اقبال چیمہ "The Armed Forces of Pakistan" صفحہ 128

میں حکومت کے اس اقدام کو جائز قرار دے دیا۔ نیپ کے رہنما ولی خان اور ان کے 43 رفقاء کے خلاف خصوصی ٹربیونل میں مقدمہ چلا۔ بلوچستان سے ہزاروں بلوچی افغانستان فرار ہو گئے۔ افغانستان کے سردار داؤد نے ان کے لیے سرحد پر کیمپ لگا دیئے۔ گوریلا تنظیموں کے لیڈران کیمپوں میں جاتے وہاں سے اسلحہ حاصل کرتے اور منصوبہ بندی کے اجلاسوں میں شریک ہوتے۔ (43)

بھٹو کو متنبہ کیا گیا کہ فوج کو بلوچستان میں غیر ارادی طور پر سیاست میں دھکیلا جا رہا ہے۔ بھٹو کے اپنے سیکرٹیریٹ نے خبردار کیا کہ اس اقدام سے افسر کور میں خرابیاں پھیل رہی ہیں۔ درمیانی رینک کے افسروں کو اقتدار کا چسکا پڑتا جا رہا ہے اور افسران میں سیاست دانوں کے لیے حقارت کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ راؤ رشید نے رپورٹ دی کہ فوج میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ آرمی ہر مرض کی دوا ہے۔ یہ تاثر متعدی بیماری ہے اور ایک صوبے تک محدود نہیں رہ سکتی اسے پھیلنے نہ دیا جائے۔ (44)

فوج بھٹو پر ملٹری آپریشن کے لیے دباؤ ڈالتی رہی۔ جولائی 1977ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر شب خون مارا تو فوج نے ولی خان اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا اور بلوچ لیڈروں سے مصالحت کر لی۔ بھٹو سیاست دان تھے انہیں بلوچستان کا مسئلہ سیاسی طور پر حل کرنا چاہیئے تھا۔ فوج جب سول حکومت کی مدد کے لیے استعمال ہوتی ہے تو اسے اپنی برتری اور حکومت کی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔

بھٹو کے قریبی ساتھی ڈاکٹر مبشر حسن انکشاف کرتے ہیں کہ بلوچ سردار اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ بھٹو اسٹیبلشمینٹ کی منشا کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ جب تک سول اور ملٹری بیورو کریسی اور خفیہ ایجنسیوں کے پاس سول حکومت کو ہٹانے کی طاقت موجود ہے کوئی وزیر اعظم فوج کے مشورے کو مسترد نہیں کر سکتا۔ جو ہمیشہ مسائل کا فوجی حل پیش کرتی ہے۔ ایک سویلین حکومت اگر علاقائی مسائل کے لیے جو آزادی اور خود مختاری کے لیے کھڑے کیئے گئے ہوں اور جس کے لیے مسلح جدوجہد ہو رہی ہو، سیاسی حل پیش کرنے کا مطلب بغاوت کو نظر انداز کرنا سمجھا جاتا ہے۔ ایسا اختلاف جو اصل حکمران قوتوں کی طاقت اور بالادستی کو چیلنج کرے برداشت نہیں کیا جاتا۔ (45)

ڈاکٹر مبشر حسن کے انکشاف سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1971ء میں پاکستان کیوں دولخت ہوا۔ پاکستان نصف صدی کے بعد بھی عدم استحکام کا شکار کیوں ہے اور جمہوریت کیوں جڑ نہ پکڑ سکی اور آئین کو کیوں کاغذ کا ایک ٹکڑا تصور کیا گیا۔ اگر بھٹو کو آزادی دی جاتی تو وہ بلوچستان کا سیاسی حل تلاش کر لیتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ بھٹو نے بلوچستان میں فوج کشی کی بجائے استعفیٰ کیوں نہ دیا۔ اگر وہ فوجی حل کی بجائے مستعفی ہو جاتے تو پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ (46)

(43) سلیگ ہیری سن "In Afghanistan Shadows" صفحہ 39

(44) سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 120

(45) ڈاکٹر مبشر حسن "The Mirage of Power" صفحہ 124

(46) ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 125

1976ء کا سال بھٹو کے لیے بدقسمت سال ثابت ہوا۔ انہوں نے کئی بڑے فیصلے کیے جو ان کے لیے نیک فال ثابت نہ ہوئے۔ بھٹو نے مارچ 76ء میں جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد فوج کے جونیئر افسر جنرل ضیاء الحق کو نیا چیف آف آرمی سٹاف نامزد کر دیا۔ جس سے فوج کے سات سینئر افسروں کی حق تلفی ہوئی۔

اردن کے شاہ حسین نے جنرل ضیاء الحق کی نامزدگی کی سفارش کی تھی۔ بھٹو بڑے سیاست دان تھے مگر خوشامد ان کی کمزوری تھی۔ ضیاء الحق کو خوشامد کا فن آتا تھا۔ اس نے ملتان میں پوسٹنگ کے دوران بھٹو کو ایک شاندار استقبالیہ دیا جس میں فوجی افسروں کی بیگمات کی حاضری کو لازمی قرار دیا۔ اس موقع پر ضیا کی تقریر خوشامد کا شاہکار تھی۔ آرمی چیف بننے سے پہلے ضیا قرآن پاک لے کر بھٹو کے پاس پہنچ گئے اور کہا ''سر آپ اس قوم کے اتنے بڑے محسن ہیں کہ آپ سے بڑے کسی ہیرو کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور آپ کو قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ اور آپ کے خاندان کا وفادار ہوں گا۔'' [47] بھٹو جب بھی ملتان کا دورہ کرتے وہ نواب صادق قریشی کے گھر ''وائٹ ہاؤس'' میں قیام کرتے۔ ضیا جو ملتان میں فوج کی کمان کر رہے تھے بھٹو سے ملاقات کرتے۔ بھٹو ضیاء الحق کے مؤدبانہ انداز کی وجہ سے اسے پسند کرنے لگے تھے۔ [48] بھٹو نے اپنی آخری کتاب میں تسلیم کیا کہ آئی ایس آئی کے ڈی جی لیفٹیننٹ جنرل جیلانی خان نے ضیاء کو آرمی چیف بنانے کی پرزور سفارش کی تھی۔

آرمی چیف بننے کے بعد ضیاء وزیراعظم سیکرٹریٹ کے ایک کمرے میں بھٹو سے ملاقات کے لیے انتظار کر رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ بھٹو اچانک اس کمرے میں آگئے تو ضیاء نے انہیں دیکھ کر جلتا ہوا سگریٹ اپنی یونیفارم کی جیب میں ڈال لیا۔ بھٹو نے کہا۔

"General you are burning Pak Army."

ترجمہ: ''جنرل تم پاکستان آرمی کو جلا رہے ہو۔''

مقبول عام تاثر یہ ہے کہ امریکہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ روس افغانستان میں مداخلت کی تیاری کر رہا ہے۔ روس کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ کو پاکستان میں ایک فوجی سربراہ کی ضرورت تھی جو روس کے خلاف امریکہ کی پراکسی وار (proxy war) لڑ سکے۔ ضیاء 1969ء میں بریگیڈیئر کی حیثیت سے اردن میں فلسطینیوں پر گولیاں چلا کر امریکی سی آئی اے کی خوشنودی حاصل کر چکے تھے وہ روسی افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے وفادار پارٹنر ثابت ہوسکتے تھے۔ ضیاء کو اقتدار میں لانے کے لیے قوم پرست بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانا ضروری تھا چنانچہ سی آئی اے نے ایک گہری سازش تیار کی۔ ضیاء کا آرمی چیف بننا اس سازش کی پہلی کڑی تھی۔ جنرل ٹکا خان کی مخالفت کے باوجود بھٹو نے ضیاء کو آرمی چیف نامزد کر دیا۔ [49]

1976ء میں بھٹو سول ملٹری اسٹیبلشمینٹ اور جاگیردار طبقہ کی گرفت میں آچکے تھے۔ ان کے پرانے نظریاتی ساتھی ان سے دور ہو رہے تھے۔ افضل سعید، عزیز احمد، وقار احمد، محمود مسعود، محمد حیات ٹمن، خدا بخش

---

[47] اظہر سہیل — جنرل ضیاء کے گیارہ سال — صفحہ 14
[48] جنرل کے ایم عارف — "Working With Zia" — صفحہ 45
[49] سہیل وڑائچ — ''جرنیلوں کی سیاست'' — صفحہ 282

بچہ، راؤ رشید اور سعید احمد خان بھٹو کے قابل اعتماد مشیروں کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ بھٹو نے آئینی مدت ختم ہونے سے ایک سال قبل عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ خفیہ ایجنسیوں نے انہیں رپورٹیں دی تھیں کہ اپوزیشن جماعتیں منتشر ہیں وہ متحد نہیں ہوں گی اور بھٹو کی مقبولیت عروج پر ہے۔ لہٰذا ایک سال قبل انتخابات کرانا پی پی پی کے مفاد میں ہے۔ آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل جیلانی نے بھٹو کو ایک خفیہ نوٹ بھیجا جس میں تحریر کیا۔

''پاکستان کے دانشور محسوس کرتے ہیں کہ بھٹو پاکستان کے غیر متنازعہ لیڈر ہیں ان کے مقابلے کا اور کوئی لیڈر موجود نہیں ہے۔ بھٹو واحد لیڈر ہیں جو بین الاقوامی اُمور کے ماہر ہیں۔ وہ پاکستان کی سلامتی اور اتحاد کی علامت ہیں۔ اپوزیشن انتشار کا شکار ہے وہ متحد نہیں ہوگی۔ پی پی پی انتخابات میں پنجاب سے 70 فیصد اور سندھ سے 80 فیصد ووٹ حاصل کرے گی۔'' [50]

بھٹو کو خفیہ ایجنسیوں کی ''سابقہ مہارت'' کا بخوبی علم تھا اس کے باوجود وہ اسٹیبلشمینٹ کے دام میں آگئے۔

1970ء کے انتخابات میں عوام نے جن طبقات کو شکست فاش دی وہ رفتہ رفتہ بڑی مہارت کے ساتھ بھٹو کے قریب ہونے لگے اور انہیں عوام سے دور کرنے لگے۔ بیوروکریٹس نے بھٹو کو پارٹی لیڈروں اور کارکنوں سے بدظن کرنے کے لیے سوچی سمجھی سکیم پر عمل کیا۔ بیوروکریٹ جب کسی پی پی پی رکن کا کوئی کام کرتا تو اس کی فائل وزیراعظم بھٹو کو بھیج دی جاتی۔ بھٹو اپنی پارٹی پر اعتماد کرنے کی بجائے انتخابات کے سلسلے میں راؤ رشید اینڈ کمپنی کی ''خفیہ سفارشات'' پر بھروسہ کرنے لگے۔ [51]

بھٹو نے 7 جنوری 1977ء کو عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو صرف تین دن بعد پی این اے کے نام سے نو سیاسی جماعتوں نے اتحاد کا اعلان کر دیا۔ پی این اے کا انتخابی اتحاد ان بیوروکریٹس کے منہ پر طمانچہ تھا جنہوں نے بھٹو کو یقین دلایا تھا کہ اپوزیشن جماعتیں متحد نہیں ہوں گی۔ جن مذہبی جماعتوں نے ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دے رکھے تھے اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے ان کا صرف تین دن کے اندر پی این اے کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوجانا ایک غیر معمولی سیاسی دھماکہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی خفیہ ہاتھ حرکت میں آچکا تھا اور اپوزیشن کو بھٹو حکومت کی اندرونی رپورٹیں بھی مل رہی تھیں۔ پی این اے میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام، مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت العلمائے پاکستان، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، تحریک استقلال، خاکسار تحریک، مسلم کانفرنس (سردار عبدالقیوم خان) شامل تھیں۔ ان میں سے چھ سیاسی جماعتیں پہلے ہی یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ

---

[50] حسین حقانی — "Pakistan between Mosque and Military" — صفحہ 116
حوالہ سیکرٹ فائل آئی ایس آئی
[51] مولانا کوثر نیازی — "Last Days of Premier Bhutto" — صفحہ 28

(یوڈی ایف) کے نام سے متحد تھیں اور اپوزیشن کا کردار انجام دے رہی تھیں۔ جنوری 1977ء میں رفیع رضا نے بھٹو سے ساڑھے چار گھنٹے ملاقات کر کے اس سازش کا خاکہ پیش کر دیا جو بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے تیار کی جا چکی تھی اور بھٹو کو انتباہ کیا کہ ان کے پاس صرف تین متبادل ہیں۔

1- نیوکلیئر پروسیسنگ پلانٹ کو بھول جائیں تو اپوزیشن کبھی متحد نہ ہو سکے گی۔

2- انتخابات ملتوی کر دیں۔

3- انتہائی سنگین نتائج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ ●

بھٹو ایک سچے قوم پرست رہنما تھے۔ انہوں نے اپنے فیصلے اور مؤقف سے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔

بھٹو نے غیر معمولی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے الیکشن رولز تبدیل کر کے پی این اے کو ایک انتخابی نشان حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا حالانکہ الیکشن رولز کے مطابق سیاسی اتحاد کو ایک انتخابی نشان الاٹ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ پی این اے کی نو سیاسی جماعتوں کو ایک انتخابی نشان الاٹ کرنا بھٹو کی سنگین غلطی تھی۔ ● انتخابی مہم بیوروکریسی کی بنائی ہوئی حکمت عملی کے مطابق چلائی گئی جس کی بناء پر اپوزیشن کو پی پی پی اور بھٹو کے خلاف پروپیگنڈے کا موقع ملا۔

لاڑکانہ سے پی این اے کے امیدوار مولانا جان محمد عباسی کو گرفتار کر کے انہیں بھٹو کے مقابلے میں کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے روکا گیا۔ جس کا مقصد بھٹو کو غیر متنازعہ لیڈر کے طور پر بلا مقابلہ منتخب کرانا تھا۔ لاڑکانہ کے ڈی سی خالد کھرل اس سیاسی ڈرامے کے خالق تھے۔ بھٹو کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کے بعد چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نواب صادق قریشی، غلام مصطفیٰ جتوئی، نصر اللہ خٹک اور محمد خان باروزئی بھی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ ان کے علاوہ پی پی پی کے دیگر درجنوں لیڈر بھی بلا مقابلہ منتخب قرار پائے۔ ●

انتخابات میں پی پی پی نے قومی اسمبلی کی کل نشستوں میں سے 155 نشستیں جیت لیں اور پی این اے کو 36 سیٹیں ملیں۔ بیوروکریسی نے انتخابات سے پہلے بھٹو کو جو رپورٹیں دیں ان کے مطابق پی پی پی کا 75 نشستوں پر کامیابی کا اندازہ پیش کیا گیا۔ یہ رپورٹیں زمینی حقائق کی عکاس نہ تھیں۔ ان رپورٹوں کی روشنی میں بھی اپوزیشن کو انتخابات میں دھاندلی کا پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا۔ بھٹو سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے سیاست دانوں کی بجائے نوکر شاہی کے ذہن پر بھروسہ کیا اور دھوکہ کھا گئے۔ ● پی این اے نے انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انتخابات میں دھاندلی کا الزام عائد کرتے ہوئے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔ پی این اے کے لیڈروں نے 25 سے 30 نشستوں پر

● زیڈ اے بھٹو "اگر مجھے قتل کیا گیا"

● شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 419

● شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 420

● راؤ رشید "جو میں نے دیکھا" صفحہ 184

دھاندلی کا دعویٰ کیا۔ راقم الحروف نے 1977ء کے انتخابات میں لاہور کی صوبائی اسمبلی کی نشست سے حصہ لیا تھا اور اس وقت پی پی پی پنجاب کا سیکرٹری اطلاعات تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حکومتی سطح پر دھاندلی کا کوئی منصوبہ نہ تھا البتہ پی پی پی کے امیدواروں نے محدود نشستوں پر انفرادی سطح پر دھاندلی کا ارتکاب ضرور کیا۔ بھٹو 25 نشستوں پر دوبارہ انتخاب کرانے کے لیے تیار تھے لیکن پی این اے کے عزائم کچھ اور تھے۔ اسے فوج، سرمایہ داروں، تاجروں اور امریکی سی آئی اے کا تعاون حاصل تھا۔ پاکستان کے شہروں میں ڈالر سرکاری ریٹ سے بہت سستا فروخت ہو رہا تھا۔ بھٹو نے 28 اپریل 1977 کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سازش کا انکشاف کیا اور کہا "یہ ہاتھی مجھ سے ناراض ہے لیکن اس کا واسطہ بندۂ صحرا سے آن پڑا ہے۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق مؤقف اختیار کیا ہے۔ پاکستان میں غیر ملکی کرنسی پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ کراچی میں ڈالر چھ روپے کا ہو گیا ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کس طرح لوگوں کو اذانیں دینے کے لیے رقوم دی گئیں اور لوگوں کو جیل جانے کے لیے رشوتیں دی گئیں۔" اس تقریر کے بعد امریکہ کے صدر نے بھٹو کو ایک خفیہ خط لکھا اور خاموش مذاکرات کا مشورہ دیا۔ بھٹو یہ خط لے کر راجہ بازار راولپنڈی چلے گئے اور یہ خط عوام کے ہجوم کے سامنے لہرا دیا۔ بھٹو کے خلاف سازش کے دو مرکزی کردار جنرل ضیاء الحق اور جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد تھے جنہوں نے سی آئی اے سے ڈالر وصول کر کے تقسیم کیے۔ سازش کے مطابق دھاندلی کے الزام میں تحریک چلانا، بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹنا اور ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا تھا۔ ● بھٹو نے خانہ جنگی کے خوف سے پی این اے کا مقابلہ کرنے کے لیے پی پی پی کی سٹریٹ پاور کو استعمال کرنے سے گریز کیا۔

پی این اے نے پہلے دھاندلی کے نام پر تحریک شروع کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو نظامِ مصطفیٰ اور اشیاء کی قیمتوں کو 1970ء کی سطح پر لانے کا نعرہ لگا دیا۔ جب مذہب اور ڈالر اکٹھے ہو گئے تو تحریک نے ملک گیر شکل اختیار کر لی۔ تحریک کے دوران توڑ پھوڑ، بم دھماکوں، آگ لگانے، قتل و غارت گری کے حربے استعمال کیے گئے۔ اس تحریک کے دوران راقم الحروف کی گاڑی میں ہینڈ گرنیڈ پھینک کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ خدا نے معجزانہ طور پر محفوظ رکھا۔ ایجی ٹیشن کے دوران 241 افراد ہلاک ہوئے۔ 1198 زخمی ہوئے۔ 1662 گاڑیوں کو جلایا گیا۔ 58 بینک اور 47 دکانیں تباہ ہوئیں۔ ریلوے کی 32 بوگیاں تباہ ہوئیں۔ 546 سینما ہاؤس جلائے گئے۔ ● ہنگاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے افواج پاکستان کو بڑے شہروں میں ذمہ داری سونپی گئی۔ لاہور میں بریگیڈیئر اشتیاق علی خان، بریگیڈیئر سید محمد اور بریگیڈیئر نیاز احمد نے دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ ● پی این اے کے حامیوں نے فوج کے خلاف نعرے

● حامد خان "Constitutional and Political History of Pakistan" صفحہ 563

● جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 61

● جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 73

لگائے اور اشتعال انگیز بینر بھی لگائے۔ لوہاری دروازہ لاہور پر خاکی پتلونیں اور قمیصیں لٹکا کر بینروں پر نعرے لکھے گئے کہ یہ بھگوڑے فوجیوں کی وردیاں ہیں جو وہ مشرقی پاکستان میں چھوڑ آئے تھے۔ [59]

بھٹو نے پی این اے کے رہنماؤں سے مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں 15 جون 1977 کو ایک معاہدہ طے پا گیا اور اکتوبر 1977 میں دوبارہ انتخابات کرانے کا فیصلہ ہوا۔ [60] پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے رکن پروفیسر غفور احمد کے مطابق ایک اعلیٰ سطح اجلاس میں بیگم نسیم ولی خان نے ''پی این اے کے صدر مفتی محمود سے کہا کہ نئے انتخابات کے سلسلے میں بھٹو پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا لہٰذا معاہدے پر دستخط نہ کیے جائیں اور فوج کو مارشل لاء لگانے دیا جائے۔ فوج ہی نوے روز کے اندر انتخابات کرانے کی گارنٹی دے سکتی ہے۔'' ولی خان بھی اس تجویز سے متفق ہیں۔ اصغر خان نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ اصغر خان نے اس رائے کا اظہار کیا کہ صرف فوج ہی نئے انتخابات کے لیے سازگار حالات پیدا کرسکتی ہے۔ اصغر خان اور نسیم ولی نے کبھی اپنی اس تجویز کی تردید نہیں کی۔ [61]

سابق ایئر مارشل اصغر خان نے افواج پاکستان کے چیفس کو خط تحریر کیا:۔

As men of honour it is your responsibility to do your duty and the call of duty is not the blind obedience of unlawful commands. There comes a time in the life of a nation when each man has to ask himself whether he is doing the right thing. For you the time has come. Answer this call and save Pakistan. God be with you." [62]

ترجمہ: ''باوقار لوگ ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنا فرض ادا کریں اور فرض کی پکار یہ ہے کہ غیر قانونی احکامات کی آنکھیں بند کر کے تابعداری نہ کریں۔ قوم کی زندگی میں وہ وقت بھی آتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ کیا وہ درست کام کر رہا ہے۔ آپ کے لیے وہ وقت آگیا ہے۔ وقت کی پکار کا جواب دیں اور پاکستان کو بچائیں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔'' [62]

27 اپریل 1977ء کو چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور تینوں سروس چیفس نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ افواج پاکستان قانون کے مطابق تشکیل دی گئی حکومت کا دفاع کرنے کے لیے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کریں گی۔ [63]

جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم نے سفارت کے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل ضیاء الحق کو

---

[59] ڈاکٹر مبشر حسن ''حاکمیت کا بحران'' صفحہ 118
[60] جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 79
[61] جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 85
[62] جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 56
[63] جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 67

اپنا 'فرض' ادا کرنے کے لیے خط لکھا۔ [64]

بھٹو نے مولانا کوثر نیازی کے ایماء پر ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ چھ ماہ کے اندر اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں گے۔ بھٹو نے شراب اور جوئے پر پابندی لگا دی۔ شراب خانے اور نائٹ کلب بند کر دیئے۔ جمعہ کو سرکاری تعطیل کا دن قرار دیا اور کرپشن کے خاتمے کے لیے دو ماہ کے اندر قانون سازی کرنے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کا اعلان کیا۔ [65] پی این اے کے رہنما ان اقدامات سے بھی مطمئن نہ ہوئے وہ نظام مصطفیٰ کی بجائے کسی خفیہ ایجنڈے پر کام کر رہے تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے وفاقی حکومت کی اجازت کے بغیر سبکدوش ہونے والے امریکی سفیر کو استقبالیہ دیا۔ پروٹوکول کے مطابق ضیاء کا فرض تھا کہ وہ وزیراعظم سے استقبالیہ کی اجازت لیتے۔

20 جون 1977ء کو جنرل ضیاء الحق اور کور کمانڈرز نے بھٹو کو بتایا کہ اگر بحران کا سیاسی حل نہ نکلا تو فوج کا ڈسپلن مجروح ہوگا اور اس کے اثرات افواج پاکستان کے اتحاد کے لیے تباہ کن ہوں گے۔ [66] پی این اے کے رہنماؤں نے بحران کو طول دینے کے لیے اپنے مطالبات میں کئی نئے نکات کا اضافہ کر دیا۔

بھٹو نے 4 جولائی 1977 کی رات کو اپنے رفقاء مولانا کوثر نیازی، حفیظ پیرزادہ، ممتاز بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی کو مشورے کے لیے وزیراعظم ہاؤس بلایا اور 11:30 بجے پریس کانفرنس کر کے اعلان کر دیا کہ پی این اے کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے گئے ہیں اور 5 جولائی کو معاہدے پر دستخط کر دیئے جائیں گے۔ پریس کانفرنس کے بعد رات ایک بجے امریکہ کے سفیر آرتھر ہومم (Arthur Humme) نے بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور خیال کیا جاتا ہے کہ امریکی سفیر نے بھٹو کو آرمی کے اقتدار سنبھالنے کے بارے میں انتباہ کیا۔ رات 2 بجے فوج نے آپریشن فیئر پلے کے نام پر بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ [67] بھٹو نے اپوزیشن کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے تھے اور وہ نئے انتخابات کرانے کے لیے تیار ہوگئے تھے، فوج کے اقتدار سنبھالنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ [68] عبدالحفیظ پیرزادہ نے 12 جولائی 2005 کو اے آر وائی ٹیلی ویژن چینل کے پروگرام ''جواب دہ'' میں بتایا کہ فوج پی این اے اور پی پی پی کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو ٹیپ کرتی رہی تھی۔

بھٹو کو اپنے پیشرو جمہوری حکمرانوں کی طرح یہ مسئلہ درپیش رہا کہ جمہوری اداروں کی ریاست، فوج

---

[64] بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی "The Military in Pakistan" صفحہ 231
[65] جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 69
[66] جنرل جہاں داد خان "Pakistan Leadership Challenges" صفحہ 160
[67] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionnent" صفحہ 476
نوٹ: شیر باز مزاری پی این اے کے مرکزی لیڈر تھے۔
پروفیسر غفور احمد ''پھر مارشل لا آگیا''
[68] پروفیسر غفور احمد ''پھر مارشل لا آگیا'' صفحہ 248

اور بیوروکریسی پر بالادستی کیسے قائم کی جائے۔ فیڈرل سسٹم کیسے فعال ہو اور اسلام کا ریاست کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا ہو۔ شہروں اور دیہاتوں کے غریب عوام نے بھٹو اور پی پی پی کو کامیاب کرایا تھا۔ ان کی مشکلات اور مصائب میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ بھٹو نے عوام کو زبان دی تھی۔ اپنے بنیادی حقوق کے لیے ان کے مطالبات احتجاج کا رنگ اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ بھٹو غریب عوام کے مسائل حل کرنے میں سنجیدہ تھے مگر حالات کے دباؤ کا شکار رہے۔ انہوں نے امیر اور غریب طبقے کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی مگر وہ یہ تضاد حل نہ کر سکے۔ اپنی آخری کتاب میں بھٹو لکھتے ہیں:۔

"I am suffering this ordeal partly because I sought an honourable and equitable via media of conflicting interests in order to harmonise our disjointed structure. It seems that the lesson of the coup d' etat is that via media, a compromise is a utopian dream. The coup d' etat demonstrates that class struggle is irreconcilable and that it must result in the victory of one class over the other. Obviously whatever the setbacks may be, the struggle can lead only to the victory of one class." [69]

ترجمہ: ''میں جزوی طور پر اس اذیت سے اس لیے گزر رہا ہوں کیونکہ میں نے متضاد مفادات کے حامل طبقات کے درمیان اشتراک کے لیے قابل احترام اور منصفانہ درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تا کہ ٹوٹے پھوٹے سٹرکچر کو متوازن بنا سکوں۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ درمیانی راستہ اور مفاہمت ایک خیالی دنیا کا خواب ہے۔ فوجی بغاوت سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقاتی جدوجہد میں مفاہمت اور اشتراک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ طبقاتی جدوجہد کا لازمی نتیجہ ایک طبقے کی دوسرے طبقے پر فتح ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جو بھی نقصانات ہوں۔ جدوجہد کا راستہ ہی ایک طبقے کو فتح سے ہمکنار کرتا ہے'' [69]

بھٹو نے مشکل اور ناسازگار حالات سے گزر کر قیادت اور حکمرانی کا منصب حاصل کیا۔ انہوں نے برق رفتاری سے اصلاحات نافذ کیں۔ چین کے لیڈر ماؤزے تنگ نے انہیں درمیانہ اور محتاط راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ بھٹو کو شدید احساس تھا کہ ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے خاندان کے اکثر افراد پچاس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ بھٹو تھوڑے وقت میں بہت زیادہ کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ اصلاحات کو مستحکم نہ کر سکے انہوں نے سیاسی مخالفین تو پیدا کیے، مگر عوامی قوت کو منظم نہ کر سکے۔

بھٹو نے دو ورثے چھوڑے۔ ایک پاکستان پیپلز پارٹی جو آج بھی پاکستانی سیاست پر چھائی ہوئی ہے، دوسرا ورثہ 1973ء کا آئین جو ترامیم اور فوجی حکومتوں کے دباؤ کے باوجود آج بھی پاکستان کا بنیادی

[69] زیڈ اے بھٹو "If I am Assassinated" (کلاسیک لاہور) صفحہ 55

قانون (basic law) ہے۔ [70] بھٹو کا تیسرا بڑا ورثہ ایٹمی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے انہیں اپنی جان بھی قربان کرنا پڑی اور جو آج پاکستان کے عوام کے لیے سب سے بڑا دفاعی ہتھیار ہے۔ بھٹو کو جب سیاسی منظر سے ہٹایا گیا اس وقت عالمی منظر نامہ کچھ اس طرح تھا۔ عالم عرب 1967ء میں اسرائیل کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد عالمی وقار کھو چکا تھا۔ سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل قتل ہو چکے تھے۔ انڈونیشیا کے سوئیکارنو، الجزائر کے بن بیلا اور مصر کے جمال عبدالناصر اقتدار سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اسلامی اُمہ زوال کا شکار تھی۔ پاکستان 1977ء میں عدم استحکام کا شکار ہوا پھر اس کے بعد ابھی تک پوری طرح سنبھل نہیں سکا۔ 1965 کی جنگ کے دوران بھٹو پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ اس جنگ میں انڈونیشیا، ایران، سعودی عرب الجزائر، ترکی اور دیگر کئی مسلم ممالک نے پاکستان کی مدد کی تھی۔ پاکستان عالم اسلام کے مرکز کے طور پر اُبھر رہا تھا۔ بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام کی خدمت کر کے، احمدیوں کو اقلیت قرار دے کر، اسلامی کانفرنس منعقد کر کے اور دوسرے مذہبی و سیاسی اقدامات اُٹھا کر پاکستان کو عالم اسلام کا رہنما ملک بنا دیا تھا۔ ایران میں خمینی انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ امریکہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ جنوبی ایشیا کے علاقے میں مسلمان قیادتیں اس قدر مضبوط اور مستحکم ہو جائیں کہ اس کے اپنے مفادات خطرات میں پڑ جائیں۔ امریکہ کے علم میں تھا کہ روس افغانستان میں داخل ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان حالات میں امریکہ کو پاکستان میں ایک ایسی قیادت کی ضرورت تھی جو اس کے اشاروں پر چل سکے۔ جنرل ضیاء الحق امریکہ کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے اور ضیاء الحق کے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے طویل المیعاد (long-term) سازش تیار کی گئی۔ بھٹو کو فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار سے محروم کرنا سازش کی اہم کڑی تھی۔

سینئر سول سرونٹ روئیداد خان جو ضیا دور میں وفاقی سیکرٹری داخلہ رہے لکھتے ہیں:۔

"The coup against Bhutto and the imposition of martial law were not justifed in the circumstances prevailing just before the promulgation of martial law. The resurrection of the murder case against Bhutto did not get a fair trial. He was a doomed man once the army decided to topple him." [71]

ترجمہ: ''بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت اور مارشل لاء کا نفاذ مارشل لاء سے پہلے سے جاری حالات کی روشنی میں کوئی جواز نہ تھا۔ بھٹو کے خلاف قتل کیس کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور مقدمے کی سماعت منصفانہ طور پر نہ کی گئی۔ جونہی فوج نے بھٹو کا اقتدار ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ ایک تباہ شدہ شخص بن چکا تھا۔'' [71]

[70] ڈاکٹر آفتاب احمد "Constitution And Its Amendments" ڈان 23 ستمبر 2002

[71] روئیداد خان "Pakistan: A dream gone sour" صفحہ 72

باب 7

بنیاد پرست جنرل

''میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ فوج ہی اپنے سپاہیانہ پیشے سے اُکھڑنا چاہتی ہے۔ مجھے صرف اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آنا پڑا ہے جو سیاست دانوں نے پیدا کیا ہے اور میں نے یہ چیلنج صرف اسلام کے ایک سپاہی کی سثیت سے قبول کیا ہے۔ میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروانا ہے جو اس سال اکتوبر میں ہوں گے اور انتخابات مکمل ہوتے ہی میں اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دوں گا اور میں اس لائحہ عمل سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ آئندہ تین مہینوں میں میری ساری توجہ انتخابات پر مرکوز ہوگی اور میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو دوسرے معاملات پر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

جنرل ضیاء الحق نے یہ وعدہ قوم سے اپنے پہلے نشری خطاب میں کیا۔ ضیا نے نوے روزہ آپریشن فیئر پلے کے وعدہ پر اقتدار پر قبضہ کیا۔ پی این اے کے لیڈروں نے مارشل لاء کا ''کریڈٹ'' حاصل کرنے کے لیے بیانات جاری کیے جن میں کہا گیا کہ مارشل لاء ان کی جدوجہد کے نتیجے میں نافذ ہوا ہے۔ (1) اقتدار سنبھالنے کے بعد ضیاء نے اپنی سربراہی میں ایک 'ملٹری کونسل تشکیل دی جس میں جنرل اقبال خان، جنرل سوار خان، جنرل کے ایم عارف، وائس ایڈمرل طارق کمال خان، ایئر مارشل محمد انور شمیم شامل تھے۔ (2) ضیاء ابتداء میں ہی اے کے بروہی، شریف الدین پیرزادہ، ڈاکٹر سعد جابر (مصری)، علی احمد تالپور، جسٹس چیمہ اور کرنل صدیق سالک جیسے خوشامدی مشیروں کے نرغے میں آ گئے جو ضیاء کو مسلم اُمہ کا لیڈر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ (3)

ضیاء نے بھٹو کو گرفتار کر کے ''حفاظتی حراست'' میں رکھا اور یہ تاثر دیا گیا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے لہٰذا ان کو گورنر ہاؤس مری میں نظر بند کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ضیاء نے پی این اے کے گرفتار رہنماؤں سے

---

(1) جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 75

(2) لارنس زائرنگ "Pakistan in Twentieth Century"

(3) جنرل فیض چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 68

ملاقاتیں کرنے کے بعد بھٹو سے بھی ملاقات کی جو خوشگوار نہ تھی۔ اس ملاقات میں جنرل فیض علی چشتی بھی موجود تھے۔ ضیاء نے بھٹو کو یقین دلایا کہ انہوں نے عارضی طور پر اقتدار سنبھالا ہے اور وہ (بھٹو) دوبارہ اقتدار میں آ جائیں گے۔ [4]

9 اگست 1977 کو بھٹو نے ضیاء سے فون پر بات کی۔ چشتی اس موقع پر موجود تھے۔ دونوں کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ گفتگو کے بعد ضیاء اَپ سیٹ تھے۔ [5] ممکن ہے بھٹو نے ضیاء کو دھمکی دی ہو۔ بھٹو اپنی کابینہ اور رفقاء کے سامنے ضیاء کو توہین آمیز الفاظ سے بلایا کرتے تھے۔

"Where is my monkey General? Come over here monkey."[6]

ترجمہ: ''میرا بندر جنرل کہاں ہے؟ اِدھر آؤ بندر۔''[6]

ضیاء الحق بھٹو کے توہین آمیز ریمارکس سن کر مسکراتے اور کہتے:

"Your such kind attention sir."

ترجمہ: ''آپ کی مہربان توجہ سر''

ضیاء اب اقتدار کے مالک بن چکے تھے اور بھٹو کے سخت جملے سننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ انہوں نے بھٹو کے طنزیہ اور توہین آمیز جملے پہلے ہی اپنے دل میں رکھے ہوئے تھے۔

ضیاء نے ولی خان سے بھی ملاقات کی۔ ولی خان نے ضیاء کو انتباہ کیا کہ قبر ایک ہے اور اس میں دفن ہونے والے دو ہیں۔ اگر بھٹو قبر میں پہلے دفن نہ ہوا تو اس قبر میں ضیاء کو دفن ہونا پڑے گا۔ [7] ضیاء جو بھٹو کی خوشامد کی حد تک تعریف کیا کرتے تھے، اب بھٹو اسے ''میکاولی اور شیطان ذہن'' نظر آنے لگے جن کا دورِ حکومت خوف کا دور تھا۔ [8]

جنرل موسیٰ نے سٹیفن کوہن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''(آرمی کے) کوئی سیاسی عزائم نہیں لیکن آرمی اپنے ماحول، سیاست، افراتفری اور عدم استحکام سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ تمام سیاست دان جو بیانات دیتے ہیں تیسرے درجے کے فضول لوگ ہیں۔ بھٹو کا مشن پاکستان کو تباہ کرنا تھا۔ اصغر خاں یہی مشن جاری رکھنے کے لیے آئے۔ جب ضیاء نے اقتدار سنبھالا تو میں اتنا متاثر ہوا کہ اسے تار بھیجا ''بہت اچھے۔'' میں اتنا خوش تھا کہ اسے فون کر کے کہا ''تم نے ملک بچالیا۔ بہت

[4] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 482
جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 18
[5] جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 133
[6] سٹینلے والپورٹ "Zulfi Bhutto of Pakistan" صفحہ 263
Cited شیر باز مزاری صفحہ 488
[7] جنرل کے ایم عارف "Working With Zia" صفحہ 166
[8] جنرل ضیاء الحق انٹرویو ''اردو ڈائجسٹ'' ستمبر 1977

اچھے اور تم نے آرمی کو بچالیا۔'' [9]

جنرل موسیٰ کے ریمارکس کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں۔

ضیاء نے بھٹو کو حفاظتی حراست سے رہا کیا تو بھٹو نے کراچی، ملتان اور لاہور کا دورہ کیا جہاں پر لاکھوں عوام نے ان کا فقید المثال استقبال کیا۔ ضیاء اور پی این اے کے لیڈروں کو پختہ یقین ہو چکا تھا کہ بھٹو مقبولیت کھو چکے ہیں۔ بھٹو کو اگر اقتدار سے محروم کر کے انتخابات کرا دیئے جائیں تو پی این اے بڑی آسانی سے انتخابات جیت جائے گی۔ بھٹو کے پُرجوش عوامی استقبال نے ضیاء اور پی این اے کے لیڈروں کے اوسان خطا کر دیئے۔ ضیاء نے خوف زدہ ہو کر بھٹو کو دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں اور پی این اے کے لیڈروں کے اپنے اندازے کے مطابق دوبارہ انتخابات کی صورت میں پی پی پی کی کامیابی کے امکانات روشن تھے۔ [10] 30 ستمبر 1977ء کو پیر پگارا اور چوہدری ظہور الٰہی نے ضیاء الحق سے ملاقات کر کے انتخابات ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ [11] پی پی پی کے رہنماؤں غلام مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی، مولانا کوثر نیازی، میر افضل، حامد رضا گیلانی اور نور حیات نون نے الیکشن سیل کے انچارج جنرل چشتی سے ملاقات کر کے انتخابات غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کرنے اور سخت احتساب کرنے کا مشورہ دیا۔ پی پی پی کے لیڈر جو بھٹو کا ساتھ نبھانے کی قسمیں اُٹھایا کرتے تھے فوجی انتظامیہ سے خفیہ رابطے کرنے لگے۔

جنرل (ر) کے ایم عارف نے جیو کے پروگرام ''جواب دہ'' بتاریخ 2 جولائی 2006 میں بتایا کہ ''جنرل ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت میں حیدرآباد ٹربیونل کو ختم کر کے مقدمہ میں ملوث تمام سیاست دانوں کو رہا کر دیا۔ غوث بخش بزنجو جنرل ضیا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جی ایچ کیو آئے انہوں نے ضیاء سے کہا کہ ان کی گاڑی پرانی ہے ضیاء نے بزنجو کو نئی مرسڈیز کار دے دی'' حالانکہ جب بھٹو اور پی این اے کے مذاکرات کے دوران حیدرآباد ٹربیونل کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا اس وقت آرمی چیف جنرل ضیاء الحق نے سخت مخالفت کی اور کہا فوج اس مطالبے کو قبول نہیں کرے گی کیونکہ عوامی نیشنل پارٹی نے پاکستان کی سلامتی کے خلاف سازش کی۔

یکم اکتوبر 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے قوم سے کیا ہوا وعدہ توڑ کر 18 اکتوبر 1977ء کو ہونے والے انتخابات ملتوی کر دیئے۔ فوج نے جمہوریت کی چیمپئن کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تھا۔ ضیاء نے انتخابات ملتوی کر کے فوج کی ساکھ اور اعتماد کو مجروح کر لیا۔ [12] ضیاء نے کہا کہ انتخابات کی تاریخ قرآن میں درج نہیں ہے۔ قبل ازیں وہ خانہ کعبہ میں نوے روز کے اندر انتخابات کرانے کا وعدہ کر چکے تھے جسے انہوں نے کوئی کفارہ ادا کیے بغیر توڑ دیا۔

[9] سٹیفن کوہن پاکستان آرمی صفحہ 138
[10] اصغر خان "General in Politics" صفحہ 143
[11] جنرل کے ایم عارف "Working With Zia" صفحہ 131
[12] جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 140

مصنف نے اگست 1977ء میں مارشل لاء اور بھٹو کی گرفتاری کے خلاف بطور احتجاج داتا دربار سے گرفتاری پیش کی۔ 18 اکتوبر 1977ء کو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں بھٹو کی بیرک کے ساتھ میرے ننگے جسم پر دس کوڑے مارے گئے۔ [13] مارشل لاء کے نفاذ کے بعد پی این اے کی جماعتوں میں اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ اصغر خان 11 نومبر 1977ء کو پی این اے کا صدر بننے کی کوشش میں ناکامی کے بعد پی این اے سے علیحدہ ہوگئے۔ یکم مارچ 1978 کو جمعیت العلمائے پاکستان بھی اتحاد سے الگ ہوگئی۔ جنوری 1978ء کو ضیاء نے برطانوی وزیراعظم کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ اس سٹیٹ فنکشن میں غلام مصطفیٰ جتوئی اور مولانا کوثر نیازی بھی شریک ہوئے۔ دونوں ضیاء کی قربت حاصل کر چکے تھے۔ [14]

اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد جولائی 1978 میں ضیاء نے سیاست دانوں کو کابینہ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے ایک بیان میں کہا کہ جو سیاسی جماعتیں کابینہ میں شامل نہ ہوں ان پر پابندی لگادی جائے اور انہیں آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ [15] سیاسی جماعتوں نے کابینہ میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے ضیاء اور ان کے رفقاء سے ملاقاتیں شروع کردیں۔ نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم نے اپنی ''تانگہ پارٹی'' پی ڈی پی کے لیے تین وزارتوں کا مطالبہ کیا۔ ضیاء نے دو وزارتوں کی پیش کش کی مگر نواب زادہ مصر رہے میٹنگ کا ماحول کشیدہ ہوگیا۔ ضیاء قدرے جوش میں آگئے اور کہنے لگے ''اگر میں آپ کا مطالبہ تسلیم کرلوں تو دوسروں سے ناانصافی ہوگی۔ میں ایک حد تک جاسکتا ہوں آپ پیشکش قبول کرلیں وگرنہ چھوڑ دیں۔'' نواب زادہ نصر اللہ اس شرط پر مان گئے کہ وہ خود کابینہ میں شامل نہیں ہوں گے۔ [16]

23 اگست 1978ء کو نئی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ پی این اے سے تعلق رکھنے والے وزراء کے نام یہ ہیں۔

فدا محمد خان (مسلم لیگ)، محمد خان جونیجو (مسلم لیگ)، محمد خان ہوتی (مسلم لیگ)، خواجہ محمد صفدر (مسلم لیگ)، زاہد سرفراز (مسلم لیگ)، چوہدری رحمت الٰہی (جماعت اسلامی)، پروفیسر غفور احمد (جماعت اسلامی)، محمود اعظم فاروقی (جماعت اسلامی)، محمد زماں خان اچکزئی (جمعیت العلمائے اسلام)، صبح صادق خان کھوسو (جمعیت العلمائے اسلام)، افتخار احمد انصاری (پی ڈی پی)، محمد ارشد چوہدری (پی ڈی پی)۔

اصل قوت فوجی اور سول بیوروکریٹس کے پاس تھی۔ کابینہ کے وزیر بے اختیار تھے۔ یہ کابینہ صرف آٹھ

[13] قیوم نظامی ''جو دیکھا جو سنا'' صفحہ 124
[14] شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 501
[15] ویو پوائنٹ (ویکلی لاہور) 18 جون 1978ء
[16] جنرل کے ایم عارف "Working With Zia" صفحہ 157
Cited شیر باز مزاری صفحہ 513

ماہ تک چل سکی۔ پی این اے کے وزراء اپنے کارکنوں کی سرپرستی نہ کرسکے۔ فوجی حکمران پی این اے کے اندرونی اختلافات سے تنگ آگئے۔ وزراء ایک سیاسی حکومت کی طرح کردار ادا کرنا چاہتے تھے حالانکہ وہ مارشل لاء انتظامیہ کے ماتحت تھے۔ [17] جب کابینہ نے بھٹو کی پھانسی کی منظوری دے دی تو ضیاء نے انتخابات کا اعلان کرکے قومی اتحاد کے وزیروں کو اس دلیل پر 21 اپریل 1979 کو فارغ کردیا کہ پی این اے اور پی پی پی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ شرط شامل تھی کہ حکومت انتخابات سے پہلے مستعفی ہوجائے گی۔ [18]

پی این اے کے لیڈروں نے انتخابی مہم 1977ء کے دوران نشتر پارک کراچی میں لاکھوں عوام کے سامنے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف اُٹھایا تھا کہ وہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ تک متحد رہیں گے۔ اس حلف کی تصاویر پاکستان کے تمام اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ضیاء کے فوجی انقلاب کے بعد پی این اے کے لیڈر انتشار کا شکار ہوگئے۔ اکثر ضیاء کابینہ میں شامل ہوگئے۔ پی این اے کے لیڈروں کے سیاسی کردار نے عوام کو بے حد مایوس کیا۔ عوام کا سیاست دانوں پر اعتماد ہی اٹھ گیا۔ پی این اے کی تحریک (1977) کے بعد آج تک کوئی ملک گیر عوامی جمہوری تحریک نہیں چل سکی۔

ضیاء اقتدار کے نشے میں مست ہوچکے تھے۔ انہوں نے تہران کے دورے کے دوران ایک بیان میں کہا:

> "What is a constitution? It is a booklet with ten or twelve pages. I can tear them away and say that from tomorrow we shall live under a new system. Today the people will follow wherever I lead. All the politicians including the once mighty Bhutto will follow me with their tails wagging." [19]

ترجمہ: ''آئین کیا ہے؟ یہ دس یا بارہ صفحات کا ایک کتابچہ ہے۔ میں اس کو پھاڑ سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ کل سے ہم ایک نئے نظام کے مطابق چلیں گے۔ آج میں عوام کو جس جانب بھی لے چلوں وہ میری پیروی کریں گے۔ ماضی کے طاقت ور بھٹو سمیت تمام سیاست دان میرے پیچھے اپنی دُمیں ہلاتے آئیں گے۔'' [19]

پی این اے کے اکثر رہنما اس قدر توہین آمیز بیان کو ہضم کرگئے اور ضیاء کو اپنا بیان واپس لینے پر مجبور نہ کیا اور بے شرمی کے ساتھ وزارتوں سے چمٹے رہے۔ جسٹس کے ایم اے صمدانی نے نظر بندی کے خلاف سماعت کے بعد بھٹو کو ضمانت پر رہا کردیا۔ 3 ستمبر 1977ء کو بھٹو نواب محمد احمد خان قتل کیس میں

[17] حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 236
[18] جنرل کے عارف "Working With Zia" صفحہ 161
[19] September 18, 1978 "Kayhan International, Tehren "
حوالہ شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 521

دوبارہ گرفتار ہوئے۔ پی پی پی کے رکن احمد رضا قصوری نے بھٹو کے خلاف ایف آئی آر درج کرا رکھی تھی۔ اس ایف آئی آر کے مطابق بھٹو پر الزام تھا کہ انہوں نے سیاسی اختلاف کی بناء پر احمد رضا قصوری پر قاتلانہ حملہ کرایا جس میں اس کے والد قتل ہوگئے۔

لاہور ہائی کورٹ کے جج شفیع الرحمٰن نے اس کیس کی انکوائری کر کے بھٹو کو بری الذمہ قرار دیا تھا مگر بھٹو کا نام ایف آئی آر میں بدستور موجود تھا۔ بھٹو نے غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایف آئی آر کو اہمیت نہ دی۔

فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
رات تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

قتل کے مقدمے کی سماعت کے لیے مولوی مشتاق حسین قائمقام چیف جسٹس ہائی کورٹ کی سربراہی میں ایک فل بینچ تشکیل دیا گیا جس میں جسٹس ذکی الدین پال، جسٹس ایم ایس ایچ قریشی، جسٹس آفتاب حسین اور جسٹس گلباز خان شامل تھے۔ جنرل ضیاء، جنرل فیض علی چشتی، جنرل کے ایم عارف اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کی طرح مولوی مشتاق حسین کا تعلق جالندھر (مشرقی پنجاب) سے تھا۔ ضیاء نے مولوی مشتاق حسین کو قائمقام چیف جسٹس نامزد کیا تھا۔ [40] بھٹو نے سماعت کے آغاز ہی میں مولوی مشتاق حسین پر اس بناء پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا کہ وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے مولوی مشتاق کی سنیارٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی اور جج کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نامزد کیا تھا۔ اس لیے انہیں مولوی مشتاق سے انصاف کی توقع نہیں ہے۔ مولوی مشتاق نے بھٹو کی درخواست مسترد کردی۔ بھٹو نے مقدمے کی سماعت کا بائیکاٹ کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے بینچ نے اپنے متفقہ فیصلہ میں بھٹو کو سزائے موت سنادی۔

بھٹو کے وکیل یحییٰ بختیار نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی۔ چیف جسٹس انوار الحق کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے بینچ نے سماعت کے بعد لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ بحال رکھا۔ جسٹس انوار الحق، جسٹس محمد اکرم، جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے اتفاق کیا جبکہ جسٹس دراب پٹیل، جسٹس غلام صفدر شاہ اور جسٹس محمد حلیم نے اختلافی نوٹ لکھا۔ سات رکنی بینچ میں شامل چار ججوں نے سزائے موت کو بحال رکھا جبکہ تین ججوں نے سزائے موت کی مخالفت کی۔ بدقسمتی سے سزائے موت بحال رکھنے والے چاروں ججوں کا تعلق پنجاب سے تھا۔ آج درجنوں ایسی شہادتیں سامنے آچکی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء الحق نے اپنے ذاتی اقتدار کو محفوظ بنانے کے لیے بھٹو کو پھانسی دے کر سیاسی منظر سے ہٹایا۔ مولوی مشتاق حسین، انوار الحق، ضیاء کے رفقا جرنیل ذاتی مفادات کی خاطر بھٹو کے عدالتی قتل کے منصوبے پر متفق ہوچکے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس یعقوب علی خان کو ریٹائرمنٹ پر مجبور کر کے جسٹس انوار الحق کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس نامزد کیا تھا۔

[40] بے نظیر بھٹو "Daughter of the East" صفحہ 104

بھٹو نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا البتہ دنیا کے سینکڑوں مسلم اور غیر مسلم ممالک نے باضابطہ طور پر جنرل ضیاء الحق سے رحم کی اپیلیں کیں اور سزائے موت ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ ضیاء نے کور کمانڈروں کی کانفرنس بلا کر اور کابینہ کے اجلاس سے بھٹو کی سزائے موت کی تصدیق کرالی۔ ضیاء نے جس عجلت کا مظاہرہ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھٹو کے عدالتی قتل (judicial murder) کا فیصلہ کر چکے تھے۔ [41]

بھٹو کو 4 اپریل 1979 کی صبح کو پھانسی دے کر انہیں فوج کے پہرے میں گڑھی خدا بخش لاڑکانہ میں دفن کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو کو اپنے شوہر اور بے نظیر کو اپنے باپ بھٹو کے آخری دیدار کی اجازت نہ ملی۔ بھٹو کے اکثر بیوروکریٹ اور سیاسی رفقاء اعلانیہ اور غیر اعلانیہ طور پر سلطانی گواہ بن گئے۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ پی پی پی کے کارکنوں نے مارشل لاء کے خلاف قربانیوں کی بے مثال تاریخ رقم کی۔ ضیاء نے پی پی پی کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے کوڑوں کا بے دریغ استعمال کیا اور سیاسی کارکنوں کو قید و بند اور جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضیاء کے رفقاء اور حامیوں نے بھٹو کی پھانسی کو سیاسی قتل قرار دیا اور اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کیا۔ بقول غالب

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ضیاء نے دوسری بار انتخابات ملتوی کر دیئے۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی اور صحافت کو سخت سینسر شپ کا پابند کر دیا۔ بھٹو کو دفن کرنے کے بعد بھی ضیاء کو عوام سے رجوع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ 12 مارچ 1980ء کو بی بی سی ورلڈ سروس نے انکشاف کیا کہ حکومت نے 22 نوجوان فوجی افسروں کو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ اس سازش کا سرغنہ غلام مصطفیٰ کھر کو قرار دیا گیا جس پر مبینہ طور پر الزام لگایا گیا کہ اس نے بھارت کے ساتھ ساز باز کر کے فوجی جوانوں کو اسلحہ فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کھر کے قابلِ اعتماد ساتھی سیٹھ عابد نے ضیاء کو اس سازش کی مخبری کر دی اور لاہور کے ایک گھر سے بھاری اسلحہ پکڑا گیا۔ [42]

ستمبر 1980ء میں ضیاء نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیراعظم بنانے اور قومی حکومت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ جتوئی نے مختلف سیاست دانوں سے خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ مصنف اس وقت پی پی پی کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا۔ جتوئی پی پی پی کی سینٹرل ایگزیکٹو کے رکن تھے۔ بیگم نصرت بھٹو کی صدارت میں ہونے والے سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں غلام مصطفیٰ جتوئی سے کہا کہ ان کی وزارت عظمیٰ کے بارے میں افواہیں گردش کر رہی ہیں کیا وہ کمیٹی کو اعتماد میں لینا پسند کریں گے۔ جتوئی نے جواب دیا کہ ان کو وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش ہوئی ہے مگر انہوں نے فوجی حکمرانوں پر واضح کیا ہے کہ وہ بیگم نصرت بھٹو کی منظوری

[41] جنرل فیض علی چشتی "Betrayal of Other Kind" صفحہ 81
[42] تہمینہ درانی "My Feudal Lord" صفحہ 149

کے بعد ہی وزیراعظم کا منصب قبول کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتوئی نے ضیا کے ماتحت وزیراعظم بننے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہوں نے شیر باز مزاری سے ملاقات کر کے کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ جتوئی نے عمرہ کے بہانے دوبئی میں غلام مصطفیٰ کھر سے خفیہ ملاقات کی تا کہ ان سے مشورہ کرسکیں۔ خفیہ ایجنسیوں نے ضیاء کو جتوئی کھر ملاقات کی اطلاع دے دی۔ ضیاء فوجی سازش کی وجہ سے کھر سے سخت ناراض تھے انہوں نے جتوئی کی کھر سے ملاقات کو پسند نہ کیا اور جتوئی کو وزیراعظم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جنرل (ر) کے ایم عارف نے جیو کے پروگرام ''جواب دہ'' بتاریخ 2 جولائی 2006 میں بتایا کہ جنرل ضیاء الحق نے جتوئی کو کہا تھا کہ وہ کھر سے ملاقات نہ کریں مگر جتوئی نے کھر سے ملاقات کر کے وزیراعظم بننے کے امکانات ختم کر لیے۔ جنرل ضیاء الحق مصطفیٰ کھر کے خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ جو شخص اپنے محسن (بھٹو) کی مخالفت کرسکتا ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

فروری 1981ء میں ایم آر ڈی (Movement for Restoration of Democracy) کے نام سے سیاسی اتحاد وجود میں آیا جس میں پی پی پی، این ڈی پی (نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی)، پی ڈی پی (پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی)، تحریک استقلال، پاکستان مسلم لیگ (خواجہ خیر الدین، قاسم گروپ)، قومی محاذ آزادی، پاکستان مزدور کسان پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام، پاکستان نیشنل پارٹی، عوامی تحریک اور نیپ پختون خواہ شامل تھیں۔ ایم آر ڈی نے مارشل لاء کے خاتمے اور 1973ء کے آئین کے تحت صاف شفاف انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا۔ ایم آر ڈی نے جوش وخروش کے ساتھ تحریک کا آغاز کیا۔ ایم آر ڈی کے قیام سے ضیاء سخت پریشان ہوئے۔ تحریک زور پکڑنے لگی مگر مارچ 1981ء میں پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کے واقعہ سے تحریک کو سخت دھچکا لگا۔

طیارہ کراچی سے اغوا کر کے کابل لے جایا گیا۔ حکومت نے الزام لگایا کہ یہ طیارہ الذوالفقار تنظیم نے اغوا کرایا ہے جسے بھٹو کے بیٹے مرتضیٰ اور شاہنواز چلا رہے ہیں۔ پی پی پی کی قیادت نے طیارے کے اغوا کی سخت مذمت کی۔ سیاسی حلقوں نے الزام لگایا کہ طیارے کا اغوا خفیہ ایجنسیوں نے کرایا ہے تا کہ ایم آر ڈی کو کمزور اور تقسیم کیا جاسکے۔ الذوالفقار کے سرگرم کارکنوں نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کی۔

طیارہ کی ہائی جیکنگ کے بعد ضیاء انتظامیہ نے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کیں اور ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ ایم آر ڈی کا دوسرا مرحلہ 1983ء میں شروع ہوا۔ تحریک کا مرکز سندھ تھا۔ مخدوم آف ہالہ کے 50 ہزار مریدوں نے نیشنل ہائی وے کو بند کر دیا۔ سکھر، لاڑکانہ، جیکب آباد، خیر پور، سانگھڑ، ٹھٹھہ، دادو میں عوام نے زبردست احتجاجی مظاہرے کیے۔ حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لیے فوجی

شیر باز مزاری "A Jouruey to Disillusionment" صفحہ 533

حوالہ: جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 216

آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 259

ہیلی کاپٹر استعمال کیے۔ فصلیں تباہ کر دی گئیں اور گھروں کو مسمار کیا گیا۔ چھ ہزار افراد گرفتار اور 250 افراد ہلاک ہوئے۔ ضیاء نے فوج کو استعمال کر کے پاپولر مزاحمتی تحریک کو کچل دیا۔

جی ایم سید لکھتے ہیں کہ سندھ کے عوام کو ٹارچر سیلز میں ہلاک کیا گیا۔ رینجرز، ایف سی اور پولیس نے سڑکوں اور یونیورسٹیوں کے اردگرد عوام پر بلاامتیاز فائرنگ کی۔ ہوائی حملے کیے گئے اور پورے گاؤں جلا دیے گئے۔ کوڑے، گولیاں اور پھانسیاں سندھ کے عوام کا مقدر بنیں۔ جی ایم سید نے اس ظلم وستم کے خلاف اقوام متحدہ، ایمنیسٹی انٹرنیشنل اور اندرا گاندھی کو خطوط روانہ کیے۔ کچھ مصنفین نے ایم آر ڈی کی تحریک کو علاقائی قرار دیا ہے جو حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ اس تحریک میں غلام مصطفیٰ جتوئی بھی گرفتار ہوئے۔

ضیاء بنیاد پرست جرنیل تھے۔ انہوں نے اپنی شیروانی کے نیچے خاکی وردی کو چھپائے رکھا۔ 1981ء کے آخر میں ضیاء نے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی۔ پاکستان بھر سے 350 افراد کو مجلسِ شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔ شوریٰ کو اسلامائزیشن اور اسلامی جمہوریت کے لیے سفارشات مرتب کرنے کا فرض سونپا گیا۔ مجلس شوریٰ قومی اور بین الاقوامی اُمور پر بحث کرتی نیز معاشی اور سماجی اصلاحات کے بارے میں حکومت کو مشورے دیتی۔ مجلسِ شوریٰ ایک مشاورتی ادارہ اور ڈیبیٹنگ کلب (Debating Club) تھی جس کا کام حکومتی فیصلوں کی تائید کرنا تھا۔

ضیاء نے اپنے طویل دورِ اقتدار میں اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مروجہ قوانین کے مقابلے میں متوازی اسلامی قوانین نافذ کیے جن کا بڑا مقصد پاکستان کے عوام میں یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ ضیاء اسلام کے شیدائی ہیں اور اسلامی معاشرے کے قیام میں مخلص ہیں۔ ضیاء کے بارے میں ان کے قریبی رفقاء نے جو کچھ لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء کا کردار منافقانہ تھا۔ ضیاء نے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو کی تا کہ قدامت پسند اور بنیاد پرست علماء کو اس میں نمائندگی دی جاسکے۔ نظریاتی کونسل کے قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے سفارشات مرتب کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔

صوبائی ہائی کورٹس میں شریعت بینچ قائم کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کی گئی۔ سپریم کورٹ میں اپیل بنچ قائم ہوا۔ بعد میں شریعت بینچ ختم کر کے فیڈرل شریعت کورٹ قائم ہوئی۔ شریعت کورٹس کے اختیارات کو محدود رکھا گیا۔ بینکنگ، ٹیکسیشن اور انشورنس کے اُمور شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار میں نہیں تھے۔

شیر باز مزاری "A Journey to Disillusionment" صفحہ 552

اے۔ احمد "The Rebellion of 1983" صفحہ 28

جی ایم سید "The Case of Sindh" صفحہ 199

جنرل کے ایم عارف "Working With Zia" صفحہ 214

جے ہنری کورسن "Islamization And Social Policy in Pakistan" صفحہ 590

اسلامی سزائیں دینے کے لیے حدود آرڈی نینس جاری ہوا۔ نیا قانون شہادت نافذ کر کے پرانے قوانین کو منسوخ کر دیا گیا۔ دو خواتین کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار پائی۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے کئی مقدمات میں ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے (پتھر مار کر ہلاک کرنے) کی سزائیں سنائیں البتہ سپریم کورٹ کے اپیلٹ بینچ نے ان سزاؤں پر عملدرآمد روک دیا۔ ایک کیس میں زنا کے جرم میں لیاقت پور بہاولپور میں پانچ ہزار افراد کے سامنے ایک شخص نے خاتون لال مائی کو کوڑے مارے۔ [29] قصاص اور دیت کے قوانین میں ترمیم سے خواتین کے حقوق متاثر ہوئے۔

سود کے خاتمے کے لیے بینکوں میں پی ایل ایس (Profit and Loss Sharing) کا نظام متعارف کرایا گیا۔ اس سکیم کا نفاذ قومی بچت سکیموں پر نہ کیا گیا۔ بنکوں نے سود کو منافع کا نام دے دیا۔

ضیاء نے زکوۃ اور عشر کا نظام متعارف کرایا۔ بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹس اور دیگر سرمایہ کاری ڈیپازٹس پر ہر سال 2.5 فیصد زکوۃ کاٹ لی جاتی۔ فقہ جعفریہ نے زکوۃ کے اس نظام کے خلاف اسلام آباد میں زبردست احتجاج کیا تو ان کو زکوۃ ٹیکس سے مستثنٰی قرار دے دیا۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں شریعت فیکلٹی قائم ہوئی۔ اسلام آباد میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ سکول اور کالج کے تعلیمی نصاب کو تبدیل کر کے اسے اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا۔ الیکٹرانک میڈیا کو اسلامی اقدار اور ثقافت کو اجاگر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ خواتین نیوز کاسٹرز کو سر پر دوپٹہ اوڑھنے کا پابند بنایا گیا۔ موسیقی اور کلاسیکل ڈانس کے پروگراموں کی حوصلہ شکنی کی گئی۔

سرکاری دفتروں میں نماز کی ادائیگی کو یقینی بنایا گیا۔ لوگوں کو نماز کی جانب راغب کرنے کے لیے ناظمین صلوٰۃ مقرر کیئے گئے۔ ایک آرڈی نینس کے ذریعے احمدیوں پر اسلام کا نام استعمال کرنے، کلمہ پڑھنے اور قرآن کی تلاوت پر پابندی لگا دی گئی۔ قرارداد مقاصد جو آئین کے دیباچے میں شامل تھی اسے آئین میں ترمیم کر کے دستور کا لازمی حصہ قرار دیا گیا۔ آئین کے آرٹیکل 62 میں ترمیم کر کے اراکین اسمبلی کی اہلیت میں اچھے کردار کا حامل ہونے اور اسلامی شعائر کی پابندی کی شرط شامل کی گئی۔ رکن اسمبلی کے لیے لازمی ٹھہرا کر وہ امین اور دیانت دار ہو اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بہرہ ور ہو۔ رمضان آرڈیننس جاری ہوا جس کے مطابق رمضان کے دوران پبلک مقامات پر کھانے پینے اور سگریٹ نوشی کرنے والے کے لیے پانچ سو روپے جرمانہ اور دو ماہ قید کی سزا مقرر کی گئی۔

قدامت پرست سوسائٹی میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کی پالیسی سے فوج متاثر ہوئی۔ تبلیغی جماعت کا فوج میں اثر و رسوخ بڑھا۔ فوج میں یہ سوچ پروان چڑھی کہ ایک مسلمان فوجی درجن ہندو فوجیوں پر بھاری ہے اور ہندو فوجی بزدل ہیں۔ [30] قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر کے بجائے اسلامسٹ قرار دیا گیا اور

[29] المشیر (ہفت روزہ) شمارہ 26 (1984) صفحہ 172

[30] سٹیفن کوہن "Pakistan Army" صفحہ 42,169,171

علماء کو تحریک پاکستان کے ہراوّل دستہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ [31] مئی 1982ء میں ضیاء الحق نے کہا:۔

"Preservation of Pakistan ideology and Islamic charactor of the country was as important as the security of the country's geographical boundries" [32]

ترجمہ: ''نظریہ پاکستان اور اسلامی کردار کا تحفظ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع ضروری ہے۔'' [32]

ضیاء کی بلا سوچی سمجھی اسلامک ریفارمز نے پاکستانی سماج کو مذہبی حوالوں سے تقسیم کر دیا۔ فرقہ واریت میں اضافہ ہوا۔ سپاہ صحابہ، سپاہ محمد، سنی تحریک، لشکر طیبہ اور لشکر جھنگوی جیسی انتہا پسند تنظیمیں وجود میں آئیں۔ شیعہ سنی اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ مساجد اور امام بارگاہوں کے اندر دہشت گردی کی وارداتیں ہونے لگیں۔ ضیاء نے قومی سیاسی جماعت پی پی پی کو کمزور کرنے کے لیے ایم کیو ایم جیسی لسانی اور علاقائی تنظیموں کی حمایت کی اور مخلوط انتخاب کی بجائے جداگانہ طریقہ انتخاب رائج کیا۔ دوسری علاقائی تنظیموں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ضیاء نے جی ایم سید کے گاؤں جا کر انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا اور انہیں محبّ الوطن قرار دیا حالانکہ جی ایم سید سندھ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی حامی تھے۔

ضیاء نے اپنے دور میں فوج کو نوازا۔ فوج کو ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ، فارن سروس اور پولیس میں اہم عہدوں پر فائز کیا۔ 1982ء میں پاکستان کے 42 سفیروں میں سے 18 فوجی تھے۔ 1980ء سے 1985ء تک 96 آرمی افسروں کو سول سروس کے اعلٰی عہدوں پر مستقل اور 115 ریٹائرڈ فوجیوں کو کنٹریکٹ پر بھرتی کیا گیا۔ 6150 فوجی افسروں کو 144,804 ایکڑ زرعی اراضی الاٹ ہوئی۔ فوجیوں کے لیے سول سروس میں 10 فیصد کوٹہ مقرر ہوا۔ فوجی فاؤنڈیشن، بحریہ فاؤنڈیشن اور شاہین فاؤنڈیشن کے اثاثوں میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ [33] تیس ہزار فوجی کنٹریکٹ ملازمت پر سعودی عرب، اردن، لیبیا، اومان، متحدہ عرب امارات اور دوسرے ملکوں میں بھیجے گئے۔ [34]

مارچ 1980ء میں ریٹائرڈ میجر جنرل تجمل حسین نے جنرل ضیاء الحق کو اقتدار سے محروم کرنے کی ایک سازش تیار کی۔ سازش کے مطابق فوج کے کور کمانڈرز کو اس وقت گرفتار کیا جانا تھا جب وہ راولپنڈی میں فارمیشن کمانڈرز کانفرنس میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔ تجمل حسین کا ایک بیٹا لیفٹیننٹ نوید تجمل اور بھتیجا میجر ریاض حسین اس بٹالین میں سروس کر رہے تھے جو ایوان صدر کی سیکیورٹی پر مامور تھی۔ میجر جنرل تجمل حسین اس بٹالین کو کمانڈ کر چکے تھے۔ اس بٹالین کی مدد سے جنرل ضیاء الحق کو گرفتار کر کے ان سے اقتدار

[31] آئن ٹالبوٹ "India and Pakistan" صفحہ 201

حوالہ سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 84

[32] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 242

[33] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 243

[34] شاہد جاوید برکی "Zia's Eleven Years"

انقلابی کونسل کو منتقل کرانا اور اس کا اعلان ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کرانا تھا۔ جنرل تجمل کے عدالتی بیان کے مطابق وہ پاکستان کو مارشل لاء سے نجات دلا کر حقیقی اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ مخبری کی بناء پر یہ سازش پکڑی گئی اور کورٹ مارشل کے بعد میجر جنرل تجمل حسین کو چودہ سال اور ان کے بیٹے اور بھتیجے کو دس سال قید بامشقت سنائی گئی۔ فوج کے اندر یہ تیسری بغاوت تھی جو ناکام ہوئی۔ [35]

1980ء کے اوائل میں روس نے افغانستان میں اپنی افواج داخل کیں تو پاکستانی عوام سے زیادہ امریکی انتظامیہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ امریکہ اور روس سرد جنگ کے آخری دور میں داخل ہو چکے تھے۔ امریکہ کو خطرہ تھا کہ اگر روس کی افغانستان میں مزاحمت نہ کی گئی تو مڈل ایسٹ میں اس کے مفادات خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے افغانستان میں روسی مداخلت کی مذمت سے گریز کیا۔ مارشل لاء کے نفاذ، بھٹو کے قتل اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی بناء پر امریکہ اور مغرب ضیاء کے خلاف تھا۔ پاکستان کو بھارت کی جانب سے خطرات لاحق تھے اور اسے مالی اور عسکری امداد کی ضرورت تھی۔ ضیاء روس کے خلاف امریکہ سے تعاون کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکتے تھے۔ امریکہ کو پراکسی وار (proxy war) کے لیے پاکستان کے تعاون کی ضرورت تھی۔ امریکن سی آئی اے اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا اور آئی ایس آئی نے افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کا چارج سنبھال لیا۔ ضیاء اگر دور بین ہوتے تو سوچتے کہ روس کی ناکامی کے بعد امریکہ عالم اسلام کو دبانے کی کوشش کرے گا اور عالمی نظام کا توازن ہی بگڑ جائے گا۔ آئی ایس آئی نے امریکی ڈالروں اور اسلحہ کو مجاہدین کے گروپوں میں تقسیم کیا۔ فوج کے جرنیل خود بھی فیض یاب ہوئے۔ [36] امریکی صدر ریگن نے دوسری بار منتخب ہونے کے بعد پاکستان کی امداد 100 ملین ڈالر سالانہ سے بڑھا کر 285 ملین ڈالر کر دی۔ یہ امداد حکومت پاکستان کو براہ راست دی جاتی جسے افغانستان جہاد کے لیے تقسیم کیا جاتا۔ [37]

پاکستان کے مختلف علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے مذہبی مدرسے قائم ہوئے جن میں ملکی اور غیر ملکی افراد کو عسکری تربیت دی گئی۔ دینی مدارس کے طلبہ کو جذبہ جہاد سے سرشار کیا گیا۔ لاکھوں طلبہ پر مشتمل پوری نسل کی تربیت فلسفہ جہاد اور شہادت کے اُصول پر کی گئی۔ مجاہدین کے درجنوں گروپ نمودار ہوئے۔ امریکہ نے جذبہ جہاد کو اُبھارا اور امریکی سی آئی اے نے اسامہ کو مسلمانوں کے ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ افغان جہاد کے دوران روسی اور افغانی افواج نے پانچ ہزار بار پاکستان کی فضائی اور زمینی سرحدوں کی خلاف ورزیاں کیں جن کی وجہ سے 2362 پاکستانی ہلاک ہوئے۔ [38] افغانستان سے تیس لاکھ مہاجرین

---

[35] جنرل کے ایم عارف "Khaki Shadows" صفحہ 159

[36] E.Girardet "Afghanistan: The Soviet War" صفحہ 67

[37] کلدیپ نیئر "Wall At Wahga" صفحہ 100

[38] جنرل کے ایم عارف "Working With Zia" صفحہ 329

پاکستان آئے جنہوں نے پاکستان کی معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی پر انتہائی منفی اثرات مرتب کیے۔ [39] ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر نے پاکستانی معاشرے کو تباہ کر دیا۔ سرحد اور بلوچستان افغان جہاد اور مہاجرین کی آمد سے زیادہ متاثر ہوئے۔ مہاجرین نے کراچی کا رخ کر کے مقامی آبادی کے لیے مسائل پیدا کیے۔ پنجاب کے بارے میں ولی خان نے دلچسپ ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ افغان جہاد ایک ایسی وحشی گائے ہے جس کے سینگ صوبہ سرحد نے پکڑ رکھے ہیں اور دودھ پنجاب پی رہا ہے۔ [40] پاکستان آج تک ضیاء کی اس مہم جوئی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

ضیاء اُمور مملکت میں مصروف رہے، انہوں نے مستقل آرمی چیف بنانے سے گریز کیا اور فوج کی پیشہ وارانہ صلاحیت متاثر ہوئی۔ آئی ایس آئی کا بنیادی فرض پاکستانی سرحدوں کی سکیورٹی تھا مگر قومی سلامتی کا یہ ادارہ افغان جہاد میں مصروف رہا۔ بھارت نے پاکستان کی کمزوری کا فائدہ اُٹھایا اور سیاچین کی قائد پوسٹ پر قبضہ کر لیا۔ سیاچین کی جنگ میں سینکڑوں فوجی جوان شہید اور زخمی ہوئے۔ پاکستان کو ہر سال اربوں روپے سیاچین کے محاذ پر خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ [41] آئی ایس آئی بھارت کی ایک بریگیڈ فوج کی نقل و حرکت کا پتہ نہ چلا سکی۔ جس نے پاکستانی علاقے سیاچین پر قبضہ کر لیا۔ ضیاء نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "سیاچین پر تو گھاس بھی نہیں اُگتی۔" کوئی مستقل پروفیشنل آرمی چیف ارض وطن کے بارے میں ایسا بیان نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی جمہوری حکومت ہوتی تو وہ سیاچین میں مجرمانہ غفلت پر آرمی چیف کو ڈس مس کر دیتی۔ [42]

افغان جہاد ضیاء کے اقتدار کے لیے نیک فال ثابت ہوا البتہ پاکستان کو یہ فائدہ ہوا کہ امریکہ نے روس کے خلاف جہاد میں پاکستان کے مثبت کردار کی وجہ سے معلومات کے باوجود ایٹمی ٹیکنالوجی میں پیش رفت پر اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ جولائی 1985ء میں کارنیگی ٹاسک فورس نے رپورٹ دی کہ پاکستان کے پاس اس قدر ایٹمی مواد موجود ہے جس سے وہ ایک سال میں چار ایٹمی ہتھیار تیار کر سکتا ہے جبکہ بھارت کے پاس اس قدر پلاٹینم موجود ہے جس سے وہ پندرہ سے تیس ایٹمی ہتھیار سالانہ بنا سکتا ہے۔ [43] 17 دسمبر 1987ء میں فلاڈلفیا (Philadelphia) کی عدالت نے پاکستانی نژاد کینیڈین شہری ارشد پرویز کو مجرم قرار دیا کہ اس نے پاکستان کو حساس نوعیت کا ایٹمی مواد سمگل کیا ہے جس سے یورینیم افزودہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر حکمران عام طور پر اور ہر آمر خاص طور پر اس وہم میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ عوام میں بڑا مقبول ہے۔

---

[39] C. Baxter "Zia's Pakistan" صفحہ 93-110

[40] Wirsing "Pakistan's Security Under Zia" صفحہ 52

[41] لیفٹیننٹ جنرل جہاں داد خاں "Pakistan Leadership Challenges" صفحہ 224

[42] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 172

[43] Wirsing "Pakistan's Security Under Zia" صفحہ 123

اسی وہم کی بناء پر ضیاء نے 19 دسمبر 1984ء کو ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا جس کا مقصد اپنی صدارت کو مستحکم کرنا تھا۔ ریفرنڈم میں جو سوال پوچھا گیا اس کی عبارت یہ تھی:۔

"Whether the people of Pakistan endorse the process initiated by General Zia-ul-Haq, the president of Pakistan to bring the laws of Pakistan in conformity with the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunnah of the Holy Prophet (Peace Be Upon Him) and for the preservation of idealogy of Pakistan for the continuation and consolidation of that process and orderly transfer of power to the elected representatives of the people."

ترجمہ: ''کیا پاکستان کے عوام صدر جنرل ضیاء الحق کے اس عمل کی تائید کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان کے قوانین کو قرآن اور سنت رسول ﷺ کے مطابق اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے شروع کیا ہے اور کیا آپ اس عمل کو جاری رکھنے اسے مزید استوار کرنے اور اقتدار پرامن طریقے سے عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔''

ریفرنڈم کے بیلٹ پیپر پر ''ہاں''(yes) کو سبز خانے اور ''نہیں''(No) کو سفید خانے میں پرنٹ کیا گیا۔ ضیاء نے اسلام کے پردے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔ عوام کے لیے اس سوال کا جواب ''نہیں'' میں دینا ممکن نہ تھا۔ ● ریفرنڈم آرڈر کے تحت ریفرنڈم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور اخباری بیان جاری کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ریفرنڈم میں کامیابی کا مطلب یہ تھا کہ ضیاء مزید پانچ سال کے لیے پاکستان کے صدر رہیں گے۔ ایم آر ڈی اور اپوزیشن کی دیگر سیاسی جماعتوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ پولنگ ڈے پر پولنگ سٹیشن ویران تھے۔ ضیاء نے عوام کی سہولت کے لیے پولنگ ڈے پر عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ سڑکیں اور بازار سنسان رہے۔ عوام نے ووٹ کا حق استعمال کرنے سے گریز کیا اس کے باوجود چیف الیکشن کمشنر نے اعلان کیا کہ 62.15 فیصد عوام نے ووٹ کا حق استعمال کیا اور 97.71 فیصد نے سوال کا جواب ''ہاں'' میں دیا۔ عوامی شاعر حبیب جالبؔ نے اس ریفرنڈم کے بارے میں کہا:۔

شہر میں ہُو کا عالم تھا
ریفرنڈم تھا یا کوئی جن تھا

ریفرنڈم کے بعد ضیاء نے اپنے آپ کو پاکستان کے مسلمانوں کا امیر المومنین سمجھنا شروع کر دیا۔ ریفرنڈم میں ''شاندار'' کامیابی حاصل کرنے کے بعد ضیاء نے فروری 1985ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ آٹھ سال تک بلا شرکت غیرے اقتدار میں رہنے کے بعد بھی جنرل

● Ritcher "Pakistan in 1984" صفحہ 147

ضیاء نے جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کی جرأت نہ کی۔ اگر ضیاء کو ریفرنڈم میں عوام کی حقیقی تائید حاصل ہوئی ہوتی تو وہ سیاسی جماعتوں کو انتخابات سے باہر نہ رکھتے۔ آمر طویل عرصہ ہی اقتدار میں کیوں نہ رہے عوام اسے دل سے قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب اور ضیاء براہ راست صدارتی انتخاب لڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ایم آر ڈی نے 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ ایم آر ڈی کے لیڈر جرنیلوں کو سینئر پارٹنر کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان انتخابات نے سیاسی جماعتوں کو کمزور کیا اور غیر سیاسی لوگ سرمائے، برادری اور پیری مریدی کے زور پر پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ [15] جاگیردار، تاجر، صنعت کار اسمبلیوں کے رکن منتخب ہو گئے۔ ان انتخابات میں عوام نے ضیاء کے کئی قریبی رفقاء کو مسترد کر دیا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ عوام ضیاء کی حکومت اور سیاست سے مطمئن نہیں تھے۔

جنرل ضیاء نے 23 مارچ 1985ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں منتخب صدر کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ نئی منتخب قومی اسمبلی اور سینٹ نے آٹھویں ترمیم منظور کر لی جس کے مطابق ضیاء کو اپنے سابقہ سیاسی، آئینی اور معاشی کردار اور تمام احکامات کو آئینی تحفظ حاصل ہو گیا۔ ضیاء نے اسمبلی کو توڑنے، وزیراعظم کو ڈس برخاست کرنے، چاروں صوبوں میں گورنر نامزد کرنے اور فوج میں سروس چیفس تعینات کرنے کے اختیارات حاصل کر لیے۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے رکن قومی اسمبلی محمد خاں جونیجو کو پاکستان کا وزیراعظم نامزد کیا گیا اور مارشل لاء کو 30 دسمبر 1985ء تک جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ ضیاء کو آئینی گارنٹی دینے کے لیے ان کا نام آئین میں شامل کیا گیا اور تحریر ہوا کہ ضیاء الحق 23 مارچ 1990 تک پاکستان کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔

ضیاء الحق کا خیال تھا کہ انہیں خدا کی جانب سے ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

"God's choosen man answerable only to God and not to the people."

ترجمہ: ''خدا کا چنا ہوا بندہ ہوں اور صرف خدا کو جواب دہ ہوں۔ عوام کو (جواب دہ) نہیں ہوں۔''

جب کوئی آمر ٹینک پر بیٹھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے اور خدا کا نائب بن جائے اور عوام کو جواب دہ نہ ہو تو پھر اس سے کیا توقع کی جائے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

ضیاء اگست 1988 تک صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔ انہوں نے اپنے نامزد وزیراعظم جونیجو کو اپنا ڈپٹی بنانے کی کوشش کی۔ جونیجو نے اپنے آئینی اختیارات استعمال کرنے شروع کیے تو ضیاء جونیجو سرد جنگ شروع ہو گئی۔ جس میں پارلیمنٹ ہار گئی اور وردی بالادست رہی۔

[15] محمد وسیم "Election Politics in 1985" روزنامہ مسلم، 21 اپریل 1985

باب8

ضیاء جونیجو سرد جنگ

"Government will put the Generals in Suzukis."

ترجمہ: ''حکومت جرنیلوں کو سوزوکی کاروں میں ڈال دے گی۔''

وزیراعظم محمد خان جونیجو نے یہ الفاظ قومی اسمبلی میں اپنے خطاب کے دوران کہے۔ ان کا خیال تھا کہ جرنیل جو بڑی سٹاف کاریں استعمال کرتے ہیں، ان پر اخراجات زیادہ آتے ہیں لہٰذا حکومت ان سے بڑی گاڑیاں واپس لے کر انہیں سوزوکی کاریں دے گی۔ وزیراعظم کی یہ بات جرنیلوں کو بہت ناگوار گزری۔

جنرل ضیاء الحق غیر جماعتی انتخابات (1985) کے بعد منتخب عوامی نمائندوں کو سیاسی جماعت تشکیل دینے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یوسف رضا گیلانی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

''جونیجو صاحب غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے وزارت عظمیٰ تک پہنچے تھے۔ اُنہوں نے حلف اُٹھانے کے فوراً بعد ایوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''جمہوریت اور مارشل لاء ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے'' اُنہوں نے سیاسی پارٹی بنانے کا فیصلہ کرلیا مجھے صدر ضیاء الحق نے بلوایا اور کہا کہ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں تھا کہ میں انتخابات کرواتا میں نے ازخود انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروائے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح پارلیمنٹ کو چلایا جائے اور پارلیمانی کمیٹیوں کو مؤثر بنایا جائے۔ وزیر غیر جماعتی ایوان کو جماعتی بنانا چاہتے ہیں جو میرے پروگرام کا حصہ نہیں ہے آپ اُنہیں قائل کریں کہ وہ اپنی پارٹی نہ بنائیں میں نے وزیراعظم سے ملاقات کر کے صدر کا پیغام پہنچایا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ صدر صاحب تو چاہیں گے کہ ہم ان کے مرہون منت رہیں مگر پارلیمانی طرز حکومت کا تصور سیاسی پارٹیوں کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم پارٹی بنا کر ایوان کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں''*

ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل نے سینئر کمانڈرز پر حکومتی تنقید کی مذمت میں اخبارات میں ایک آرٹیکل لکھا۔ ❶ جس کے بعد فوج کے لائف سٹائل کے بارے میں بحث شروع ہوگئی۔

---

❶ اعجاز عظیم "The General Bashing Must Stop" روزنامہ نیشن 25 جون 1987

* یوسف رضا گیلانی ''چاہ یوسف سے صدا'' صفحہ 87

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار جونیجو کے دور میں دفاع کے بجٹ کو پارلیمنٹ کے کنٹرول میں لانے کے لیے سنجیدہ کوشش کی گئی۔ دفاعی بجٹ اور اخراجات کا پارلیمنٹ کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ [2] پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ایک بیان میں کہا:۔

"If you do not keep our people informed of our defence potential, it does not mean that the others do not know about it."

ترجمہ: ''اگر آپ ہمارے عوام کو دفاعی صلاحیت سے باخبر نہیں رکھتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے بھی اس سے بے خبر ہیں۔''

ضیاء نے 22 مئی 1988ء کو اپنی ایک تقریر میں کہا:۔

''ہم یونیفارم میں کوئی فرشتے نہیں ہیں اور ہمیں اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف کرنا چاہیے۔ افواج پاکستان کو عوامی تنقید کے بارے میں زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیئے۔ افواج پاکستان کا ادارہ اب کوئی مقدس گائے نہیں ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ قومی دفاع مستحکم ہوتا رہے۔ پاکستان دفاعی اخراجات میں کمی کرنے یا انہیں منجمد کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ہم پاکستان کی سلامتی کے خلاف خطرے کو منجمد نہیں کر سکتے۔''

اس بیان کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ضیاء نے وزیراعظم جونیجو اور قومی اسمبلی کو برخاست کر دیا جس کی تنقید افواجِ پاکستان کے خلاف بڑھتی جارہی تھی۔ [3] ضیاء نے آرمی چیف کی حیثیت سے دوسری جمہوری حکومت کو ختم کیا۔

1985 کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد ضیاء کی نظر میں وزیراعظم کے منصب کے لیے سندھ کی دو سیاسی شخصیتیں تھیں۔ الٰہی بخش سومرو اور محمد خان جونیجو، دونوں جاگیردارانہ پس منظر کے حامل تھے۔ جونیجو ضیاء کابینہ میں ریلوے کے وزیر کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے۔ سندھ کی روحانی اور سیاسی شخصیت پیر پگارا نے جونیجو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ضیاء انہیں وزیراعظم نامزد کرنے پر راضی ہوگئے۔ جونیجو ایک شریف اور دیانت دار سیاست دان تھے۔ پاکستان کے عوام فوجی اقتدار اور اس کے منفی اثرات سے تنگ آچکے تھے۔ جونیجو نے آئین کے مطابق خارجہ اُمور پر سول حکومت کی اتھارٹی قائم کرنے کی کوشش کی۔ [4]

1985ء کی قومی اسمبلی نے سپیکر کے لیے ضیاء کے پسندیدہ اُمیدوار خواجہ صفدر کے مقابلے میں سید فخر امام کو منتخب کر کے اپنی جہت کی نشاندہی کر دی۔ جونیجو کی کوشش یہ تھی کہ وہ ضیاء سے فاصلے پر رہیں تاکہ وہ عوامی مقبولیت حاصل کر سکیں۔ فخر امام نے سپیکر منتخب ہونے کے بعد ایوان کو غیر جانبدار حیثیت سے چلانے کی کوشش کی۔ ضیاء نے 30 دسمبر 1985 کو مارشل لاء اُٹھالیا۔ اس کا کریڈٹ جونیجو کو جاتا ہے جنہوں نے صوبائی

---

[2] مشاہد حسین "Civil Military Relations" فرنٹیئر پوسٹ 23 مارچ 1990ء

[3] مشاہد حسین "Civil Military Relations" فرنٹیئر پوسٹ 23 مارچ 1990ء

[4] سٹیفن کوہن "Ideology of Pakistan" صفحہ 145

اسمبلیوں اور قومی اسمبلی سے مارشل لاء کے خاتمے کے لیے قراردادیں منظور کروا کر ضیاء پر دباؤ ڈالا۔

مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بے نظیر بھٹو خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے 10 اپریل 1986ء کو لاہور میں آئیں تو پاکستان کے عوام نے ان کا پرجوش بے مثال تاریخی استقبال کیا۔ ان کا جلوس دس گھنٹے میں ایئر پورٹ سے مینار پاکستان پہنچا۔ جونیجو نے پی پی پی کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی اور سیاسی و جمہوری سرگرمیوں کی پوری آزادی دی۔ جونیجو کو اپنے دور میں فرقہ واریت، مذہبی انتہا پسندی اور لسانی بنیادوں پر کشیدگی کا سامنا کرنا پڑا۔ مذہبی مدرسوں کو قابلِ ذکر زکوٰۃ فنڈ دیا جاتا تھا جو 9.40 ملین روپے (1980-81) سے بڑھ کر 68.96 ملین روپے (1986-87) ہوگیا اور مدرسوں کی تعداد بھی اس عرصے میں 636 سے بڑھ کر 2084 ہوگئی۔ [5]

ضیاء نے مذہبی جماعتوں کو جونیجو حکومت پر تنقید کرنے کی ترغیب دی۔ مذہبی رہنما جونیجو کے خلاف بیان جاری کر کے الزام لگاتے رہے کہ وہ اسلامائزیشن کے عمل کو آگے بڑھانے میں ناکام ہوئے ہیں۔ [6] جونیجو نے عوامی سطح پر ضیاء کے خلاف بیانات دینے سے گریز کیا۔ جونیجو اور ان کے رفقاء عوام کے مطالبات، ان کی سیاست میں شراکت اور سوشل جسٹس کے بارے میں بڑے حساس تھے تاکہ ان کی حکومت عوام میں مقبول رہے۔ ضیاء کا حلقہ اور طاقت فوج تھی لہٰذا فوج کے مفادات کا تحفظ ان کی اوّلین ترجیح تھی۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس سے صدر ضیاء الحق کے خطاب کے بعد اراکین اسمبلی نے بحث کے دوران ضیاء سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ صدر اور آرمی چیف میں ایک عہدہ اپنے پاس رکھیں۔ [7] جونیجو نے 2 جولائی 1986 کو گیارہ نکاتی پروگرام جاری کیا جس کا مقصد شہری اور دیہاتی آبادی کی ترقی اور خوشحالی کے لیے سماجی اور معاشی اصلاحات نافذ کرنا تھا۔ [8]

ضیاء اور جونیجو کے درمیان سرد جنگ کی وجہ سے کشیدگی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ فوج کے پسندیدہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کو ضیاء کی خواہشات کے مطابق خارجہ پالیسی چلانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وزیراعظم جونیجو آئین کے مطابق خارجہ اُمور پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا چاہتے تھے۔ فوج سندھ میں پنوں عاقل اور تین دوسری جگہوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کرنا چاہتی تھی۔ سندھ کے قوم پرست لیڈر چھاؤنیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ جونیجو نے ضیاء کی خواہش کے برعکس چھاؤنیوں کے قیام کے لیے کھلے عام حمایت سے گریز کیا۔

جونیجو نے آرمی افسروں کی پروموشن کے سلسلے میں اپنا آئینی اختیار دلیری کے ساتھ استعمال کیا۔

---

[5] حسن عسکری رضوی "Military, State And Society in Pakistan" صفحہ 198

[6] روزنامہ جنگ 3 جولائی 1985

[7] روزنامہ مسلم 5 مئی 1987

[8] Eliza Van Hollen "Pakistan in 1986" صفحہ 145

انہوں نے پیرداد خان اور شمیم عالم خان کی کور کمانڈر کے منصب کے لیے پروموشن پر اعتراض کیا۔ ضیاء ان دونوں فوجی افسروں کو پروموٹ کرنا چاہتے تھے۔

جونیجو نے 1986ء میں امریکہ کا دورہ کیا۔ امریکہ ضیاء سے کام لے چکا تھا لہٰذا اس نے جونیجو کو تھپکی دی کہ وہ مکمل جمہوریت کے لیے سول حکومت سے تعاون کرے گا۔ پاکستان کے عوام افغان جنگ سے تنگ آچکے تھے۔ جونیجو عوامی خواہشات کے پیش نظر جنیوا معاہدہ کے حق میں تھے جبکہ ضیاء مزید وقت چاہتے تھے تاکہ پاکستان افغانستان میں اپنی ہمنوا عبوری حکومت قائم کر سکے۔ ضیاء اور جونیجو کے درمیان اس ایشو پر اختلافات شدید ہوگئے۔ [9] روس اپنی افواج افغانستان سے نکالنا چاہتا تھا۔ جونیجو نے سیاسی دباؤ بڑھانے کے لئے جنیوا مذاکرات کے بارے میں گول میز کانفرنس بلائی جس میں بے نظیر بھٹو سمیت پاکستان کے تمام قابل ذکر سیاست دان شریک ہوئے۔ کانفرنس کے شرکاء نے سول حکومت کے موٴقف کی تائید کر دی۔ روس اور امریکہ نے بھی جنیوا معاہدے کے حق میں دباؤ ڈالا اور جونیجو نے جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ ضیاء نے سول حکومت کے اس اقدام پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ امریکی سفیر کے مطابق ضیاء پاکستان اور افغانستان کے درمیان کنفیڈریشن قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ آٹھ سال کے جہاد کے بعد پاکستان کو افغانستان میں اپنی پسند کی حکومت بنانے کا حق حاصل ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ افغانستان میں بادشاہ کے دور کی طرح ایسی حکومت قائم ہوجائے جہاں پر پندرہ سو بھارتی ایڈوائزر ہوں۔ [10]

راولپنڈی میں صوبائی اسمبلی کے ایک رکن اور فوجی افسروں کے درمیان ہاتھا پائی نے سول حکومت اور فوج میں کشیدگی میں اضافہ کر دیا۔ یہ اتفاقی حادثہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عوام اور فوج کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے جس کی بڑی وجہ جنرل ضیاء الحق کا اقتدار کے ساتھ چمٹے رہنا تھا۔ [11] جونیجو حکومت کی برطرفی کے بعد اس ایم پی اے کو گرفتار کر لیا گیا۔

10 اپریل 1988ء کو راولپنڈی اوجڑی کیمپ (فوجی اسلحہ کا ڈپو) کے المناک حادثے نے جونیجو اور ضیاء کے اختلافات کو عروج پر پہنچا دیا۔ اوجڑی کیمپ میں آگ لگنے سے میزائل پھٹ گئے جن سے راولپنڈی اور اسلام آباد کے علاقے متاثر ہوئے۔ ایک سو شہری ہلاک اور 1100 زخمی ہوئے۔ اربوں روپے کا اسلحہ اور پراپرٹی تباہ ہوگئی۔ وزیراعظم جونیجو نے اس حادثہ کی تحقیقات کا حکم دیا۔ اس ضمن میں ایک غیر مصدقہ خبر یہ تھی کہ آئی ایس آئی نے اوجڑی کیمپ کو خود تباہ کرایا کیونکہ امریکہ نے پاکستان سے اسلحہ کا حساب مانگ لیا تھا اور امریکہ کا ایک نمائندہ اسلحہ کا ڈپو چیک کرنے کے لیے پاکستان آرہا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ جونیجو انکوائری رپورٹ ملنے کے بعد جنرل اختر عبدالرحمٰن چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی (جو مارچ 1987ء تک

[9] R.G.Wirsing "Pakistan's Security Under Zia" صفحہ 66
[10] S. Harrison "Out of Afghanistan" صفحہ 259
[11] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 202

آئی ایس آئی کے ڈی جی رہے) اور ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی میجر جنرل حمید گل کے خلاف سخت ایکشن لیں گے۔ ضیاء نے ان دونوں جرنیلوں کو بچانے کے لیے جونیجو کی منتخب سول حکومت کو برطرف کر دیا۔ [12]
جونیجو غیر ملکی کامیاب دورے کے بعد پاکستان واپس آرہے تھے۔ اپنی حکومت کے خاتمے کی خبر انہیں ایئرپورٹ پر ملی۔ ضیاء نے کہا کہ:

"Military needed patrons not prosecutors."

ترجمہ: "فوج کو سرپرستوں کی ضرورت تھی مقدمے چلانے والوں کی نہیں۔"

جونیجو کی سول حکومت ایک پاپولر حکومت تھی۔ پاکستان کے عوام اس کی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے پاس جونیجو حکومت کے خاتمے کے لیے کوئی آئینی اور اخلاقی جواز نہیں تھا۔ سپریم کورٹ نے بھی ضیاء کے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیا۔ جونیجو کی برطرفی کے بعد ضیاء اور جونیجو کے درمیان ہونے والی سرد جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔ ایک غیر مقبول جنرل نے ایک مقبول حکومت کو ختم کر دیا۔ جونیجو سنجیدہ کوشش کے باوجود منتخب سول جمہوری حکومت کی فوج پر بالادستی قائم نہ کر سکے۔

جونیجو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیاء نے اپنی نئی کابینہ تشکیل دی۔ انہوں نے شریعت آرڈی نینس جاری کیا اور شریعت کو سپریم لاء قرار دیا۔ اراکین اسمبلی کے احتساب کا فیصلہ ہوا۔ 16 نومبر 1988ء کو عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔ جونیجو کے کئی رفقاء ضیاء سے جا ملے۔ ضیاء نے جونیجو کو مزید کمزور کرنے کے لیے مسلم لیگ کو تقسیم کر دیا۔

ایک نئی سرکاری لیگ وجود میں آئی جس کے صدر فدا محمد خان اور سیکریٹری جنرل میاں محمد نواز شریف مقرر ہوئے۔ سپریم کورٹ نے غیر رجسٹرڈ سیاسی جماعتوں کو انتخابات لڑنے کا اہل قرار دے دیا۔ عدلیہ کے اس غیر متوقع فیصلے کے بعد ضیاء غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے اور پارلیمنٹ کے اختیارات کم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ 17 اگست 1988ء کو فضائی حادثہ کا شکار ہوگئے۔ ان کا سی ون طیارہ فضا میں آگ لگنے سے جل گیا۔ امریکی سفیر اور سینئر جرنیلوں سمیت طیارے کے تمام مسافر ہلاک ہوگئے۔

جب ضیاء نے 1977ء میں اقتدار سنبھالا تو ملک کا کُل قرضہ جی ڈی پی کا 57 فیصد تھا جب وہ 1988ء میں رخصت ہوئے تو قرضہ جی ڈی پی کا 82 فیصد ہوگیا۔ [13] بیرونی قرضوں کا حجم چھ گنا بڑھ گیا۔ امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک نے ضیاء کو افغان جہاد کے لیے 50 بلین ڈالر کی امداد دی۔ جب ضیاء کے بعد منتخب جمہوری حکومت اقتدار میں آئی تو اس بیرونی امداد کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ اربوں ڈالر حکمرانوں کی جیبوں میں چلے گئے۔ [14] وفاقی وزیر جنرل (ر) یعقوب علی خان (1988) کو ہنگامی دورہ کر

[12] جنرل کے ایم عارف "Working with Zia" صفحہ 388
[13] ایم ضیاء الدین "روزنامہ ڈان" 2 جنوری 2001
[14] سلطان احمد "روزنامہ ڈان" 20 جنوری 2001

کے آئی ایم ایف سے 275 ملین ڈالر کا قرض لینا پڑا تا کہ روز مرہ کے سرکاری اخراجات پورے کیئے جاسکیں۔ سول حکومت کو بیرونی قرضے کی قسطیں ادا کرنے کے لیے کمرشل بینکوں سے قرضہ لینا پڑا۔ [15]

ضیاء کا خلاء پُر کرنے کے لیے فوج کے سروس چیفس نے ایک ہنگامی اجلاس میں سینٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خان کو صدر کے منصب پر فائز کرنے کا فیصلہ کیا۔ وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ نے آرمی چیف کے فرائض سنبھال لیے۔ مرزا اسلم بیگ نے مارشل لاء لگانے سے گریز کیا۔ ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء کی بنا پر عوام فوج کی سیاست میں مداخلت سے بے زار ہو چکے تھے لہٰذا حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ عام انتخابات کرا دیئے جائیں۔ سپریم کورٹ جونیجو حکومت کی برطرفی کے خلاف اپیل کی سماعت کر رہی تھی۔ جنرل اسلم بیگ نے سپریم کورٹ میں پیغام بھیجا کہ جونیجو حکومت کو بحال نہ کیا جائے تا کہ شیڈول کے مطابق نئے انتخابات ہو سکیں۔ [16]

خفیہ ایجنسیوں نے 1988ء کے انتخابات کے دوران پی پی پی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھٹو مخالف سیاسی جماعتوں کا اتحاد قائم کر دیا جسے آئی جے آئی (اسلامی جمہوری اتحاد) کا نام دیا گیا۔ پاکستان کے ممتاز بیرسٹر فاروق ایچ نائیک کے مطابق خفیہ ایجنسیوں نے یونس حبیب کے ذریعے حبیب بینک سے اربوں روپے نکلوا کر اسلامی جمہوری اتحاد کے سیاست دانوں میں تقسیم کیئے بے نظیر نے وزیراعظم بننے کے بعد حبیب بینک کے مالیاتی اُمور کا جائزہ لینے کے لیے ایک انکوائری کمیشن بھی تشکیل دیا۔ یہ کمیشن خفیہ ہاتھوں کے دباؤ کا شکار ہوگیا۔ ڈی جی آئی ایس آئی جنرل حمید گل آئی جے آئی کے معمار تھے۔ بعد میں انہوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے پی پی پی کے مقابلے میں سیاسی اتحاد تشکیل دیا۔ [17] آئی ایس آئی کی سیاسی انجینئرنگ کی وجہ سے کوئی سیاسی جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ پی پی پی قومی اسمبلی کی 93 نشستیں حاصل کر کے اکثریتی پارلیمانی پارٹی کے طور پر اُبھری۔ آئی جے آئی نے 54 نشستیں اور ایم کیو ایم نے 13 نشستیں حاصل کیں۔ جبکہ 27 آزاد امیدوار منتخب ہوئے۔ انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ضیاء الحق کے دور کے بارے میں ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:۔

''ضیاء کا ایجنڈا پیپلز پارٹی کا مکمل خاتمہ، بھٹو کو عوام کے ذہنوں سے نکالنا، آزادی اظہار پر پابندی، مدرسوں اور دینی درس گاہوں کی حوصلہ افزائی، نظریہ فروش لکھاریوں، بھٹو دشمن سیاست دانوں، مطلب پرست دانشوروں اور مولوی حضرات کی قومی خزانے سے خرید اور علماء کو ہمنوا اور بابرکاب بنانا تھا۔ خارجہ پالیسی کے محاذ پر امریکہ کی کاسہ لیسی اور اس کی مدد سے دنیائے اسلام کی قیادت سنبھالنا اور اس سے فائدہ

[15] نمائندہ خصوصی ''روزنامہ ڈان'' 4 فروری 2002

[16] جنرل مرزا اسلم بیگ کا بیان ''روزنامہ ڈان'' 10 فروری 1993

[17] افتخار ملک "State and Civil Society in Pakistan" صفحہ 98

اُٹھا کر داخلی طور پر عوام کو اسلام کے نام پر بیوقوف بنانا تھا۔ گیارہ سالہ طویل آمرانہ اور بلا شرکت غیر جب یہ دور حکومت ختم ہوا تو ملک میں معاشی و صنعتی ترقی کا بیڑہ غرق ہو چکا تھا۔ جمہوریت کی بنیادیں منہدم ہو چکی تھیں۔ فرقہ واریت کے نتیجے کے طور پر باہمی قتل و غارت کا بازار گرم ہو چکا تھا اور معاشرتی انتشار نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ [18]

سٹیفن کوہن جونیجو کے مختصر دور حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

Not corrupt or incompetent, Junejo was a member of the Establishment, but he did question Zia's (and the army's) grand strategy. He wanted to exert his constitutional authority in the area of foreign policy, especially the negotiantions aimed at removing Soviet forces from Afghanistan. Most Pakistanis were tired of the war. The country was overrun with guns, drugs, and Afghan refugees, and Junejo understood this popular anxiety. To the army, however, the war was sustainable, and Pakistanis would have to tolerate it for a while longer, given the larger strategic objectives at stake. These included the expansion of Pakistani influence into Central Asia. For Zia and the military, Juenjo had exceeded his authority by venturing into foreign and security policy affairs — especially Afghanistan — and he was peremptorily dismissed. The Junejo case showed that even an unpopular army chief could defy public opinion and the wishes of a close ally (Washington was pressing for Pakistan's democratisation) and fire a weak prime minister. This happened again in 2004, when a weak prime minister (Jamali) was pressurised to resign by an increasingly unpopular army chief (Musharraf).[19]

ترجمہ: جونیجو کرپٹ اور نااہل نہیں تھے وہ اسٹیبلشمینٹ کے رکن تھے مگر انہوں نے ضیاء (اور فوج) کی مرکزی حکمت عملی پر اعتراض کیا۔ وہ خارجہ پالیسی میں اپنا آئینی اختیار استعمال کرنا چاہتے تھے اور خاص طور پر روسی فوجوں کو افغانستان سے باہر نکالنے کے لیے مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔ پاکستانیوں کی اکثریت جنگ سے تنگ آچکی تھی۔ پاکستان کو اسلحہ، منشیات اور مہاجرین نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور جونیجو کو عوام کی بے چینی کا اندازہ تھا۔ تاہم فوج

[18] ڈاکٹر صفدر محمود ''فوجی حکومتوں کے تحریری اور غیر تحریری منشور'' روزنامہ جنگ 18 جولائی 2005

کے نقطۂ نظر سے جنگ ابھی قابل برداشت تھی اور پاکستان کو کچھ عرصہ مزید جنگ کو برداشت کرنا ہوگا کیونکہ بڑے سٹریٹجک مقاصد خطرے میں تھے۔ جن میں سینٹرل ایشیا میں پاکستان کا اثر ورسوخ کو بڑھانا شامل تھا۔ ضیا اور فوج کے خیال میں جونیجو نے خارجہ اور سکیورٹی کے اُمور میں اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ خاص طور پر افغانستان کے مسئلہ پر ـــ اور انہیں آخر کار برطرف کیا گیا۔ جونیجو کے معاملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مقبول آرمی چیف بھی عوامی رائے اور قریبی اتحادی کی خواہشات کے برعکس فیصلہ کرسکتا ہے (واشنگٹن پاکستان میں جمہوریت کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا) اور کمزور وزیراعظم کو ہٹا سکتا ہے۔ یہ واقعہ 2004 میں دوبارہ ہوا جب ایک انتہائی غیر مقبول آرمی چیف (مشرف) نے ایک کمزور وزیراعظم (جمالی) کو مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔ [49]

کوہن کا خیال درست ہے۔ فوج کے جرنیل ایسے فیصلے بھی کر لیتے ہیں جو عوام میں مقبول نہ ہوں مگر فوج کو یہ یقین ہو کہ عوام اس فیصلے کے خلاف سرگرم احتجاج نہیں کریں گے اور فوج کے اتحادی سیاست دان اس کے فیصلے کو قبول کرلیں گے۔ اگر ضیاء کو اندازہ ہوتا کہ منتخب اسمبلی کے اراکین جونیجو کی برطرفی اور اسمبلیوں کے خاتمے پر احتجاج کریں گے تو وہ کبھی جونیجو کے خلاف فیصلہ نہ کرتے۔ خفیہ ایجنسیاں بڑے فیصلوں کے سلسلے میں عوامی ردعمل کے بارے میں جرنیلوں کو آگاہ کردیتی ہیں۔

سٹیفن کوہن ضیاء کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"Zia declared Martial Law, ruled with a firm hand and tinkered with the 1973 Constitution. He and his colleagues wanted to set Pakistan "straight" or as Zia used to say, correct the politicians qibla, or direction of prayer. Zia's Islamic conservative orientation broke with that of his predecessors. It was partly out of conviction but also used to obtain the support of the Islamic parties, especially the Jamaat-i-Islami." [50]

ترجمہ: ''ضیاء نے مارشل لاء نافذ کیا، آہنی ہاتھوں سے حکومت کی اور 1973ء کے آئین کو بے ڈھنگے پن سے چلایا۔ ضیاء اور اس کے رفقاء پاکستان کو ''راہ راست'' پر ڈالنا چاہتے تھے یا جیسے کہ ضیاء کہا کرتے تھے کہ وہ سیاست دانوں کا قبلہ درست کرنا چاہتے تھے۔ ضیاء نے اسلامی قدامت پسندی کو اپنے پیشرووں کی نسبت نئے رخ پر ڈال دیا۔ یہ کسی حد تک اس کے اپنے پختہ یقین کے مطابق تھا اور اس کا مقصد اسلامی جماعتوں خاص طور پر جماعت اسلامی کا تعاون حاصل کرنا بھی تھا۔'' [50]

---

[49] سٹیفن کوہن "The idea of Pakistan" صفحہ 145

[50] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 125

ضیاء الحق نے سیاست دانوں کا قبلہ درست کرنے کی کوشش میں پاکستان کو گمراہی کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ ایوب اور ضیاء کے طویل دور اقتدار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کے جرنیل جس قدر زیادہ سیاست اور حکومت میں رہیں ملک کو اسی قدر سیاسی، جمہوری، سماجی اور معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عوام چونکہ اپنی آزادی اور دفاع کی خاطر فوج کے ساتھ لڑنے کے متحمل نہیں ہوسکتے لہٰذا فوج کے سینئر کمانڈرز عوام کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور عوام کی مرضی اور منشاء کے برعکس ان پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

باب 9

خاتون وزیراعظم اور اسٹیبلشمنٹ

جنرل ضیاء الحق اور ان کے رفقاء کا پختہ خیال تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹا دیا جائے تو پی پی پی منتشر ہو جائے گی اور بیگم نصرت بھٹو صحت کی خرابی کی بناء پر سرگرم سیاسی کردار سے قاصر رہیں گی۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد بھٹو خاندان سیاست ترک کر دے گا۔ بے نظیر بھٹو، مرتضٰی بھٹو اور شاہنواز بھٹو کم سنی کی بناء پر ضیاء الحق کے خوف کی وجہ سے اپنی تعلیم چھوڑ کر پاکستان آنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ جرنیلوں کے پسندیدہ لیڈر اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے پاکستان پیپلز پارٹی پر قبضہ کر لیں گے۔ جب ضیاء نے بھٹو کو قتل کے ایک مقدمے میں گرفتار کیا تو بے نظیر نے بھٹو کی رہائی کے لیے عملی سیاسی کردار ادا کرنے کا جرأت مندانہ فیصلہ کر کے جنرل ضیاء اور اس کے رفقاء کو حیران و ششدر کر دیا۔ بے نظیر کا یہ فیصلہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ پاکستان کے عوام نے بھٹو کی پھانسی کے بعد بے نظیر کو بھٹو کی سیاسی وارث تسلیم کر لیا۔

1988ء کے انتخابات میں فوجی جرنیلوں کا بڑا خوف یہ تھا کہ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کامیاب ہو گئی تو بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیراعظم منتخب ہو جائیں گی اور فوج کے جرنیلوں کو ایک خاتون وزیراعظم کو سیلوٹ کرنا پڑے گا۔ جرنیل اس صورت حال سے بچنا چاہتے تھے۔ خفیہ ایجنسیوں نے علماء سے فتوے جاری کرائے کہ اسلام میں خاتون وزیراعظم نہیں بن سکتی۔ بے نظیر کا سیاسی مقابلہ کرنے کے لیے آئی ایس آئی نے بھٹو مخالف سیاسی جماعتوں کو آئی جے آئی (اسلامک جمہوری اتحاد) کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا اور آئی جے آئی کو کامیاب کرانے کے لیے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کے خلاف غیر شائستہ انتخابی پروپیگنڈہ مہم چلائی۔ ❶ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل حمید گل انتخابی مہم کے انچارج تھے۔ آئی جے آئی کی تشکیل اور پی پی پی کے مخالف امیدواروں کو کامیاب کروانے کے لیے ان میں اربوں روپے تقسیم کیے گئے۔ حمید گل اور ان کے ڈپٹی بریگیڈیئر امتیاز احمد نے آئی جے آئی کے رہنماؤں کو بتایا کہ اگر بے نظیر کا راستہ نہ روکا گیا تو اسلامک کاز کو نقصان پہنچے گا۔ جنرل حمید گل نے کہا ”آئی ایس آئی کی اطلاعات کے مطابق بے نظیر بھٹو نے امریکہ کو یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام رول بیک کر دیں گی۔“ اور افغانستان، کشمیر میں جہادی

❶ "Waiting For Allah" Christina Lamb صفحہ 39

سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دیں گی۔"❷ جنرل (ر) حمید گل اور بریگیڈیئر امتیاز کے یہ خدشات درست ثابت نہ ہوئے۔ بے نظیر کے وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد نیوکلیئر پروگرام جاری رہا اور خارجہ اُمور فوج کے کنٹرول میں رہے۔ جنرل (ر) حمید گل نے مصنف کو بتایا کہ بے نظیر بھٹو کے دور میں 20 اپریل 1989 کو پاکستان کا ایٹمی پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ بے نظیر نے پورا تعاون کیا اور امریکنوں نے کہا "Lady has let us down" (خاتون نے ہمیں زچ کیا)۔❸

بے نظیر اپنے باپ کا ایٹمی پروگرام جس کے لیے انہوں نے اپنی جان قربان کر دی، کیسے رول بیک کر سکتی تھی۔

افواج پاکستان کے آرمی چیف اور آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل (ر) حمید گل انتخابات 1988ء سے قبل آئی جے آئی کے اجلاسوں میں شرکت کر کے انتخابی مہم کا جائزہ لیتے رہے اور ہدایات دیتے رہے۔❹ جنرل اسلم بیگ نے چاروں صوبوں کے گورنروں کو ایک اجلاس میں کہا "ایم کیو ایم میری جیب میں ہے۔ پی پی پی کو 1988ء کے انتخابات نہیں جیتنے چاہئیں۔ فوج بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گی۔"❺

اسٹیبلشمنٹ کی مخالفت کے باوجود پی پی پی نے انتخابات جیت لیے اور قومی اسمبلی میں 93 نشستیں حاصل کر لیں۔ آئی جے آئی کو صرف 54 نشستیں مل سکیں۔ سندھ سے محمد خان جونیجو، غلام مصطفیٰ جتوئی اور الٰہی بخش سومرو انتخاب ہار گئے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد پنجابی جرنیل ضیاء الحق دس سال اقتدار میں رہے۔ ضیاء نے سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیراعظم جونیجو کو بلاجواز برطرف کر دیا تھا۔ لہٰذا کسی سندھی کو اقتدار سپرد کرنا اسٹیبلشمنٹ کی پہلی ترجیح تھی۔❻ سندھ کارڈ بے نظیر کے ہاتھ میں تھا۔ پی پی پی نے ایم کیو ایم سے سمجھوتہ کر کے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لی تھی۔ غلام اسحاق خان اور فوج کے جرنیل کوشش کے باوجود بے نظیر کا راستہ نہ روک سکے۔ صدر اسحٰق نے آئی جے آئی کو دو ہفتے کی مہلت دی مگر آئی جے آئی کے لیڈر قومی اسمبلی میں اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ بے نظیر نے 1990ء میں سپریم کورٹ میں اپنے ایک بیان میں کہا۔

"The referring authority (the President) chose to call my rival before he called me, to signal to the MNAs that he wished my rival to form the government although the latter had only 53

❷ حسین حقانی "Pakistan between Mosque And Military" صفحہ 202
❸ مصنف کا جنرل (ر) حمید گل سے انٹرویو 22 دسمبر 2005 لاہور
❹ پروفیسر غفور احمد "بے نظیر بھٹو نامزدگی سے برطرفی تک" صفحہ 95-102
❺ جنرل کے ایم عارف "Khaki Shadows" صفحہ 325
❻ اقبال اخوند "Trial and Error" صفحہ 39

seats and I had 108....[and] a clear-cut majority....The RA did his best to break my MNAs betwen 16 November and 2 December 1988." ❼

ترجمہ: "ریفرنس دائر کرنے والی اتھارٹی (صدر) نے میرے سیاسی حریف سے مجھ سے پہلے ملاقات کی جس کا مقصد ایم این اے حضرات کو یہ اشارہ کرنا تھا کہ (صدر کی) خواہش ہے کہ میرا سیاسی حریف حکومت بنائے۔ حالانکہ اس کے پاس قومی اسمبلی کی صرف 53 نشستیں تھیں جبکہ میرے پاس 108 نشستیں تھیں اور ایک واضح اکثریت۔ ریفرنگ اتھارٹی (صدر) نے 16 نومبر سے 2 دسمبر 1988ء تک میرے اراکین قومی اسمبلی کو توڑنے کی پوری کوشش کی۔"❼

بے نظیر بھٹو کے ساتھ عوام کی طاقت تھی۔ انہوں نے امریکہ، روس اور دوسرے اہم ملکوں کے سفیروں سے ملاقاتیں کر کے صدر اور جی ایچ کیو پر دباؤ بڑھایا۔ ضیاء کی وفات سے چند روز قبل جی ایچ کیو راولپنڈی کے قریب ایک حادثہ ہوا۔ گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ عوام کے ہجوم نے گاڑی کے مالک فوجی یونیفارم میں ملبوس جونیئر آفیسر کو زدوکوب کیا اور فوج کے خلاف نعرے بازی کی۔ جنرل مرزا اسلم بیگ کا اندازہ تھا کہ فوج طویل اقتدار کی بناء پر عوام میں غیر مقبول ہو رہی ہے۔ لہٰذا عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنا فوج کی مجبوری تھی۔❽ پاکستان پیپلز پارٹی کے کئی رہنماؤں کا خیال تھا کہ بے نظیر کو مشروط اقتدار نہیں لینا چاہیے وہ اگر صبر کا مظاہرہ کر سکیں تو اسٹیبلشمنٹ انہیں مکمل اقتدار سپرد کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ بے نظیر کا خیال تھا کہ اگر جونیجو جیسا سیاست دان جس کی اپنی سیاسی جماعت نہیں تھی اقتدار میں آنے کے بعد جنرل ضیاء الحق سے اپنے آئینی اختیارات لے سکتا ہے تو وہ بھی اقتدار میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ آئینی حیثیت مستحکم کر لیں گی۔❾ بے نظیر مشروط اقتدار لینے پر رضامند ہو گئیں۔

بے نظیر نے غلام اسحٰق خان کو صدر منتخب کرانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ انہوں نے ریٹائرڈ جنرل یعقوب خان کو وزیر خارجہ، سول سرونٹ وی اے جعفری کو وزیراعظم کا مشیر خزانہ قبول کر لیا اور تسلیم کیا کہ وہ فوج کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گی اور نہ ہی دفاعی بجٹ کم کریں گی۔❿ صدر اسحٰق نے 2 دسمبر 1988ء کو بے نظیر بھٹو سے وزارت عظمٰی کا حلف لیا اور بے نظیر کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ جن لوگوں نے بے نظیر اور اس کے حامیوں کو انتقامی کارروائیوں اور تشدد کا نشانہ بنایا وہ اسے سیلوٹ کرتے نظر آئے۔ عوام سوال کرنے لگے کیا بے نظیر کو حکومت کرنے کا موقع دیا جائے گا۔⓫

❼ اقبال اخوند "Trial and Error" صفحہ 40
❽ Christina Lamb "Waiting For Allah" صفحہ 42
❾ اقبال اخوند "Trial and Error" صفحہ 43
❿ Christina Lamb "Waiting For Allah" صفحہ 46-47
⓫ Christina Lamb "Waiting For Allah" صفحہ 39

وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کے بعد بھی بے نظیر کو آئینی اختیارات استعمال کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سول اور ملٹری بیورو کریسی نے ایک منتخب مگر نا تجربہ کار وزیر اعظم سے عملی تعاون سے گریز کیا۔ سرکاری فائلیں وزیر اعظم کی بجائے صدر کو ریفر ہو رہی تھیں۔ بے نظیر نے اسحٰق خان کو فون کیا اور کہا کہ وہ ان کی عزت کی خاطر ڈائریکٹو جاری کرنا نہیں چاہتیں اور مناسب ہوگا کہ وہ خود بیورو کریسی کو ہدایت جاری کر دیں کہ تمام سرکاری فائلیں وزیر اعظم سیکریٹریٹ کو ریفر کی جائیں۔

جنرل اسلم بیگ نے اعتماد بحال کرنے کے لیے منتخب جمہوری حکومت کے حق میں بیانات جاری کیۓ۔ بے نظیر نے بھی فوج کی تعریف کی اور ایک بیان میں کہا کہ ''فوج سیاست میں ملوث نہ ہوئی فوج اور عوام ایک ہیں۔'' [12] جمہوریت کی بحالی میں تعاون پر فوج کے جرنیلوں کو ''تمغۂ جمہوریت'' سے نوازا۔ جنرل اسلم بیگ نے دعویٰ کیا کہ اس نے تین مواقع پر فوجی ڈنڈا استعمال کرنے سے گریز کیا۔ اوّل، ضیاء الحق کے حادثے کے بعد اس نے مارشل لا نافذ کرنے کی بجائے انتخابات کے ذریعے جمہوریت بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوم، جب بے نظیر نے ان فوجی افسروں کی سزائیں ختم کرنے کی فرمائش کی جنہیں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ڈسپلن کی خلاف ورزی پر سزائیں دی گئیں تھیں۔ سوم، جب بے نظیر نے ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر کو آئی ایس آئی کا ڈی جی نامزد کیا۔ [13] کئی مؤرخین کا خیال ہے کہ اسلم بیگ ایک کمزور جرنیل تھے اور مارشل لا لگانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

بے نظیر نے اپنی حکومت کا آغاز محتاط انداز سے کیا۔ ضیاء نے اپنے دور میں کثیر تعداد میں ریٹائرڈ فوجی افسروں کو سول محکموں میں لگایا ہوا تھا بے نظیر نے انہیں ملازمتوں سے فارغ کرنے سے گریز کیا تا کہ عسکری ادارے پر منفی اثرات مرتب نہ ہوں۔ پاکستان کے چار صوبوں میں سے تین صوبوں کے گورنر ریٹائرڈ فوجی جرنیل تھے۔ افغان پالیسی بدستور فوج کے کنٹرول میں رہی۔ صدر الحق کے دو داماد اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ بے نظیر دور میں دفاعی بجٹ میں اضافہ ہوا۔ اعتماد کی بحالی کے ان اقدامات کے باوجود اسٹیبلشمینٹ بے نظیر کو دلی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی اور بے نظیر حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی سرگرمیوں میں ملوث رہی۔ پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت تھی اور نواز شریف صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے انہیں فوج کی سرپرستی حاصل تھی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا موقع تھا کہ مرکز اور پنجاب میں دو مختلف سیاسی جماعتیں اقتدار میں تھیں۔ نواز شریف نے مرکزی حکومت سے محاذ آرائی شروع کر دی۔ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا اور وفاق کی اتھارٹی کو چیلنج کیا۔ [14]

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ چھوٹے صوبے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔ نواز

[12] مشاہد حسین — "Khaki Vs Mufti" — روزنامہ نیشن 15 جولائی 1990

[13] جنرل اسلم بیگ — روزنامہ پاکستان 27 اپریل 1995

[14] سعید شفقت — "Civil Military Relations in Pakistan" — صفحہ 231

شریف نے پہلی بار پنجاب سے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا اور ایجنسیوں کی مدد سے دوسرے صوبوں کے علاقائی لیڈروں سے رابطے کیۓ۔ تا کہ بے نظیر حکومت کے خلاف بڑا محاذ بنایا جا سکے۔ بے نظیر نے نادان مشیروں کے مشورے پر نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کرانے کی کوشش کی جو رائیگاں ثابت ہوئی۔ [15] نواز شریف نے وفاقی حکومت کی منظوری کے بغیر پنجاب بینک قائم کر لیا اور پنجاب کا الگ ٹیلی ویژن سٹیشن قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ وفاقی حکومت نے صوبائی حکومت کو راہ راست پر لانے اور اپنی آئینی رٹ لاگو کرنے کے لیے نواز شریف کے تجارتی مفادات پر ضرب لگائی۔ نواز شریف کے خاندان اور رفقاء کے خلاف ٹیکس نادہندگی اور قرضوں کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں ایک سو ساٹھ الزامات عائد کیۓ گئے۔ [16] پاکستان ریلوے نے اتفاق فاؤنڈری کو کراچی سے لاہور درآمد شدہ سکریپ لانے کے لیے ریلوے ویگن دینے سے انکار کر دیا۔ نواز فیملی کو کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ [17] دونوں منتخب جمہوری لیڈروں نے جمہوری اُصولوں اور روایات کو پامال کیا۔ خفیہ ایجنسیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور محاذ آرائی میں شدت پیدا کی۔

بے نظیر نے سندھ میں پنوں عاقل چھاؤنی کا دورہ کیا۔ سندھ کے سیاست دان فوجی چھاؤنی کے خلاف تھے۔ جونیجو نے اس چھاؤنی کے سلسلے میں ضیاء سے برملا تعاون سے گریز کیا تھا۔ بے نظیر نے پنوں عاقل کا دورہ فوج کی خوشنودی کے لیے کیا۔

افغان مجاہدین نے آئی ایس آئی کی آشیرباد سے جلال آباد پر حملہ کیا جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ بے نظیر آئی ایس آئی کے ڈی جی حمید گل کو تبدیل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہوں نے جلال آباد پر حملے میں ناکامی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جنرل حمید گل کو تبدیل کر کے ایک ریٹائرڈ جنرل شمس الرحمٰن کلو کو آئی ایس آئی کا ڈی جی نامزد کر دیا۔ [18] یہ تبدیلی نان پروفیشنل طریقے سے عمل میں لائی گئی جس سے فوج اور بے نظیر کے درمیان بد اعتمادی پیدا ہوئی۔ جی ایچ کیو نے اہم فیصلوں میں آئی ایس آئی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس رویے سے قومی نقصان ہوا۔ بے نظیر کے جن نادان مشیروں نے ریٹائرڈ جنرل کو آئی ایس آئی کا سربراہ بنانے کا مشورہ دیا انہوں نے ملک، ادارے اور بے نظیر کو نقصان پہنچایا۔ [19] بے نظیر کو خفیہ ذرائع سے اطلاعات ملی تھیں کہ جنرل حمید گل اپوزیشن سے مل کر ان کو اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کر رہے ہیں لہٰذا بے نظیر نے موقع ملتے ہی حمید گل کو ٹرانسفر کر دیا [19A] بے نظیر نے خفیہ ایجنسیوں کی

[15] سعید شفقت — "Civil Military Relations in Pakistan" — صفحہ 232

[16] اقبال اخوند — "Trial and Error" — صفحہ 65

[17] اقبال اخوند — "Trial and Error" — صفحہ 65

[18] شاہین صہبائی — ڈان اور ہیرلڈ ویکلی 14 جون 1989ء

[19] جنرل کے ایم عارف — "Khaki Shadows" — صفحہ 364

[19A] D.KUX — us and Pakistan 1947-2000 — صفحہ 300

کارکردگی کا جائزہ لینے، ان کا رول متعین کرنے اور انہیں مربوط بنانے کے لیے ریٹائرڈ ایئر مارشل ذوالفقار کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔ ان فیصلوں سے فوج اور بے نظیر کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا اور فوج نے جنرل کلو اور ایئر مارشل ذوالفقار سے تعاون نہ کیا بلکہ ان کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ فوج اور بے نظیر کے درمیان اختلافات اس وقت شدید ہوگئے جب بے نظیر نے ایڈمرل افتخار سروہی کو سروس مکمل ہونے پر ریٹائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ سروہی جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ فوج کا مؤقف یہ تھا کہ سروہی 1988ء میں جے سی ایس سی کے چیئرمین تعینات ہوئے تھے لہٰذا وہ تین سال کی ٹرم پوری کر کے 1991ء میں ریٹائر ہوں گے۔ وفاقی حکومت کا خیال یہ تھا کہ سروہی 1986 میں ایڈمرل کے عہدے پر فائز ہوئے تھے لہٰذا وہ اپنی اصل سروس کے ریکارڈ کے مطابق 1989ء میں ریٹائر ہو جائیں گے۔ اس مسئلہ پر صدر اسحٰق نے بھی فوج کا ساتھ دیا۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان انتظامی اُمور پر تلخ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ صدر نے ایک موقع پر وزیراعظم کو یہاں تک کہہ دیا "Impeach me if you wish" (اگر آپ چاہتی ہیں تو میرا مواخذہ کرالیں)۔ صدر اسحٰق کو علم تھا کہ بے نظیر کے پاس پارلیمنٹ میں اس قدر اکثریت نہیں ہے کہ ان کے خلاف مواخذے کی قرارداد منظور ہو سکے۔ [20] وفاقی حکومت لیفٹیننٹ جنرل عالم جان محسود کور کمانڈر لاہور کو ملازمت میں توسیع دے کر انہیں جی ایچ کیو میں سینئر پوزیشن پر تعینات کرنا چاہتی تھی۔ فوج کے سینئر جرنیلوں نے اسے فوجی اُمور میں مداخلت تصور کیا۔ بے نظیر کے امریکہ کے ساتھ تعلقات خوشگوار تھے۔ انہیں جمہوری پاکستان کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ [21] بے نظیر کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان کو ایشیا میں ایک جمہوری ماڈل کے طور پر پیش کریں اور جمہوریت کو خطے میں پھیلائیں اور امریکہ ان سے پورا تعاون کرے۔ [22]

بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی دسمبر 1988ء اور جولائی 1989ء میں پاکستان کے دورے پر آئے۔ راجیو اور بے نظیر دونوں نوجوان سیاسی لیڈر تھے ان کے متعلق عام تاثر یہ تھا کہ وہ ماضی کی نفرتوں کو بھلا کر نئے دور کا آغاز کریں گے۔ [23] پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ طے پایا۔ سیاچین گلیشئر کے بارے میں بھی راجیو نے مثبت ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ خفیہ ایجنسیوں نے دونوں لیڈروں کی ملاقاتوں کو مانیٹر کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قومی سلامتی کے بارے میں بے نظیر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ [24] اس تاثر کا ٹھوس ثبوت پیش نہ کیا جاسکا۔

بے نظیر اقتدار میں تنے ہوئے رسے پر چل رہی تھیں۔ ابھی انہوں نے نو ماہ بھی پورے نہ کیے تھے

- [20] اقبال اخوند — "Trial and Eerror" — صفحہ 67
- [21] زائرنگ — "Pakistan in 1989" — صفحہ 127
- [22] زائرنگ — "Pakistan in 1989" — صفحہ 128
- [23] Barbra Crossette — "New York Times" — December 29, 1988
- [24] ڈاکٹر حسن عسکری — "Military State and Society in Pakistan " — صفحہ 207

کہ اکتوبر 1989ء میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی گئی۔ آرمی چیف جنرل اسلم بیگ نے ایم کیو ایم کو تحریک کی حمایت کرنے کے لیے رضامند کیا۔ صدر اسحٰق اور خفیہ ایجنسیوں نے آئی جے آئی کو سپورٹ کیا۔ آئی ایس آئی نے قومی اسمبلی کے اراکین اسمبلی کی وفاداریاں خریدنے کے۔ لیے سازش تیار کی۔ اس سازش کے مرکزی کردار بریگیڈیئر امتیاز اور میجر عامر تھے۔ انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) نے مڈنائٹ جیکال کے نام سے آپریشن کر کے حکومت کا تختہ اُلٹانے کی سازش میں شریک تمام افراد کی گفتگو ٹیپ کر لی۔ [25] عدم اعتماد کی تحریک کو کامیاب کرانے کے لیے کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔ وفاداریاں تبدیل کرانے کے لیے ہارس ٹریڈنگ کی بدترین مثالیں منظر عام پر آئیں۔ [26] بے نظیر نے سپریم کورٹ میں ایک بیان میں بتایا کہ ان کے حامیوں کو پنجاب حکومت کے ایماء پر مری کے گیسٹ ہاؤسز میں رکھا گیا اور لالچ وخوف کے ہتھکنڈے استعمال کر کے ان کی وفاداریاں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ پی پی پی کے اراکین اسمبلی نے دباؤ اور لالچ کو مسترد کر دیا۔ [27] اپنے ایک انٹرویو میں بے نظیر نے کہا:

"I have two witnesses .... who attended these meetings in which the Corps Commander, Nawaz Sharif and Osama bin Laden were present. Laden was told that a woman in this position (Benazir as PM) was against Islam, so he should give them money to overthrow me. And then Nawaz said that he would bring Islam to Pakistan ... He paid ten million dollars to finnace the no-confidence move against me." [28]

ترجمہ: ''میرے پاس دو گواہ ہیں...... جنہوں نے ان اجلاسوں میں شرکت کی جن میں کور کمانڈر، نواز شریف اور اسامہ بن لادن موجود تھے۔ لادن کو بتایا گیا کہ ایک خاتون (بے نظیر وزیراعظم) اس حیثیت میں اسلام کے خلاف ہے۔ اسے ان کو سرمایہ مہیا کرنا چاہیے تاکہ میری حکومت کا تختہ اُلٹا جاسکے اور تب نواز شریف نے کہا وہ پاکستان میں اسلام نافذ کرے گا...... اس (اسامہ) نے دس ملین ڈالر دیئے تاکہ میرے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سرمایہ صرف کیا جاسکے۔'' [28]

جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں اسامہ سے ملاقات کا انکشاف کیا جس سے بے نظیر کے مؤقف کی تصدیق ہوتی ہے۔

- [25] منیر احمد — ''پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کردار'' — صفحہ 154
  ملیحہ لودھی — ماہنامہ نیوز لائن اکتوبر 1992 — صفحہ 32
- [26] لارنس زائرنگ — "Pakistan in 20th century" — صفحہ 519
- [27] بے نظیر بھٹو کا بیان سپریم کورٹ 18 اپریل 1991ء — ریفرنس نمبر 10-1990
- [28] بے نظیر بھٹو انٹرویو ہیرالڈ جنوری 2001 — صفحہ 49

''اس زمانے میں اسامہ بن لادن نواز شریف کے حامی تھے۔ آئی جے آئی کے حامی تھے وہ منصورہ آئے تھے اور انہیں اس بات کی فکر تھی کہ نواز شریف کسی نہ کسی طریقے سے وزیراعظم بن جائیں اسامہ بن لادن کہتے تھے کہ اگر ووٹ خریدے جاسکتے ہیں تو میں اس کی ادائیگی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کام ہم سے نہ کروائیں ●

ان کاوشوں کے باوجود بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک ناکام ہوئی البتہ ان کو 125 ووٹ ملے جبکہ حلف اُٹھاتے وقت انہیں 148 اراکین اسمبلی کا اعتماد حاصل تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک ناکام ہونے کے بعد بھی اسٹیبلشمینٹ نے بینظیر کو قبول نہ کیا اور عدم تعاون کا رویہ جاری رکھا۔ منتخب وزیراعظم اقتدار میں آنے کے بعد عوام سے دور ہوجاتے ہیں۔ سول اور ملٹری بیورو کریسی پر چونکہ عوام کا پریشر نہیں رہتا۔ لہٰذا منتخب لیڈر نادیدہ ہاتھوں کی سازشوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بھٹو نے 1976ء تک عوام سے گہرا رابطہ برقرار رکھا اور عوامی طاقت سے سازشوں کا مقابلہ کرتے رہے جب بھٹو اور پارٹی کے درمیان فاصلے پیدا ہوئے اور وہ مفاد پرست اور عوام دشمن طبقے کے حصار میں آگئے تو ان کے خلاف سازش کامیاب ہوگئی۔ بے نظیر بھی اپنی پارٹی کے ساتھ رابطہ استوار نہ رکھ سکیں اور اس کمزوری کی بناء پر جنرل اسلم بیگ اور صدر اسحٰق ان پر حاوی ہوگئے۔ جب بے نظیر نے کور کمانڈروں کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جنرل بیگ نے کہا یہ تبدیلیاں آرمی چیف کی سفارش کے بغیر نہیں ہوسکتیں۔ کور کمانڈروں کے اجلاس کی صدارت آرمی چیف کرے گا اور وزیراعظم اجلاس میں صرف مبصر کے طور پر شریک ہوں گی۔ ● منتخب وزیراعظم آئین کی رو سے چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے مگر بے نظیر کو اپنے آئینی اختیارات استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ضیاء الحق کی باقیات نے بے نظیر کو سکون کے ساتھ حکومت چلانے کا موقع نہ دیا۔

27 مئی 1990ء کو حیدر آباد میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ پولیس نے پکا قلعہ میں ایک مشتعل ہجوم پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں 50 افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ ان کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا۔ جب فوج علاقے میں آئی تو مہاجروں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ چند روز بعد جنرل بیگ نے علاقے کا دورہ کیا تو ان کی موجودگی میں ''مارشل لاء لگاؤ'' کے نعرے لگائے گئے۔ ● 31 مئی 1990ء کو کراچی میں کے ٹی سی کی ایک بس کو نذر آتش کیا گیا۔ اس واقعہ میں 24 افراد ہلاک اور 33 زخمی ہوئے۔ سندھ میں امن و امان کی صورت حال انتہائی مخدوش ہوگئی۔ فوج نے اپنی شرائط تسلیم کرائے بغیر امن و امان قائم کرنے کے لیے حکومت کی اعانت کرنے سے انکار کردیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ فوج کو فوجی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ ● اعتزاز احسن بے نظیر کی پہلی حکومت میں وزیر داخلہ تھے ان کے مطابق

● انٹرویو قاضی حسین احمد — جنگ سنڈے میگزین 19 مارچ 2006

● ڈاکٹر حسن عسکری "Military, State and Society in Pakistan" حوالہ بزنس ریکارڈ 14 دسمبر 1988ء

● ڈاکٹر حسن عسکری "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 207

● ڈاکٹر حسن عسکری "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 207

پولیس کو اطلاع ملی کہ پکا قلعہ حیدر آباد میں اسلحہ کا ڈپو ہے۔ پولیس نے جولائی 1996 میں اسلحہ برآمد کرنے کے لیے آپریشن شروع کیا تو الطاف حسین نے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ سے فون پر رابطہ کیا جو بنگلہ دیش کا دورہ کررہے تھے۔ آرمی چیف نے جی او سی کراچی میجر جنرل اشرف قاضی کو کارروائی کی ہدایت کی۔ فوج نے پولیس کے راستے کو بلاک کردیا۔ آئی جی سندھ آغا سعادت علی نے وزیر داخلہ سے رابطہ کرکے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وزیر داخلہ نے پولیس آپریشن روک دیا۔ فوج نے اپنی آئینی حدود سے تجاوز کیا اور صوبائی حکومت کے اُمور میں کھلی مداخلت کی۔ اس واقعہ کے بعد صدر پاکستان غلام اسحٰق خان، آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور چیف جسٹس پاکستان افضل ظلہ نے بے نظیر حکومت کے خاتمے کا فیصلہ کرلیا۔ ●

7 مئی 1990ء کو جی ایچ کیو میں فوجی افسروں کی سالانہ ترقیوں کے سلسلے میں ایک بریفنگ ہوئی جس میں فوج کے 54 سینئر افسروں نے شرکت کی۔ اس بریفنگ کے دوران ڈی جی ایم آئی نے بے نظیر کابینہ کے ایک وزیر پر بھارتی ایجنسی را کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا۔ 17 جولائی 1990ء کو سندھ کے چیف منسٹر نے کور کمانڈر کراچی کو وزیر مملکت برائے دفاع اور وزیر داخلہ سے ملاقات کے لیے بلایا تاکہ سندھ میں امن و امان کی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ کور کمانڈر نے چیف منسٹر ہاؤس جانے کی بجائے دونوں وزراء کو کور کمانڈر ہاؤس آکر چائے پینے کی دعوت دے دی۔ ●

آئی جے آئی اور پنجاب حکومت نے بے نظیر اور ان کے رفقاء کے خلاف کردار کشی کی منظم اور سوچی سمجھی مہم چلائی۔ آصف زرداری پر کرپشن کے الزامات لگائے اور انہیں ''مسٹر ٹین پرسینٹ'' قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ آصف زرداری ہر ڈیل میں دس فیصد کمیشن لیتے ہیں۔ اپوزیشن کے یہ الزامات عدالتوں میں ثابت نہ ہوئے۔ آئی جے آئی نے آئی ایس آئی کے ایماء پر بے نظیر کو ''سکیورٹی رسک'' قرار دیا اور پروپیگنڈہ کیا کہ بے نظیر کا بھارت کے بارے میں رویہ نرم اور مشکوک ہے۔ اسٹیبلشمینٹ 1950 سے سیاست دانوں کو عوام کی نظروں میں بدنام کرنے اور اپنے اقتدار کے لیے جواز پیدا کرنے کے لیے سیاست دانوں پر کرپشن کے الزامات لگاتی رہی ہے۔ 1988 سے یہ الزامات ان سیاست دانوں پر تسلسل سے لگائے گئے جو فوج کے سیاسی کردار کے خلاف ہیں۔ ●

یوسف رضا گیلانی نے اپنی تصنیف ''چاہ یوسف سے صدا'' میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خفیہ ایجنسیاں بے نظیر حکومت کے خاتمے کا فیصلہ کرچکی تھیں۔

''1990 میں وزیراعظم نے اپنی رہائش گاہ سندھ ہاؤس میں کور کمانڈروں کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ انہوں نے ہر کور کمانڈر کے ساتھ اپنا ایک وفاقی وزیر بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے وزیراعظم کی طرف سے ایک چٹ موصول ہوئی کہ میں آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل سے اپنی حکومت کی کارکردگی کے

● مصنف کا اعتزاز احسن سے انٹرویو — 21 دسمبر 2005 لاہور

● مشاہد حسین "The dissolution inside story" دی نیشن 8 اگست 1990ء

● حسین حقانی "Pakistan between Mosque And Military" صفحہ 218

بارے میں دریافت کروں۔ میں نے جنرل حمید گل سے اس بارے میں دریافت کیا تو اُنہوں نے کہا آپ کو مسلم لیگ نہیں چھوڑنی چاہیۓ تھی کیونکہ ہم آپ کو وزیراعلیٰ پنجاب بنانے کا سوچ رہے تھے مگر آپ نے جلد بازی کی اور پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ آپ کی حکومت پر بدعنوانی کے کئی الزامات ہیں آپ کے برے دن آنے والے ہیں“

جولائی 1990ء کے آخری ہفتے میں کورکمانڈرز نے اپنے ایک اجلاس میں صدر اسحٰق کو اپنے تعاون کا یقین دلا دیا اور صدر سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بے نظیر حکومت کے بارے میں جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔ 16 اگست 1990ء کو فوجی بغاوت کی طرح بے نظیر کو برطرف کر دیا گیا۔ فوج نے اہم سرکاری عمارتوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ پرائم منسٹر ہاؤس کو بھی فوجی جوانوں نے محاصرے میں لے لیا اور صدر اسحٰق نے بے نظیر حکومت کی برطرفی اور اسمبلیوں کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ بے نظیر کو برطرف کرنے کے لیے ٹائمنگ کا خیال رکھا گیا۔ عراق نے کویت پر حملہ کیا تو اس کے چار دن بعد بے نظیر کی حکومت ختم کی گئی تاکہ امریکہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کرے جنرل بیگ نے کہا کہ حکومت کا خاتمہ صدر اسحٰق کا فیصلہ تھا اور اس میں ان کا کوئی کردار نہیں تھا۔

بے نظیر کو امریکہ پر بڑا بھروسہ تھا مگر جس دن ان کی حکومت برطرف ہوئی صدر اسحٰق سے ملاقات کرنے والا آخری شخص امریکی سفیر تھا۔ امریکہ نے صدر پاکستان کے اس اقدام کو ”ایک آئینی تبدیلی اور پاکستان کے عوام کا اندرونی مسئلہ قرار دیا۔“ بے نظیر نے ملٹری انٹیلی جینس پر الزام لگایا اور کہا کہ ان کی برطرفی کا آرڈر جی ایچ کیو کی جیگ (JAG) برانچ نے تیار کیا۔ محترمہ بے نظیر کے مطابق ”(خفیہ ایجنسیوں) نے اسحٰق خان سے کہا کہ اگر بے نظیر سینٹ میں اکثریت حاصل کر گئی تو تمہیں فارغ کر کے یحیٰی بختیار کو لے آئے گی۔ وہ ایسی کہانیاں گھڑتے تھے۔ وہ میری پارٹی کے ایک رہنما کے پاس گئے اور اسے کہا تم دس ایم این اے اکٹھے کرلو ہم تمہیں وزیراعظم بنا دیں گے۔ 1989ء میں ایک کور کمانڈر میرے خاوند کے پاس گیا اور کہا وہ ایک عورت کو سیلوٹ نہیں کر سکتے اسے کہو تمہیں وزیراعظم بنا دے کیونکہ ہمیں پیپلز پارٹی سے کوئی پرخاش نہیں۔“

صدر اسحٰق نے غیر جانبدار نگران حکومت تشکیل دینے کی بجائے متحدہ اپوزیشن اور آئی جے آئی کے لیڈر غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیراعظم نامزد کر دیا۔ صوبائی حکومتیں بھی آئی جے آئی کے سپرد کر دیں۔ سندھ میں جام صادق علی کو وزیراعلیٰ بنایا گیا جو بے نظیر بھٹو کے اعلانیہ شدید مخالف ہو چکے تھے۔ صدر اسحٰق سینئر سول بیوروکریٹ رہے تھے اور پی پی پی کے بارے میں ان کا رویہ متعصبانہ تھا۔ 1990ء کے انتخابات میں پی پی پی اور آئی جے آئی

یوسف رضا گیلانی ”چاہ یوسف سے صدا“ صفحہ 134

ڈاکٹر حسن عسکری "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 209

زائرنگ "The Fall of Benazir Bhutto" صفحہ 114

حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 218

بے نظیر بھٹو انٹرویو ”ماہنامہ ہیرالڈ“ جنوری 2001

کو مساوی مواقع دینے کی بجائے کھلی اور ننگی دھاندلی کی گئی۔ صدر اسحٰق کی منظوری سے مہران بینک کے چودہ کروڑ روپے پی پی پی کے سیاسی مخالفین میں تقسیم کیۓ گئے جن میں صحافی بھی شامل تھے۔ بے نظیر کے تمام سیاسی مخالفین (سوائے چند مستثنیات کے) نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی نے 24 جولائی 1994ء کو اپنے حلفیہ بیان میں تحریر کیا جو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔

”ستمبر 1990ء میں ڈی جی آئی ایس آئی کی حیثیت میں مجھے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ کی جانب سے ہدایات ملیں کہ میں کراچی کے تاجروں سے ملنے والی رقوم کو آئی جے آئی کی انتخابی مہم میں استعمال کرنے کے لیے انتظامات کروں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس آپریشن کے لیے گورنمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ ان ہدایات پر عملدرآمد کے لیے میں نے یہ اقدامات اُٹھائے۔

1- کراچی، کوئٹہ اور راولپنڈی میں خفیہ اکاؤنٹ کھولے۔
2- یونس حبیب نے کراچی کے اکاؤنٹ میں 140 ملین (14 کروڑ) روپے جمع کرائے۔
3- حسب ضرورت رقوم کوئٹہ اور راولپنڈی میں ٹرانسفر کی گئیں۔
4- چیف آف آرمی سٹاف اور ایوان صدر کے الیکشن سیل کی ہدایات کے مطابق 6 کروڑ روپے تقسیم کیۓ گئے۔
5- باقی رقم سپیشل فنڈ میں ٹرانسفر کر دی گئی۔

اسد درانی نے حلفیہ بیان کے ساتھ رقوم حاصل کرنے والوں کی لسٹ بھی فراہم کی۔ لیفٹیننٹ جنرل نصیر اللہ بابر نے مہران بینک سکینڈل کیس کے سلسلے میں کچھ دستاویزات سپریم کورٹ میں پیش کیں جن میں اسد درانی کا وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے نام ایک خط بھی شامل ہے جو 7 جون 1994ء میں تحریر کیا گیا جس میں اسد درانی لکھتے ہیں:۔

”مائی ڈیئر وزیراعظم: میں نے ایف آئی اے کے ڈائریکٹر کو جو اقبالی بیان دیا اس میں کچھ نکات شامل نہ کر سکا جو حساس اور پریشان کن ہو سکتے ہیں۔ رقم وصول کرنے والوں میں کھر (2.0 ملین)، حفیظ پیرزادہ (3.0 ملین)، سرور چیمہ (0.5 ملین) اور معراج خالد (0.2 ملین) بھی شامل ہیں۔ بقایا 80 ملین آئی ایس آئی کے (K فنڈ) میں جمع کرائے گئے یا ڈائریکٹر ایکسٹرنل انٹیلی جنس کو دیۓ گئے۔ اس آپریشن کو صدر غلام اسحٰق خان اور نگران وزیراعظم جتوئی کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ غلام اسحٰق اس آپریشن کے

اصغر خان۔ ہم نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا صفحہ 285۔ حوالہ پالیٹکس اینڈ بزنس 13 جولائی 1996۔ رقوم حاصل کرنے والوں کے نام: میر افضل (10 ملین)، جام یوسف (0.75 ملین)، بزنجو (0.50 ملین)، نادر مینگل (1.00 ملین)، نواز شریف (3.5 ملین)، لیفٹیننٹ جنرل (ر) رفاقت (5.6 ملین)، برائے میڈیا، جماعت اسلامی (5 ملین)، عابدہ حسین (1.0 ملین)، الطاف حسن قریشی اور مصطفیٰ صادق (0.5 ملین)، جتوئی (5.0 ملین)، جام صادق (5.0 ملین)، جونیجو (2.5 ملین)، پیر پگارا (2.00 ملین)، مولانا صلاح الدین (0.3 ملین)، ہمایوں مری (1.5 ملین)، جمالی (4.0 ملین)، کاکڑ (1.0 ملین)، کے بلوچ (0.5 ملین)۔

بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ اس میں براہ راست ملوث نہیں تھے۔"[40]

جب سپریم کورٹ نے ریٹائرڈ جنرل اسلم بیگ کو مہران بینک کیس کے سلسلے میں بیان ریکارڈ کرانے کے لیے بلایا تو اسلم بیگ نے کہا کہ وہ اپنے اقدامات کے لیے نئے آرمی چیف کے علاوہ اور کسی کو جواب دہ نہیں ہیں۔[41]

1990ء کے انتخابات میں آئی جے آئی نے قومی اسمبلی کی 106 نشستیں جیت لیں۔ پی پی پی نے دیگر جماعتوں کے اشتراک سے پی ڈی اے کے نام سے انتخابات میں حصہ لیا اور صرف 44 نشستیں حاصل کر سکی۔ اسٹیبلشمینٹ 1988ء کے انتخابات میں پی پی پی کو شکست نہ دے سکی مگر 1990ء کے انتخابات میں کامیاب رہی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں نواز شریف پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے۔

سٹیفن کوہن بے نظیر کے دورِ حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

Benazir first came to office on December 2, 1988, and was dismissed on August 6, 1990. Like her father, she came to power unexpectedly — as a direct result to Zia's death in an air crash on August 17, 1988. Also like her father, she had a political organisation, the PPP, and a degree of popular appeal unmatched by an other politician. There was another precedent as well. Fatima Jinnah, Mohammed Ali Jinnah's sister, had also run for office (against Ayub) and generated massive popular support. But Benazir's fate was to be only marginally better than that of Fatima Jinnah. She was elected prime minister, but the army and Zia's successor as president, Ghulam Ishaq Khan (an Establishment pillar), ensured that she could not govern.

Benazir was extremely intelligent, had strong contacts abroad (especially in the United States), and was the PPP's undisputed leader, She also inherited two grudges — and grudges are as important in Pakistan as in any other state. One went back to 1972 when her father had nationalised the Ittefaq Foundry, the heart of the Sharif family's industrial empire. This set the Sharif family against her, and their distrust was shared by the entire Pakistani business community. The second grudge was that of the army. Its

---

[40] اردیشر کاؤس جی: ڈان 14 اگست 2002 "We Never Learn From History"

[41] ڈان 25 فروری 1997

people doubted her professional competence, were intensely suspicious of her since she was not part of the Establishment, and feared that she might seek revenge for her father's death.[42]

ترجمہ: "بے نظیر نے پہلی بار 2 دسمبر 1988ء میں اقتدار سنبھالا اور 6 اگست 1990 کو برطرف کر دیا گیا۔ وہ 17 اگست 1988 میں جنرل ضیاء کے طیارہ تباہ ہونے کے بعد اپنے والد کی طرح غیر متوقع طور پر اقتدار میں آئیں۔ اپنے باپ کی طرح اس کے پاس پی پی پی کی تنظیم تھی اور اسے اس قدر عوامی مقبولیت حاصل تھی جس کا مقابلہ اور کوئی سیاست دان نہیں کرتا تھا۔ اس سے پہلے ایک اور مثال بھی موجود تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ فاطمہ نے صدر ایوب کے مقابلے میں انتخاب میں حصہ لیا اور بھاری عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ لیکن بے نظیر کی تقدیر فاطمہ جناح سے قدرے بہتر تھی۔ وہ وزیر اعظم منتخب ہوئیں مگر فوج اور ضیاء کے جانشین صدر غلام اسحٰق خان (اسٹیبلشمینٹ کے ستون) نے اس امر کو یقینی بنایا کہ وہ (بے نظیر) حکومت نہ چلا سکے۔"

"بے نظیر انتہائی ذہین تھی، اس کے بیرونی ممالک خاص طور پر امریکہ سے مضبوط تعلقات تھے۔ اور وہ پی پی پی کی غیر متنازعہ لیڈر تھی۔ اسے دو بغض (دشمنی) ورثے میں ملے۔ پاکستان میں بغض اور عناد کسی بھی دوسری ریاست کی طرح بڑے اہم ہیں۔ ایک یہ کہ بھٹو نے 1972ء میں شریف خاندان کی صنعتی سلطنت کا دل اتفاق فاؤنڈری کو نیشنلائز کر لیا۔ اس قدم نے شریف خاندان کو بے نظیر کے خلاف کر دیا اور پورے پاکستانی کاروباری طبقے نے اُن کا ساتھ دیا۔ دوسرا عناد فوج کا تھا۔ فوجی بے نظیر کی پروفیشنل اہلیت کے بارے میں گہرے شکوک و شبہات رکھتے تھے کیونکہ وہ اسٹیبلشمینٹ کا حصہ نہیں تھی اور ان کو خوف تھا کہ بے نظیر اپنے باپ کی موت کا انتقام (بدلہ) لے سکتی ہے۔"[42]

آئن ٹالبوٹ کا خیال ہے:۔

"Any criticism of Benazir Bhutto's leadarship must accommodate the dificulties which she confronted. Foremost among these was the post-Zia political entrenchment of the army and intelligence services."[43]

ترجمہ: "بے نظیر بھٹو کی لیڈر شپ کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت ان مشکلات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن کا اسے سامنا تھا۔ ان مشکلات میں سب سے اہم ضیاء دور کے بعد کی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی سیاست میں محفوظ اور گہری وابستگی تھی۔"[43]

---

[42] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 146

[43] آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 293

1990ء کے انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی کی نگران حکومت نے بے نظیر بھٹو اور پی پی پی کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم چلائی حالانکہ نگران حکومت کی آئینی ذمہ داری غیر جانبدار انتخابات کا انعقاد تھا۔ نگران حکومت نے بے نظیر کو پاکستان کے لیے سکیورٹی رسک قرار دیا کیونکہ وہ صدر، فوج اور عدلیہ کے خلاف تھی۔ [44]

اسٹیبلشمینٹ کو پختہ یقین تھا کہ بے نظیر دوبارہ اقتدار میں نہیں آئے گی مگر پاکستان میں سیاسی حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ نواز شریف اسٹیبلشمینٹ کی اپنی تخلیق تھے فوج نے ان کی سرپرستی کی تھی۔ ضیاء الحق نے نواز شریف کو اپنا سیاسی بیٹا قرار دیا تھا۔ اس کے باوجود نواز سول ملٹری بیوروکریسی سے اپنے تعلقات خوشگوار نہ رکھ سکے۔ صدر غلام اسحٰق کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ 1993ء نواز شریف کے لیے بدقسمت سال ثابت ہوا اور اسے سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ [45] آرمی چیف جنرل آصف نواز دل کے دورے کی وجہ سے انتقال کر گئے ان کی اہلیہ نے الزام لگایا کہ ان کے شوہر کو زہر دیا گیا۔ انہوں نے وزیراعظم نواز شریف کے سازش میں ملوث ہونے کا اشارہ دیا [46] عدالتی کمیشن نے زہر دے کر ہلاک کرنے کے امکانات کو مسترد کر دیا۔ غلام اسحٰق خان اور نواز شریف کے درمیان شکوک وشبہات اس قدر بڑھ گئے کہ نواز شریف نے ٹیلی ویژن پر نشری خطاب میں ایوان صدر کو سازشوں کا گڑھ قرار دے دیا اور ردعمل کے طور پر صدر اسحٰق نے اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے کرپشن اور بدانتظامی کے الزامات لگا کر نواز حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کر دیا۔ صدر اسحٰق نے بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم نامزد کر دیا اور آصف زرداری کو جیل سے رہا کر کے ایوان صدر میں ان سے نگران کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے حلف لیا۔ سپریم کورٹ نے صدر کے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ نگران حکومت ختم ہوگئی۔ یہ عدلیہ کی تاریخ کا انوکھا فیصلہ تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد بھی اسحٰق نواز تنازعہ ختم نہ ہوسکا۔ آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے مداخلت کر کے صدر اسحٰق اور وزیراعظم نواز دونوں کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ [47] آئی ایم ایف کے سینئر اہل کار معین قریشی پاکستان کے نگران وزیراعظم نامزد ہوئے۔ سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد قائم مقام صدر بن گئے۔ 1993ء کے انتخابات میں پی پی پی نے 86 اور اس کی اتحادی جماعت پی ایم ایل (جونیجو) نے 6 نشستیں حاصل کیں۔ پاکستان مسلم لیگ (نواز) کو 73 نشستوں پر کامیابی ملی۔ 15 آزاد اراکین منتخب ہوئے۔ ایم کیو ایم نے قومی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور صرف صوبائی انتخابات میں حصہ لیا۔ ایم کیو ایم نے الزام لگایا کہ اسے آئی ایس آئی نے بائیکاٹ پر مجبور کیا۔ پی پی پی نے سندھ میں اکثریت حاصل کر لی۔ بلوچستان میں کوئی جماعت اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ سرحد اسمبلی میں پی پی پی کو 22، اے این پی کو 21

[44] زائرنگ "The Fall of Benazir" صفحہ 119

[45] Edward Gargan April 19,1993 New York Times

[46] طاہر امین "Pakistan in 1993" ایشین سروے فروری 1994ء صفحہ 192

[47] طاہر امین "Pakistan in 1993" ایشین سروے فروری 1994ء صفحہ 194-195

اور پی ایم ایل (این) کو 15 نشستیں ملیں۔ پی پی پی اور پی ایم ایل (ج) نے پی ڈی ایف کے نام سے اتحاد قائم کر کے آزاد ممبران اور دیگر چھوٹے گروپوں سے اشتراک کر لیا۔

پی پی پی اور اس کی اتحادی جماعتوں کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوگئی۔ جماعت اسلامی نے پاکستان اسلامک فرنٹ کے نام سے انتخاب میں حصہ لیا۔ اسے صرف 9 نشستیں حاصل ہوسکیں۔ پی پی پی نے وفاق میں حکومت تشکیل دی۔ بے نظیر بھٹو دوسری بار وزیراعظم بن گئیں۔ بے نظیر کے ''فاروق بھائی'' سردار فاروق خان لغاری پاکستان کے صدر منتخب ہوگئے۔ بے نظیر انتہائی پُراعتماد اور مطمئن تھیں کہ وہ اپنی پارٹی کے صدر کی حمایت سے اپنی ٹرم پوری کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ بے نظیر نے فاروق لغاری پر بھرپور اعتماد کیا اور آئین کے آرٹیکل 58(2)(b) کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی۔

بے نظیر نے دوسری ٹرم کے دوران اپنا رویہ محتاط رکھا اور سول ملٹری بیوروکریسی سے اُلجھنے کی کوشش نہ کی۔ آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل جاوید اشرف قاضی نے انتظامی اُمور میں مداخلت سے گریز کیا اور آئی ایس آئی کو ایک بار پھر نظر نہ آنے والی فورس بنانے کا اعلان کیا۔ [48] بے نظیر نے اپنی توجہ معاشی اور سماجی مسائل پر مرکوز رکھی۔ انہوں نے سوشل ایکشن پلان (SAP) جاری کیا۔ جس کا مقصد عوام کو پرائمری تعلیم، صحت، خاندانی منصوبہ بندی، پانی کی فراہمی اور سیوریج کی سہولیات فراہم کرنا تھا۔ بے نظیر نے امریکہ سے تعلقات بہتر بنائے اور پاکستان کو دہشت گرد ریاست ڈیکلیئر ہونے کے خطرے سے باہر نکالا۔ امریکہ نے پاکستان پر عائد پابندیاں نرم کر دیں۔ براؤن ترمیم منظور ہوئی اور پاکستان کو امریکہ کی جانب سے مالی اور عسکری امداد ملنا شروع ہوگئی امریکہ میں پاکستان کے منجمد اثاثے واگزار ہوئے۔ حکومت پاکستان نے رمزی یوسف کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کیا جو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے میں ملوث تھا۔ بے نظیر نے 1995ء میں امریکہ کا کامیاب دورہ کیا۔ پاکستان کو 368 ملین ڈالر کا امریکی اسلحہ خریدنے کی اجازت مل گئی جس پر 1990ء میں پابندی لگا دی گئی تھی۔ پاکستان کو 120 ملین ڈالر واپس بھی مل گئے جن کی ادائیگی 1990 سے قبل کی گئی تھی مگر اسے اسلحہ نہ مل سکا تھا۔ [49]

خفیہ ایجنسیوں نے دوہرا کردار ادا کیا۔ ایک حصہ حکومت سے تعاون کرتا اور وفاداری کا یقین دلاتا رہا جبکہ دوسرے بے نظیر کے خلاف کام کرتے رہے اور ان کے سیاسی مخالفین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ [50]

بے نظیر، لغاری اور وحید کاکڑ قومی اُمور پر تبادلہ خیال کرتے اور 1996ء کے اوائل تک یہ ٹرائیکا خوش اسلوبی سے کام کرتا رہا۔ صدر اور وزیراعظم آرمی چیف وحید کاکڑ کی کارکردگی سے بڑے مطمئن تھے۔ انہوں

[48] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 229
حوالہ انٹرویو جنرل اشرف قاضی

[49] Kux "Disenchanted Allies" صفحہ 333

[50] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 231

نے وحید کاکڑ کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر کاکڑ نے توسیع لینے سے انکار کر دیا اور جنرل جہانگیر کرامت ان کے جانشین نامزد ہوئے۔ حکومت نے دفاع کو خصوصی اہمیت دی اور آئی ایم ایف، ورلڈ بینک کے دباؤ کے باوجود دفاعی بجٹ کم نہ کیا۔ ریٹائرڈ فوجی سول محکموں میں اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرتے رہے۔ 95-1994ء کے قومی بجٹ میں سول اور ملٹری ملازمین کی تنخواہوں میں 35 فیصد اضافہ کیا گیا۔ 96-1995 میں چار صوبائی گورنروں میں سے تین ریٹائرڈ جرنیل تھے۔ [61]

اپوزیشن لیڈر نواز شریف بے نظیر کی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے 23 اگست 1994ء کو آزاد کشمیر میں ایک پبلک میٹنگ میں اعلان کیا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے۔ اس بیان کا مقصد پاک امریکہ تعلقات کو کشیدہ بنانا تھا اور امریکی دفاعی امداد میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔ [62] نواز شریف نے انکشاف کیا کہ 1991ء کے اوائل میں آرمی چیف مرزا اسلم بیگ اور ڈی جی آئی ایس آئی اسد درانی نے ان کو ہیروئن (منشیات) فروخت کرنے کی تجویز پیش کی تھی تا کہ فوج کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے فنڈز حاصل کیے جا سکیں یہ سٹوری واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوئی۔ [63] جی ایچ کیو، اسلم بیگ اور اسد درانی نے اس الزام کی کھلے الفاظ میں تردید کی۔ [64]

بے نظیر نے مستقبل میں بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لیے غیر ملکی کمپنیوں سے تھرمل بجلی پیدا کرنے کے معاہدے کیے اگر وقت پر یہ معاہدے نہ ہوتے تو پاکستان بجلی کی قلت کی بناء پر تاریکی میں ڈوب جاتا۔ البتہ یہ معاہدے کرتے وقت قیمت کا تعین منصفانہ طور پر نہ کیا گیا اور پی پی پی کے سیاسی مخالفین نے کمیشن وصول کرنے کا الزام لگایا۔ بے نظیر حکومت نیو سوشل کنٹریکٹ کے انتخابی نعرے کے مطابق اختیارات کی تقسیم کا نظام نافذ کرنے سے قاصر رہی۔ نواز شریف اور ان کے خاندان پر بینکوں کے قرضے ہڑپ کرنے، ٹیکس ادا نہ کرنے اور سرکاری سودوں پر کمیشن وصول کرنے کے درجنوں الزامات لگائے گئے۔ نواز شریف نے جون 1996ء میں بے نظیر اور آصف زرداری پر برطانیہ میں ''سرے محل'' خریدنے کا الزام عائد کیا جس سے حکومت کی ساکھ متاثر ہوئی۔ بے نظیر نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اعتدال پسندی کا مظاہرہ کیا مگر نواز شریف اشتعال انگیز بیانات جاری کرتے رہے۔ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان محاذ آرائی اس حد تک بڑھ گئی کہ حکومت نے نواز شریف کے والد میاں شریف اور بھائی شہباز کو فوجداری مقدمات میں ملوث کر کے گرفتار کر لیا۔ بے نظیر کے بھائی مرتضیٰ بھٹو جلا وطنی ختم کر کے پاکستان واپس آنا چاہتے تھے۔ بے نظیر کا خیال تھا کہ پہلے وہ اپنے خلاف درج ہونے والے مقدمات کو عدالتوں سے ختم کرائیں تا کہ ان کی حکومت

[61] لیفٹیننٹ جنرل راجہ محمد سروپ خان (پنجاب)، لیفٹیننٹ جنرل عمران اللہ خان (بلوچستان)، میجر جنرل خورشید علی خان (سرحد)

[62] نواز شریف کی تقریر ''دی نیشن'' 24 اگست 1994

[63] نیوز 13 ستمبر 1994 سٹوری کے متن کے لیے دیکھیے فرائیڈے ٹائمز 22 ستمبر 1994

[64] دی نیشن 14 ستمبر 1994

کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوں۔ مرتضیٰ نے 1993ء کے انتخابات میں لاڑکانہ سے صوبائی اسمبلی کی نشست جیت لی اور کچھ عرصہ بعد 1994ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنی الگ سیاسی جماعت قائم کر لی اور بے نظیر کے خلاف بیانات جاری کرتے رہے۔

بے نظیر نے اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ میں بیس جج نامزد کیے جن میں 13 کا تعلق پی پی پی سے تھا۔ ان نامزدگیوں سے بے نظیر اور چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ حکومت کی ناپسندیدگی کے باوجود سپریم کورٹ نے ان نامزدگیوں کے خلاف اپیل کی سماعت کی اور سجاد علی شاہ نے اپنے 20 مارچ 1996ء کے فیصلے میں حکومت کے ججوں کی نامزدگی اور ان کی ٹرانسفر کے بارے میں اختیارات محدود کر دیئے۔ [65] عدلیہ نے مزید کئی ایسے فیصلے سنائے جن سے عدلیہ کی ایکٹوازم کا تاثر ابھرا۔ بے نظیر نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لغاری نے بے نظیر پر اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے دباؤ ڈالا مگر بے نظیر دباؤ میں نہ آئیں اور اس مسئلہ پر بے نظیر اور لغاری کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ اختلافات اس وقت مزید کشیدہ ہو گئے جب لغاری نے وزیر اعظم کی ایڈوائس پر سجاد علی شاہ کے خلاف کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ اپوزیشن نے آصف زرداری اور کابینہ کے بعض وزیروں پر کرپشن کے شدید الزامات عائد کیے اور کردار کشی کی مہم شروع کر دی۔ لغاری نے بے نظیر کو ان الزامات کا جائزہ لینے کے لیے پارلیمانی کمیٹی تشکیل دینے کا مشورہ دیا۔ [66] بے نظیر نے صدر کے مشورے کو مسترد کر کے آصف زرداری کو سرمایہ کاری کے وزیر کی حیثیت سے اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ جرمنی کی ایک معروف تنظیم ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل نے پاکستان کو دنیا کا نمبر 2 کرپٹ ملک قرار دیا۔ [67]

کراچی میں امن و امان کی صورتِ حال انتہائی خراب ہو گئی۔ شیعہ اور سنی فرقہ واریت کی بناء پر ایک دوسرے کے اہم افراد کو قتل کرنے لگے۔ کراچی پاکستان کا معاشی دل ہے۔ کراچی میں ہونے والی دہشت گردوں کی کارروائیوں نے پورے ملک کو متاثر کیا۔

کراچی میں ہفت روزہ تکبیر کے ایڈیٹر صلاح الدین سمیت سینکڑوں افراد قتل ہوئے۔ ایم کیو ایم اور ایم کیو ایم (حقیقی) ایک دوسرے کے کارکنوں کو قتل کرتے رہے۔ پولیس اور رینجرز اختیارات کے باوجود امن و امان قائم کرنے میں ناکام ہوئے۔ کراچی کی شاہراہ فیصل پر دن دیہاڑے امریکن قونصلیٹ کی ایک وین پر حملہ ہوا۔ جنرل نصیر اللہ بابر نے آپریشن کی نگرانی کر کے کراچی میں امن بحال کر دیا۔

1996ء میں میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی، بریگیڈیئر مستنصر باللہ، کرنل محمد آزاد منہاس اور کرنل عنایت اللہ خان نے ایک سازش کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے اور پاکستان میں سنی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ سازش کرنے والوں نے قبائلی علاقے سے اسلحہ خریدا۔ وہ 30 ستمبر

[65] ڈان 21 مارچ 1996

[66] مسلم 15 جولائی 1996

[67] فار ایسٹرن اکنامک ریویو 27 جون 1996

1996ء کو کور کمانڈرز کی ایک میٹنگ پر حملہ کر کے تمام سینئر فوجی افسروں کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ ● ظہیر الاسلام خود کو امیر المومنین قرار دے کر خلافت کا نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔

20 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کو 70 کلفٹن کے سامنے پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا۔ یہ المناک سانحہ بے نظیر حکومت اور بھٹو خاندان کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنا۔ بے نظیر نے اپنے بھائی کے قتل کو اپنی حکومت کے خلاف سازش قرار دیا جس میں ایم آئی اور صدر لغاری کے ملوث ہونے کا اشارہ کیا۔ ● فوج بے نظیر لغاری محاذ آرائی سے الگ رہی البتہ فوج کرپشن کی داستانوں اور امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کی وجہ سے تشویش میں مبتلا تھی۔ اگست 1996 میں جی ایچ کیو نے ملک کی معاشی صورت حال کے بارے میں ایک تجزیہ صدر لغاری کو پیش کیا اور انہیں انتباہ کیا کہ اگر معاشی بہتری کے لیے اقدامات نہ اُٹھائے گئے تو پاکستان کی معیشت مکمل طور پر تباہ ہو جائے گی۔ ● ایک اور رپورٹ کے مطابق فوج نے صدر کو کرپشن کے ثبوت پیش کیے اور آگاہ کیا کہ فوج کے اندر اس ضمن میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ ● لغاری نے بے نظیر کو بتایا کہ فوج اس کی حکومت کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ جنرل جہانگیر کرامت نے بے نظیر سے کہا کہ صدر انہیں برطرف کر دے گا۔ ●

مجید نظامی کے مطابق صدر لغاری نے ایوان صدر میں سینئر ایڈیٹروں کو دعوت دی اور ملاقات کے دوران بے نظیر کی پالیسیوں پر شدید تنقید کی۔ مجید نظامی نے نواز شریف سے کہا لوہا گرم ہے چوٹ لگا لو۔ نواز شریف نے مجید نظامی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے صدر لغاری کو اپنے مکمل تعاون اور انہیں اگلی ٹرم کے لیے صدر برقرار رکھنے کا یقین دلایا۔

آئی بی نے پاکستان کے سینکڑوں اہم سیاسی و سرکاری افراد کے ٹیلی فون ٹیپ کیے۔ فاروق لغاری کے گھر کے وہ فون بھی ٹیپ کیے گئے جو ان کے بچے استعمال کرتے تھے۔ لغاری کو علم ہوا تو وہ بے نظیر اور آصف زرداری سے بدظن ہو گئے۔ خفیہ ایجنسیوں نے لغاری اور بے نظیر کے درمیان اختلافات پیدا کرنے اور انہیں نکتہ عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آئی ایس آئی پرائم منسٹر ہاؤس کی سرگرمیوں کو مانیٹر کرتی رہی۔ ● یوسف رضا گیلانی نے اپنی کتاب ''چاہ یوسف سے صدا'' میں تحریر کیا ہے کہ جہانگیر کرامت نے ان کو بتایا کہ مری میں نواز شریف کا فون ٹیپ ہوا جس میں اُنہوں نے کہا کہ صدر لغاری نے اسمبلی تحلیل کرنے اور نئے انتخابات کرانے کا وعدہ کیا ہے۔

● ہیرالڈ جنوری 1996 صفحہ 89 فوجی حکومتیں: مرتضیٰ انجم صفحہ 391

● ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 224

● احمد رشید "The Final Count Down" ہیرالڈ ستمبر 1996

● کامران خان سٹوری واشنگٹن پوسٹ 5 نومبر 1996ء

● حسین حقانی، انٹرویو بے نظیر "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 241

● ہیرالڈ اکتوبر 1996۔ مسعود شریف سابق ڈی جی آئی بی کا بیان ڈان 5 فروری 1997ء

بے نظیر بھٹو نے آصف زرداری کے ہمراہ ایوان صدر میں فاروق لغاری سے ملاقات کی تاکہ بحران کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اس ملاقات میں لغاری نے کرپشن کا ایشو اُٹھایا جس پر ''آصف زرداری نے قہقہہ لگایا اور صدر کو چھیڑتے ہوئے بولے کہ اس ضمن میں پاکستان کے اندر بشمول صدر لغاری کسی کا دامن صاف نہیں ہے۔'' لغاری غصے سے کانپنے لگے اور زرداری کو کمرے سے باہر نکل جانے کے لیے کہا۔ زرداری بے نظیر کے اشارے پر باہر چلے گئے۔ یہ آخری ملاقات فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ●

5 نومبر 1996ء کو فاروق لغاری نے کرپشن اور آئین کی خلاف ورزی کے الزامات لگا کر بے نظیر حکومت کو برطرف کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیاں معطل کر دیں۔ فوج نے وزیراعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا اور آصف زرداری گورنر ہاؤس لاہور سے گرفتار ہوئے۔ جب بے نظیر کی حکومت ختم کی گئی اس وقت امریکہ میں صدارتی انتخابات ہو رہے تھے اور امریکی انتظامیہ کی پوری توجہ اپنے داخلی اُمور پر تھی۔ معراج خالد نگران وزیراعظم نامزد ہوئے۔ فاروق لغاری نے (b) (2) 58 کے تحت اپنے آئینی اختیارات کو استعمال کیا اور اپنی جماعت پی پی پی کی حکومت ختم کر دی۔ انہوں نے ضیاء الحق کے مارشل لا کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا اور جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ عوام ان سے انتہائی قدم اُٹھانے کی ہرگز توقع نہیں کرتے تھے وہ اگر 58(2)(b) کا آئینی اختیار استعمال کرنے کی بجائے خود مستعفی ہو جاتے تو تاریخ میں انہیں اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا۔

حسن عسکری رضوی بے نظیر کے دوسرے دور کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> She was more isolated than was the case when her first government was removed. Much of this can be explained with reference to her personalised style of rule, not being amenable to advice, political management through a group of cronies (most of whom were non-elected), and the interference of her husband (Asif Ali Zardari) in government affairs. Other factors that contributed to her downfall included the failure to cope with the political and economic crises, intense confrontation with the opposition, ethnic and religious sectarian violence, corruption in government, and confrontation with the superior judiciary and the president. ●

ترجمہ: وہ (بے نظیر) اپنے پہلے دورِ حکومت سے زیادہ الگ تھلگ ہو چکی تھی۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ بے نظیر کا دوسرا دور شخصی نوعیت کا تھا اور وہ مشورے پر کان نہیں دھرتی تھی، وہ سیاسی نظام چند قریبی دوستوں کے ذریعے چلاتی رہی جن میں زیادہ تر غیر منتخب تھے اور اس کے شوہر آصف زرداری کی حکومتی اُمور میں مداخلت جاری رہی۔ دوسرے عوامل جو

● طارق علی بنیاد پرستیوں کا تصادم صفحہ 189

اُس کے زوال کا سبب بنے یہ ہیں کہ وہ سیاسی اور معاشی بحران کو حل نہ کر پائی، اُس نے اپوزیشن سے شدید محاذ آرائی کی، لسانی ، مذہبی اور فرقہ وارانہ شدت پسندی جاری رہی، وہ حکومت میں کرپشن کو کنٹرول نہ کرسکی اور اعلیٰ عدلیہ اور صدر سے الجھ پڑی۔ [65]

حسین حقانی کا تجزیہ ہے:۔

The second Benazir Bhutto government lasted a little longer than the first. Wiser from her experience, Bhutto avoided conflict with the army and the ISI as much as possible. She took a hard line toward India, supported the Kashmir insurgency, and even acquiesced to the rise to power of the Taliban in Afghanistan, orchestrated by the ISI. Bhutto was unable to control the perception of corruption at the highest levels of government, however, and she failed to end her acrimonious confronation with Nawaz Sharif. [66]

ترجمہ: ”بے نظیر کی دوسری حکومت پہلی حکومت سے قدرے زیادہ عرصہ جاری رہی۔ اپنے تجربے کی حکمت سے بھٹو نے جہاں تک ممکن ہوسکا فوج اور آئی ایس آئی سے اُلجھنے سے گریز کیا۔ بھارت کے ساتھ اُس نے سخت رویہ اختیار کیا اور کشمیر میں جدوجہد کی حمایت کی، یہاں تک کہ افغانستان میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے امکانات پر خاموشی اختیار کرلی جس کی سرپرستی آئی ایس آئی کر رہی تھی۔ بے نظیر، حکومت کی اعلیٰ سطح پر کرپشن کے تاثر کو ختم نہ کرسکی، اس کے علاوہ وہ نواز شریف سے اپنی تند و تیز محاذ آرائی کم کرنے میں ناکام رہی۔“ [66]

حسن عسکری اور حسین حقانی نے بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور کے بارے میں جو تبصرہ کیا ہے وہ کافی حد تک درست ہے مگر بڑا عامل جو بے نظیر کے زوال کا سبب بنا وہ خفیہ ایجنسیوں کا رول ہے جو انہوں نے اس بار بڑی مہارت سے پورا کیا۔ بے نظیر کے فوج کے ساتھ ہر ممکن تعاون کے باوجود خفیہ ایجنسیوں نے انہیں قبول نہ کیا اور ان کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے اور صدر کو وزیراعظم سے بدظن کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ایجنسیوں نے اپوزیشن جماعتوں سے اپنے رابطے استوار رکھے۔ جماعت اسلامی نے بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی اور عدلیہ کی نگرانی میں عبوری حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کر دیا [67]۔ جون 1996ء میں جماعت اسلامی، مسلم لیگ (ن) اور ایم کیو ایم نے دیگر جماعتوں کے اشتراک سے ہڑتال کی کال دے دی جس سے کراچی میں کاروبار زندگی مفلوج ہوگیا۔ فوج کی خفیہ ایجنسیاں کشمیر اور

[65] حسن عسکری رضوی "Military State & Society in Pakistan"

[66] حسین حقانی "Pakistan Between Mosque and Military" صفحہ 242

[67] Laporte "Pakistan in 1996" صفحہ 119

افغانستان میں جو کردار ادا کرنے کی خواہش مند تھیں اس کے لیے انہیں جس آزاد اور سازگار ماحول کی ضرورت تھی وہ بے نظیر کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ ایجنسیوں کا اپنا ایک مخصوص انداز رہا ہے۔ جب انہوں نے کسی حکومت کو غیر مستحکم کرنا ہوتا ہے تو وہ پہلے سے تیار حکمت عملی کے مطابق اپنے کارڈ کھیلنا شروع کر دیتی ہیں۔ امن و امان کی صورت حال کو خراب کرنا اور کرپشن کا پروپیگنڈا اس حکمت عملی کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ بے نظیر کبھی اسٹیبلشمینٹ کے لیے قابل قبول نہیں رہیں۔ انہیں صرف حالات کے جبر کے تحت ہی عبوری دور کے لیے قبول کیا گیا۔ آج بھی بے نظیر کو سیاست سے الگ رکھنے کے لیے جو حربے استعمال کیے جا رہے ہیں وہ اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ بے نظیر اسٹیبلشمینٹ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ بلاشبہ بے نظیر سے غلطیاں بھی ہوئیں مگر اس کی حکومتوں کی برطرفی میں سازش کا عنصر غلطیوں سے کہیں زیادہ تھا۔ جن خفیہ ایجنسیوں نے انتخابات میں پی پی پی کو ہرانے کے لیے غیر معمولی بلکہ انتہائی کردار ادا کیا وہ بے نظیر کو اقتدار میں زیادہ عرصہ کیسے برداشت کرسکتی تھیں۔ ـ بے نظیر نے ایک انٹرویو میں اپنی دوسری حکومت کے خاتمے کے بارے میں کہا:۔

”فوج کے سربراہ (جہانگیر کرامت) نے بتایا کہ چند غیر ملکی بینکاروں نے ان سے ملاقات کر کے بتایا ہے کہ معیشت دیوالیہ ہوسکتی ہے مگر اس وقت ایسا اندیشہ ہرگز نہیں تھا۔ مجھے اس بات پر تشویش ہوئی کہ یہ غیر ملکی بینکار آخر چیف آف آرمی سٹاف سے کیا چاہتے ہیں۔ میں نے فوج کے سربراہ کو بتایا کہ انہیں غلط معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔ دیوالیہ ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ صدر نے مجھے معزول کرنے سے انکار کیا جب کہ آپ کہہ رہے ہیں وہ ایسا کرنے والے ہیں۔ آپ خود جاکر ان سے پوچھیں اور پھر مجھے بتائیں۔ آرمی چیف اس بات پر رضامند ہوگئے اسی رات میرے بھائی کو قتل کر دیا گیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چیف آف آرمی سٹاف نے صدر سے پوچھا کہ وہ اسی روز حکومت برطرف کر سکتے ہیں تو صدر نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں۔ کیونکہ اب میں اس موڑ تک آچکا ہوں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میرے بھائی کا قتل بھی اسی منصوبے کا حصہ تھا“۔ [68]

بے نظیر نے اپنے دورِ حکومت میں 35 ہزار ایکڑ اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کی۔ نوجوانوں کے لیے وفاقی وزارت اور خواتین کے لیے الگ ڈویژن قائم کیا گیا۔ 22 ہزار دیہاتوں کو بجلی سے روشن کیا۔ دفاع کو میزائل سے مسلح کیا۔ اس کے دور میں تعلیم اور صحت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ روزگار کی فراہمی کی شرح کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور شرح پیدائش میں کمی ہوئی۔

[68] بے نظیر بھٹو ”انٹرویو ماہنامہ ہیرالڈ جنوری 2001

باب 10

صنعت کار وزیراعظم اور ہیوی مینڈیٹ

نواز شریف نے جنرل جیلانی کی حکومت (1981) میں وزیر خزانہ کی حیثیت اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کے والد میاں شریف المعروف ''اباجی'' ایک جہاں دیدہ کاروباری شخصیت تھے۔ انہوں نے سینئر سول ملٹری بیوروکریٹس سے خوشگوار تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ضیاء الحق نے اپنے دور میں بھٹو مخالف سیاست دانوں، تاجروں، صنعت کاروں اور مذہبی رہنماؤں کی بڑی سرپرستی کی۔ بھٹو نے شریف خاندان کی اتفاق فاؤنڈری کو قومی ملکیت میں لیا تھا اس لیے بھٹو دشمنی کی بناء پر میاں شریف ضیاء کے قریبی حلقہ میں شامل ہوگئے۔ نواز شریف 1985 سے 1990ء تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ جونیجو کے زوال کے بعد نواز نے مسلم لیگ پر قبضہ کرلیا۔ سیاست میں انہیں اپنے بھائی شہباز شریف کا تعاون حاصل رہا۔

فوج کے سینئر جرنیل نواز شریف کی سیاسی کارکردگی سے بڑے خوش تھے۔ بے نظیر کی سیاسی غلطیوں کی وجہ سے نواز شریف کو قومی سطح کا لیڈر بننے کا موقع مل گیا۔ بے نظیر سے سیاسی محاذ آرائی نواز شریف کے بڑے کام آئی۔ 1990ء کے انتخابات میں نواز متبادل قیادت کے طور پر بے نظیر کے مقابلے میں آگئے۔ انجینئرڈ انتخابات کی وجہ سے نواز شریف کو پاکستان کا پہلا صنعت کار وزیراعظم بننے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اپنے دور کا آغاز بڑے اعتماد کے ساتھ کیا۔ صدر اسحٰق اور فوج کے سینئر کمانڈروں کے ساتھ نواز شریف کے مراسم بڑے خوشگوار تھے۔

وزیراعظم کا منصب سنبھالنے کے بعد نواز شریف نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز احمد کو آئی بی کا سربراہ تعینات کر دیا۔ بریگیڈیئر امتیاز ریٹائر ہوچکے تھے۔ انہوں نے 1988ء میں آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسر کے طور پر آئی جے آئی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نواز نے بریگیڈیئر امتیاز کی نامزدگی جی ایچ کیو کے مشورے کے بغیر کی جسے فوج کے اعلیٰ حلقوں میں میں پسند نہ کیا گیا۔ [1] بریگیڈیئر امتیاز نے نواز شریف کے حلقہ اثر کو وسیع کرنے کے لیے اہم سیاسی، سرکاری اور عسکری شخصیتوں سے رابطے کیے جن کا مقصد صدر اسحٰق کو تنہا کرنا تھا۔ [2]

---

1. جنرل کے ایم عارف — "Khaki Shadows" — صفحہ 365
2. حسین حقانی — "Pakistan between Mosque and Miltary" — صفحہ 223

نواز اور آرمی چیف اسلم بیگ کے درمیان پہلا اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب عراق نے کویت پر حملہ کیا۔ وفاقی حکومت نے سعودی عرب کی سکیورٹی کے لئے پانچ ہزار فوجی جوان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خلیج کا بحران عروج پر پہنچا تو پاکستان کے عوام نے صدام حسین کے حق میں اور امریکہ کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے جن سے متاثر ہوکر اسلم بیگ نے 2 دسمبر 1990 میں صدام حسین کے حق میں بیان جاری کر دیا۔ 28 جنوری 1991 میں فوجی افسروں سے ایک خطاب میں اسلم بیگ نے کہا کہ امریکہ کے عراق پر حملوں کا مقصد ان ریاستوں کو تباہ کرنا ہے جو اسرائیل کے مقابلے میں کھڑی ہوسکتی ہیں اور اس کے لیے خطرہ بن سکتی ہیں۔ اسلم بیگ نے کہا کہ عراق کے بعد ایران کی باری آئے گی اور ایک دن پاکستان کو بھی امریکی انتقام کا نشانہ بننا پڑے گا۔ [3] اسلم بیگ کے بیانات جمہوری حکومت کی پالیسی سے متصادم تھے نواز شریف نے جب فوج کو بھجوانے کا فیصلہ کیا تو جنرل اسلم بیگ اس فیصلے میں شریک تھے ان کے بیان نے حکومت کے لیے پریشان کن صورت حال پیدا کر دی مگر نواز شریف ان بیانات کا نوٹس نہ لے سکے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ جنرل اسلم بیگ نے عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعے نواز حکومت کے خاتمے کی کوشش کی مگر فوج کی ایجنسیاں مطلوبہ تعداد میں اراکین اسمبلی کی حمایت حاصل نہ کر سکیں۔ نواز شریف نے جنرل بیگ کی ریٹائرمنٹ سے تین ماہ قبل ہی جنرل آصف نواز جنجوعہ کو نیا آرمی چیف نامزد کر کے اپنے خلاف سازش کو ناکام بنا دیا۔
''امریکہ نے نواز کو انتباہ کیا کہ جنرل بیگ اس کی حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہے۔'' [4]

نواز شریف کے بقول 1991ء کے آغاز میں جنرل اسلم بیگ اور ڈی جی آئی ایس آئی جنرل اسد درانی نے ان سے ملاقات کی اور فوج کی حساس نوعیت کی خفیہ سرگرمیوں کے لئے فنڈز کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ڈرگ ٹریڈ میں ملوث ہونے کی اجازت طلب کی اور یقین دہانی کرائی کہ یہ آپریشن انتہائی خفیہ رہے گا۔ نواز نے اس منصوبے کی منظوری دینے سے انکار کر دیا۔ [5] جنرل بیگ اور جنرل درانی دونوں نے نواز شریف کے اس الزام کو بے بنیاد کہہ کر مسترد کر دیا۔ اپنے ایک انٹرویو میں نواز شریف نے اپنے اس انکشاف کو قدرے وضاحت سے بیان کیا۔

''میرے پہلے دور حکومت میں ایک بار دو سینئر فوجی جرنیل ملنے آئے۔ میٹنگ شروع ہوئی تو ایک جنرل نے کہا ''ملک کی معاشی حالت سنوارنے کے لیے منشیات کو حکومتی سرپرستی میں بیرون ملک بھجوایا جائے ہیروئن برآمد کرنے سے ملک کی معاشی تقدیر بدل جائے گی'' میں اس بات سے حیران ہوا اور میں نے سختی

[3] جنرل اسلم بیگ "Pakistan Horizon" جنوری 1991 صفحہ 146
[4] جنرل (ر) حمید گل نے مصنف کو بتایا۔
[5] اصغر خان "We Have Learnt Nothing from History" صفحہ 279
حوالہ کا دس جی آرٹیکل ڈان 21 جولائی 2002

سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو جرنیل نے جھینپتے ہوئے کہا کہ یہ تو صرف تجویز ہے اس پر دوسرے جرنیل بولے کہ ''تمام ترقی یافتہ ملکوں نے بلیک منی سے ہی ترقی کی ہے انگلینڈ ہو یا سوئٹزرلینڈ یہ سب بلیک منی سے ہی امیر ہوئے تھے۔ امریکہ نے دوسرے ممالک کی دولت لوٹی ہے ہمیں بھی چاہیئے کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور ملک کو منشیات کی سمگلنگ سے خوشحال بنائیں'' میں نے سختی سے یہ تجویز رد کر دی'' [5A]

امریکہ کے سول حکومت کی نسبت پاک فوج سے تعلقات گرم جوش رہے۔ نواز شریف نے امریکی دورہ کی خواہش کا اظہار کیا مگر انہیں امریکہ سے دعوت نہ ملی جبکہ فوج کے جرنیل امریکہ کے دورے پر جاتے رہے۔ امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا خیال تھا کہ پاکستان خلیج میں امریکی مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے۔ [6] اسلم بیگ اپنی سروس کی مدت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہوگئے۔ جنرل آصف نواز جنجوعہ ان کے جانشین نامزد ہوئے۔ آصف نواز ایک پروفیشنل جنرل تھے اور فوج کو سیاست سے الگ رکھنے کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے دونوں جمہوری لیڈر بے نظیر اور نواز شریف محاذ آرائی ختم کریں۔ جنجوعہ نے دونوں لیڈروں کے اختلافات ختم کرانے کے لئے مثبت کردار ادا کیا [7] جنرل (ر) حمید گل نے مصنف کو بتایا کہ جنرل اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جی ایچ کیو نے نئے آرمی چیف کے لئے تین نام جولائی 1991 میں وزیراعظم نواز شریف کو پیش کیے جن میں حمید گل کا نام سرفہرست تھا۔ حمید گل سینئر موسٹ جنرل تھے اور نواز شریف کو وزیراعظم بنانے میں حمید گل کا کلیدی نوعیت کا کردار تھا مگر اقتدار کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ نواز شریف کے قریبی رفقاء نے حمید گل کی سخت مخالفت کی۔ ''اباجی'' میاں شریف نے نواز کو ہدایت کی کہ ریمارکس کے بغیر فائل صدر اسحٰق کو ریفر کر دی جائے۔ صدر اسحٰق نے حمید گل کو بلایا اور بتایا کہ وزیراعظم نے ان کے نام کی سفارش نہیں کی۔ حمید گل نے ریٹائر ہونے کی پیش کش کی مگر صدر نے انہیں روک دیا۔ جنرل آصف نواز نئے آرمی چیف نامزد ہوگئے۔ عسکری ذرائع کا تاثر یہ ہے کہ حمید گل اپنے نظریات کی بناء پر بڑی طاقتوں کو قبول نہیں تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف کی نامزدگی کے فیصلے بڑی طاقتوں کی پسند کے مطابق کیے جاتے ہیں۔

نواز شریف کا جنجوعہ سے اختلاف جنرل حمید گل کے تبادلے پر ہوا۔ انہیں کور کمانڈر کوئٹہ سے ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا ٹرانسفر کیا گیا۔ نواز چاہتے تھے کہ حمید گل فوج کے کسی سینئر منصب پر کام کرتے رہیں مگر جنجوعہ نے نواز کی مداخلت کو مسترد کر دیا۔ حمید گل چھٹی پر چلے گئے اور جنجوعہ نے انہیں جنوری 1992 میں ریٹائر کر دیا۔ [8]

[5A] سہیل وڑائچ غدار کون صفحہ 172
[6] Kux "Disienchanted Allies" صفحہ 313
[7] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 225
[8] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 211

سندھ میں امن و امان قائم کرنے کے لیے فوجی آپریشن شروع ہوا تو وفاقی حکومت اور فوج کے درمیان پالیسی اور سٹریٹجی پر اختلافات پیدا ہوگئے۔ جب تک فوج اندرون سندھ ڈاکوؤں کی سرکوبی کرتی رہی نواز حکومت مطمئن رہی کیونکہ فوج کی سرگرمیاں اپوزیشن کے مضبوط انتخابی حلقوں تک محدود تھیں۔ مگر جب فوج نے کراچی اور حیدر آباد میں آپریشن شروع کیا تو فوج اور ایم کیو ایم کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ ایم کیو ایم نواز کی اتحادی جماعت تھی لہٰذا نواز کو ایم کیو ایم کے تحفظات اور خدشات کا نوٹس لینا پڑا۔

نواز نے فوج پر تنقید کرنے سے اجتناب کیا البتہ ان کے قریبی رفقاء فوج کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ فوج اپنا فرض غیر جانب داری سے پورا کر رہی تھی مگر نواز حکومت کا تاثر یہ تھا کہ جنجوعہ پی پی پی کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ نواز شریف نے اپنے اقتدار کے خاتمے کے بعد ایک بیان میں کہا کہ جنجوعہ کا ان کی حکومت سے رویہ توہین آمیز تھا اور انہوں نے دسمبر 1992ء کے لانگ مارچ میں پی پی پی کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ [9] جنجوعہ کا خیال تھا کہ نواز حکومت کی خواہش ہے کہ فوجی آپریشن اس کے سیاسی مخالفین کے خلاف ہو اور اس کے اتحادی آپریشن کی زد میں نہ آئیں۔

نواز نے آرمی چیف اور دوسرے سینئر فوجی افسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انہیں لگژری کاریں بطور تحفہ دینے کی پیشکش کی جسے جنجوعہ نے مسترد کر دیا۔ [10] کور کمانڈرز کے ایک اجلاس میں جنجوعہ نے بتایا کہ نواز نے فوجی افسروں کو کرپٹ کرنے کی کوشش کی۔ [11] مذہبی جماعتیں نواز کی اتحادی تھیں اور جہادی سرگرمیوں میں شریک رہی تھیں۔ نواز دور میں ان کی سرگرمیوں میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوگیا۔ امریکہ اور کئی مغربی ممالک کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوا تو امریکہ نے پاکستان پر ایٹمی سرگرمیاں منجمد کرنے کے لئے دباؤ ڈالا اور پاکستان کو ان ممالک کی واچ لسٹ (watch list) میں شامل کر لیا جو ان کے خیال میں دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ فوج نے چونکہ بیرونی ممالک سے اسلحہ حاصل کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ پاکستان کے بیرونی امیج کے بارے میں بڑی فکر مند رہتی ہے۔ فوج نے محسوس کیا کہ نواز حکومت پاکستان کے امیج کو بہتر بنانے کے لئے مناسب اقدامات نہیں اُٹھا رہی۔

بے نظیر اور نواز کے درمیان محاذ آرائی جاری رہی۔ نواز حکومت نے بے نظیر اور آصف زرداری کے خلاف درجنوں کیس درج کرائے۔ آصف زرداری اڑھائی سال جیل میں بند رہے۔ بے نظیر نے نواز اور ان کے قریبی رفقاء کے خلاف کرپشن کے سنگین الزامات عائد کیے اور پی پی پی نے 1991 میں پلنڈر آف پاکستان (The Plunder of Pakistan) کے نام سے وائٹ پیپر شائع کیا جس میں نواز خاندان اور اس کے قریبی اتحادیوں کی لوٹ کھسوٹ، کرپشن اور بینکوں سے لیے گئے واجب الادا قرضوں کی تفصیل شائع

---

[9] نواز شریف کا بیان — روزنامہ نیشن — 22 اگست 1995

[10] حسن عسکری رضوی — "Military, State and Society in Pakistan" — صفحہ 212

[11] احمد رشید — "Death of a Pragmatist" — ہیرالڈ جنوری 1993

کی گئی۔ نواز کے خلاف رائے ونڈ محل سکینڈل منظر عام پر آیا۔ پی پی پی نے 1990 کے انتخابی نتائج کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ خفیہ ایجنسیوں نے آئی جے آئی کو کامیاب کرانے کے لئے پی پی پی مخالف امیدواروں میں چودہ کروڑ روپے تقسیم کیے تھے جس کا اعتراف ڈی جی آئی ایس آئی نے اپنے حلفیہ بیان میں کیا۔

مارچ 1992 میں نواز نے آرمی چیف جنجوعہ سے کہا کہ وہ آئی ایس آئی کے سربراہ کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جنجوعہ نے جواب دیا کہ وہ اس منصب کے لئے تین نام حکومت کو بھیج دیں گے۔ نواز نے کہا اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے ذہن میں جنرل جاوید ناصر کا نام ہے۔ جنجوعہ اپنے ردِعمل کا اظہار نہ کر سکے البتہ کور کمانڈرز کے اجلاس میں انہوں نے جنرل جاوید ناصر کو ڈی جی آئی ایس آئی بنانے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کیونکہ اس اہم منصب کے لئے ناصر کا میرٹ نہیں بنتا تھا۔ [12]

جنرل آصف جنجوعہ ہارٹ اٹیک سے فوت ہوگئے تو ان کے جانشین کی نامزدگی کا مسئلہ پیش آیا۔ نواز کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف کو نیا آرمی چیف بنانا چاہتے تھے۔ [13] جبکہ صدر اسحٰق کا انتخاب پشتون جنرل عبدالوحید کاکڑ تھے۔ اسحٰق کو نواز کے جنرل اشرف سے قریبی تعلقات کا علم تھا۔ لہٰذا انہوں نے کاکڑ کی نامزدگی پر اصرار کیا اور نواز کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔ جنرل کاکڑ ایک پروفیشنل جنرل تھے انہوں نے فوج کو سیاست سے الگ تھلگ رکھا۔ وہ صدر اور وزیراعظم کے اختلافات کے سلسلے میں غیر جانبدار رہے۔

نواز شریف نے بے نظیر کے تعاون سے صدر اسحٰق کے اختیارات کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بے نظیر نے نواز کو بھائی کہنا شروع کر دیا۔ نواز نے سندھ کے وزیر اعلیٰ جام صادق کو دو بار فون کر کے آصف زرداری کو جیل سے رہا کرنے کی سفارش کی مگر جام صادق نے صدر اسحٰق کے اشارے پر زرداری کو رہا نہ کیا۔ بے نظیر نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُمور خارجہ کی پارلیمانی کمیٹی کی سربراہی قبول کر لی۔ صدر اسحٰق نواز، بے نظیر قربت سے مضطرب ہوگئے۔ نواز اور بے نظیر آٹھویں ترمیم ختم کر کے وزیراعظم کو بااختیار بنانے پر رضا مند ہوگئے۔ [14] نواز کے قریبی رفقاء نے آٹھویں ترمیم کے خلاف مہم شروع کر دی۔ مسلم لیگ میں شامل جونیجو گروپ نے اسحٰق کا ساتھ دیا۔ اسحٰق نے نواز حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنی شروع کیں تو نواز نے اسحٰق کی ناراضگی کو ختم کرنے کے لئے انہیں دوسری ٹرم کے لیے صدر منتخب کرنے کی پیشکش کر دی۔ صدر اسحٰق اس پیشکش سے مطمئن نہ ہوئے۔ اسحٰق نے نواز کو اقتدار میں لانے کے لئے فعال کردار ادا کیا تھا اور انہیں ہرگز توقع نہ تھی کہ نواز اپنے محسن کو ہی آنکھیں دکھانا شروع کر دیں گے۔ نواز شریف نے 17 اپریل 1993 کو اپنے نادان مشیروں کے مشورے پر اپنے ٹیلی ویژن خطاب میں صدر اسحٰق پر الزام لگایا کہ وہ ان

---

[12] جنرل کے ایم عارف — "Khaki Shadows" — صفحہ 365

[13] حسن عسکری رضوی — "Military, State and Society in Pakistan" — صفحہ 214

[14] آئن ٹالبوٹ — "Pakistan A Modern History" — صفحہ 325

کی حکومت کو عدم استحکام کا شکار کرنے کے لیے سازش کر رہے ہیں۔ فوج نے صدر پر الزام تراشی کو پسند نہ کیا۔ [15] اسحٰق نے کاکڑ کو اعتماد میں لیا اور بے نظیر سے رابطہ کر لیا۔ بے نظیر نواز حکومت کے خاتمے اور نئے انتخابات کے انعقاد کی شرط پر تعاون کرنے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔

صدر اسحٰق نے کرپشن، اقربا پروری، سیاسی مخالفین کو انتقام کا نشانہ بنانے اور آئین کی خلاف ورزی کے الزامات لگا کر نواز حکومت کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی کو معطل کر کے 14 جولائی 1993 کو نئے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ سردار بلخ شیر مزاری نگران وزیراعظم نامزد ہوئے۔ بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ نواز نے اسحٰق پر کھلی الزام تراشی اس وقت کی جب ان کو یقین ہوگیا کہ اسحٰق ان کی حکومت کو برطرف کرنے والے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سپریم کورٹ نے چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں صدر اسحٰق کی اقتدار میں موجودگی کے دوران ان کے فیصلے کو آئین کے خلاف قرار دے کر نواز حکومت اور قومی اسمبلی بحال کر دی۔ عدالت عظمٰی کے فیصلے کے باوجود نواز سیاسی بحران کو حل نہ کر سکے، ان کے کئی قریبی رفقاء ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ پنجاب میں صوبائی وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور ہوگئی اور پنجاب میں نواز کی صوبائی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ جب سیاسی اور آئینی بحران سنگین ہوا تو جنرل کاکڑ مداخلت کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہوں نے صدر اور وزیراعظم سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ نواز اکیلے اقتدار سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کاکڑ نے جانب داری کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ملک کے مفاد میں صدر اور وزیراعظم دونوں کو اقتدار سے الگ ہونے اور نئے انتخابات کرانے پر رضا مند کر لیا۔ معین قریشی اتفاق رائے سے نگران وزیراعظم نامزد ہوئے۔ مجید نظامی نے مصنف کو بتایا کہ نواز شریف، مجید ملک اور الٰہی بخش سومرو کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے آئے اور بتایا کہ جنرل کاکڑ ان سے استعفیٰ مانگ رہے ہیں۔ مجید نظامی نے نواز کو کہا کہ ابھی آرمی چیف کو فون کریں اور کہیں کہ وہ ملک کے چیف ایگزیکٹو ہیں استعفیٰ نہیں دیں گے۔ نواز نے کاکڑ کو فون کیا اور کہا وہ ایک دن کے بعد بتائیں گے۔ مجید نظامی نے نواز سے کہا خدا حافظ میاں صاحب آپ پاکستان کے وزیراعظم نہیں رہے۔

بے نظیر کی دوسری حکومت کے خاتمے کے بعد نواز شریف دوسری بار پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ 3 فروری 1997ء کو ہونے والے عام انتخابات میں نواز تاریخ ساز ہیوی مینڈیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بے نظیر کی حکومت کو صدر لغاری نے ختم کیا۔ لغاری طویل عرصہ تک پی پی پی کے سیکریٹری جنرل اور بے نظیر کے دست راست رہے۔ ان کے ہاتھوں سے سنگین الزامات کی بنیاد پر بے نظیر حکومت کا خاتمہ پی پی پی کے لیے ایک بڑا سیاسی دھچکا تھا۔ نگران وزیراعظم معراج خالد جن کا شمار پی پی پی کے بانیوں میں ہوتا ہے، کرپشن اور احتساب کے متعلق تقریریں کرتے رہے جس کا نقصان پی پی پی کو ہوا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے انتخابات سے چار روز قبل پی پی پی کے خلاف فیصلہ سنا کر صدر لغاری کے اقدام کو

[15] روئیداد خان "Pakistan A Dream Gone Sour" صفحہ 121

جائز قرار دیا جس سے پی پی پی کے حامیوں میں مایوسی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ [16] انصاف کا تقاضہ تھا کہ سپریم کورٹ پی پی پی کے خلاف فیصلے کا اعلان انتخابات کے بعد کرتی۔ سپریم کورٹ نے پی پی پی کو زچ کرنے کے لیے صدر کا ساتھ دیا۔ سپریم کورٹ پنجاب سے تعلق رکھنے والے وزیراعظم اور سندھی وزیراعظم کے درمیان توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ نگران حکومت نے بی بی سی کی ایک دستاویزی فلم "Princess And Playboy" انتخابات سے پہلے پی ٹی وی پر چلا دی۔ یہ فلم بے نظیر اور آصف زرداری کی مبینہ کرپشن کے بارے میں تھی۔ اس فلم کو پی ٹی وی پر چلانے کا فیصلہ صدر لغاری، نگران وزیراعظم معراج خالد اور وفاقی وزیر اطلاعات ارشاد حقانی نے کیا۔ پی پی پی کے خلاف پروپیگنڈا مہم نے انتخابات کو یک طرفہ بنا دیا۔ پی پی پی کا ووٹر غصے اور مایوسی کی بناء پر ووٹ ڈالنے کے لیے گھروں سے باہر نہ نکلا اور نواز شریف کی مسلم لیگ قومی اسمبلی کی 207 نشستوں میں سے 134 نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ پی پی پی کو صرف 18 نشستیں مل سکیں۔ جماعت اسلامی نے احتجاج کے طور پر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کا اعتراض یہ تھا کہ نگران حکومت نے کرپٹ افراد کو نااہل قرار دینے کی بجائے انتخابات میں حصہ لینے کا اہل قرار دے دیا۔ [17] نگران حکومت کے وزیر قانون فخر الدین جی ابراہیم بھی بطور احتجاج وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ صدر نے قانون میں ترمیم کر کے نواز شریف اور ان کے رفقاء کو الیکشن لڑنے کا اہل قرار دے دیا ہے حالانکہ وہ قرض نادہندہ ہونے کی بناء پر انتخابات میں حصہ لینے کے اہل نہیں تھے۔ [18] عمران خان نے تحریک انصاف کے نام سے تھرڈ آپشن کے طور پر انتخابات میں حصہ لیا۔ آئی ایس آئی کا اندازہ تھا کہ ایم کیو ایم، تحریک انصاف اور صدر لغاری کے قریبی جاگیردار امیدوار اس قدر نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ منتخب پارلیمنٹ میں بیلنس آف پاور سامنے آئے گا۔ [19] 1997 کے انتخابات میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ووٹ ڈالنے کی شرح 35.92 فیصد رہی جبکہ غیر سرکاری ذرائع نے ووٹ کی شرح کو 25 فیصد قرار دیا۔

نواز شریف وفاق اور تین صوبوں میں مسلم لیگ حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ پنجاب میں ان کے بھائی شہباز شریف وزیراعلیٰ بن گئے۔ نواز نے 17 فروری 1997 کو ہیوی مینڈیٹ (heavy mandate) کے ساتھ وزارت عظمٰی کا منصب سنبھالا۔ انہیں 217 اراکین قومی اسمبلی میں سے 177 نے اعتماد کا ووٹ دیا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد نواز نے یکم اپریل 1997 کو تیرھویں آئینی ترمیم منظور کروا کر صدر سے اسمبلی توڑنے اور افواج پاکستان کے چیفس نامزد کرنے کے اختیارات واپس لے لیے۔ بے نظیر

[16] آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 353

[17] حسین حقانی: "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 243

[18] فخر الدین جی ابراہیم بیان دی نیوز 19 دسمبر 1997

[19] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 243

چونکہ خود بھی (b)(2)58 کی دوبار شکار ہو چکی تھیں لہٰذا پی پی نے بھی آئین کی تیرھویں ترمیم کی حمایت کی۔ [20] تیرھویں آئینی ترمیم کے بعد نواز اس قدر طاقت ور ہو گئے کہ انہوں نے ایک انوکھی چودھویں آئینی ترمیم بھی منظور کرالی جس کے مطابق پارلیمانی پارٹی کا لیڈر اپنی پارٹی کے رکن کی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے، پارٹی کے فیصلے کے خلاف بولنے اور ووٹ دینے پر اسمبلی کی رکنیت ختم کر سکتا تھا اور اس کے فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ [21] بے نظیر نے چودھویں ترمیم کی بھی حمایت کی اور ہیوی مینڈیٹ کے دباؤ میں آکر اراکینِ اسمبلی نے بھی مزاحمت نہ کی۔ اس آمرانہ ترمیم نے صدر اور جی ایچ کیو کو مضطرب کر دیا۔

نواز شریف نے اپنا دوسرا دور حکومت بڑے ولولے اور جوش و خروش سے شروع کیا۔ ''قرض اُتارو ملک سنوارو'' کا پُرکشش نعرہ دیا جس پر قوم نے لبیک کہا مگر یہ نعرہ حقیقت نہ بن سکا۔ معاشی استحکام کے لیے انقلابی نوعیت کی پالیسیاں جاری ہوئیں۔ لاہور اسلام آباد موٹر وے تعمیر ہوئی اور پیلی ٹیکسیوں کی سکیم سے بے روزگار افراد کو روزگار کے مواقع ملے۔ گڈ گورننس کو یقینی بنانے کے لئے پروگرام 2010 جاری کیا گیا۔ بینکوں کے قرضے واپس لینے اور ٹیکس نیٹ کو وسیع کرنے کے لیے اقدامات اُٹھائے گئے جو سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

دوسرے دور میں نواز کا انداز جارحانہ رہا۔ وہ پارلیمنٹ، صدر، عدلیہ اور فوج کو اپنے تابع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سپریم کورٹ کے پانچ نئے ججوں کی تعیناتی کے مسئلہ پر چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ سے اختلاف کیا اور کہا کہ سپریم کورٹ میں بارہ جج ہی کافی ہیں اور نئے ججوں کی ضرورت نہیں۔ نواز شریف اس خوف میں مبتلا تھے کہ ججوں کی اکثریت ان کے خلاف کوئی ایسا فیصلہ نہ سنا دے جس سے وہ اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ آرمی چیف جنرل کرامت جو سیاست سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے ججوں کی تعیناتی کے معاملے پر خاموش نہ رہے اور نواز کو آگاہ کر دیا کہ وہ آئینی بحران کی حمایت نہیں کریں گے۔ [22]

نواز نے اپنے قریبی دوست سیف الرحمٰن کی سربراہی میں ایک احتساب سیل قائم کر کے بے نظیر، آصف زرداری اور ان کے قریبی بیوروکریٹس کو ٹارگٹ کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے احتساب بینچ نے بے نظیر اور آصف کو سات سال کی سزا سنائی ان پر ایس جی ایس کوٹیکنا کمپنی سے کمیشن وصول کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ایک ٹیپ کے منظر عام پر آنے کے بعد سپریم کورٹ نے بے نظیر اور آصف کی سزا کو کالعدم قرار دے دیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے دو ججوں ملک محمد قیوم اور راشد عزیز کو ریٹائر ہونا پڑا۔ خفیہ ٹیپ کے مطابق دونوں جج احتساب سیل کے چیئرمین سیف الرحمٰن سے بے نظیر کے خلاف مقدمے کے سلسلے میں ہدایات لیتے

---

[20] John. F Burns "Pakistan Acts to Cut Powers of President" نیویارک ٹائمز 12 اپریل 1997

[21] انوار سیّد "Pakistan in 1997" صفحہ 119

[22] John. F Burns "Army Takeover Feared" نیویارک ٹائمز۔ 2 نومبر 1997

رہے۔ بے نظیر بھٹو ہائی کورٹ کا فیصلہ آنے سے پہلے پاکستان سے باہر چلی گئیں اور نواز کے لئے اپوزیشن لیڈر کی جانب سے کسی چیلنج کا خطرہ باقی نہ رہا۔ نواز نے احتساب کے طریقہ کار کے بارے میں کہا۔

''احتساب کا طریقہ کار غلط تھا ہمیں اس بارے میں اُکسایا گیا تھا۔ فوج اور آئی ایس آئی کا ہم پر دباؤ تھا جان بوجھ کر ہم سے بے نظیر اور اپوزیشن کے خلاف ایسے اقدامات کروائے گئے تا کہ سیاست دانوں کا اعتبار ختم ہو جائے۔ [22A]

نواز نے اپریل 1997ء میں آرمی چیف کے مشورے سے نیول چیف سے دفاعی سودوں میں کمیشن (kickback) لینے کے الزام میں استعفیٰ لے لیا اور نیا نیول چیف نامزد کیا۔ [23] نواز نے نگران حکومت کے نامزد تمام ریٹائرڈ فوجی افسروں کو مستقل کر دیا اور فوج کے حاضر سروس کیپٹن اور کرنل کے عہدوں پر فائز افسروں کو مستقل بنیاد پر پولیس، آئی بی اور ایف آئی اے میں تعینات کیا۔ [24] نواز نے کم و بیش ایک سو کے قریب اپنے حامی سول سرونٹس کو کلیدی آسامیوں پر فائز کیا۔ ان نوازشات کی بناء پر سول سروس کا ادارہ بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ [25] حکومت نے لیفٹیننٹ جنرل معین حیدر کو ان کی ریٹائرمنٹ کے ایک ہفتہ بعد سندھ کا گورنر نامزد کر دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل عارف بنگش کو جنہیں نگران حکومت نے صوبہ سرحد کا گورنر نامزد کیا تھا اپنے منصب پر برقرار رکھا گیا۔ نواز کی پالیسی یہ تھی کہ فوج بھی مطمئن رہے اور وہ اپنے ہیوی مینڈیٹ کی بناء پر اپنا اقتدار بھی اس حد تک مستحکم کر لیں کہ ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ ان کا ہیوی مینڈیٹ ہی دراصل ان کا بڑا دشمن ثابت ہوا۔ فوج اور عدلیہ نواز کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت سے خائف تھے۔ صدر، آرمی چیف اور چیف جسٹس پاکستان کو نواز کی اہلیت پر بھروسہ نہیں تھا۔

نواز نے ججوں کی تعیناتی کے سلسلے میں چیف جسٹس پاکستان کے اختیارات کم کرنے کی کوشش کی جس سے جسٹس سجاد علی شاہ اور وزیر اعظم کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ نواز نے چیف جسٹس کے بارے میں ایک ایسا بیان دے دیا جس سے توہین عدالت کا پہلو نکلتا تھا۔ سپریم کورٹ نے وزیر اعظم کے خلاف توہین عدالت کے الزام میں ایک مقدمے میں سماعت شروع کر دی۔ نواز عدالت میں حاضر بھی ہوئے مگر ان کے چیف جسٹس سے اختلافات ختم نہ ہو سکے۔ نواز نے پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کر کے آئینی اور عدالتی بحران کو حل کرنے کی کوشش کی مگر صدر لغاری نے پارلیمنٹ کے بل پر دستخط کرنے میں تاخیر کی۔ لغاری نے نواز کی خواہش پر چیف جسٹس پاکستان کو فارغ کرنے سے انکار کیا۔ 28 نومبر 1997ء کو سپریم کورٹ نواز شریف کے خلاف توہین عدالت کے مقدمے کی سماعت کر رہی تھی کہ نواز شریف

[22A] سہیل وڑائچ غدار کون صفحہ 37

[23] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 228

[24] ڈان 3 مئی، 20 مئی 1997

[25] برائن "A History of the Pakistan Army" صفحہ 405

کے حامیوں نے سپریم کورٹ کی بلڈنگ پر حملہ کر کے ایک افسوسناک روایت قائم کی۔ ججوں نے عدالت کے کمرے سے بھاگ کر سازش کو مکمل کامیاب نہ ہونے دیا۔ وفاقی حکومت کے ایماء پر سپریم کورٹ کے جج تقسیم ہوگئے۔ مسلم لیگ نواز نے صدر کے خلاف مواخذے کی تحریک پیش کرنے کا اعلان کر دیا۔ جہانگیر کرامت اس تنازعے میں فریق نہ بنے، صدر لغاری دباؤ کے تحت مستعفی ہوگئے۔ قائمقام صدر وسیم سجاد نے نئے چیف جسٹس کی منظوری دے دی اور جسٹس شاہ فارغ ہوگئے۔ شریف خاندان کے معتمد رفیق جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ پاکستان کے نئے صدر منتخب ہوئے۔

نواز نے 1998ء میں قومی اسمبلی سے کسی بحث کے بغیر پندرھویں ترمیم منظور کرالی۔ یہ ترمیم شریعت کا نظام نافذ کرنے کے بارے میں تھی۔ سینٹ کے اراکین نے نواز کے دباؤ کے باوجود پندرھویں ترمیم کی منظوری دینے سے انکار کیا۔ سینٹ میں مسلم لیگ نواز کی اکثریت نہیں تھی۔ مارچ 2000 میں سینٹ کے انتخاب ہونے والے تھے نواز کو یقین تھا کہ نئے انتخاب میں ان کو سینٹ میں بھی اکثریت حاصل ہو جائے گی تو وہ پندرھویں ترمیم منظور کرالیں گے۔ اپوزیشن اس رائے سے متفق تھی کہ اگر نواز کو سینٹ میں بھی اکثریت حاصل ہوگئی تو وہ پاکستان کے امیر المومنین بن جائیں گے۔ اکتوبر 1998 میں نواز نے آرمی چیف کے مشورے کے بغیر لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین بٹ کو آئی ایس آئی کا ڈی جی نامزد کر دیا۔ امریکی سی آئی اے نے ضیاء الدین کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی جو انہوں نے حیران کن طور پر قبول کر لی۔ ضیاء الدین نے اپنے امریکی دورہ کے دوران امریکی انتظامیہ کو حساس نوعیت کی معلومات فراہم کیں۔ بے نظیر کے دور میں بھی آئی ایس آئی کے سربراہوں کو دورے کی دعوت ملی جو مسترد کر دی گئی۔ نواز اپنے دوسرے دور میں دوہرا کردار ادا کر رہے تھے۔ پاکستان کے اندر وہ مذہبی انتہا پسندوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جبکہ امریکہ کے بل کلنٹن کو یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ ایک لبرل اور ڈیموکریٹ سیاست دان ہیں اور پاکستان سے انتہا پسندی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ضیاء الدین کے علاوہ شہباز شریف نے بھی امریکہ کا نجی دورہ کیا جس کا مقصد امریکہ کے ساتھ شریف خاندان کے تعلقات کو مستحکم کرنا تھا۔ نواز دور میں ہی امریکہ نے افغانستان کے اندر اسامہ کے کیمپ پر میزائل داغے مگر اسامہ معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ نواز نے ملکی قوانین کی پرواہ کیے بغیر پاکستانی شہری ایمل کانسی کو امریکی وزیر خارجہ البرائیٹ کی ایک فون کال پر امریکی کمانڈوز کے حوالے کر دیا۔ ایمل کانسی دہشت گردی کے ایک مقدمے میں امریکہ کو مطلوب تھا۔

نواز نے اپنے دوسرے دور میں واپڈا کے میٹر چیک کرنے اور محکمہ تعلیم کے سکولوں کے سروے کے لئے پچاس ہزار کے قریب فوجی جوانوں اور افسروں کی خدمات حاصل کیں۔ فوج نے ہر چند کہ قابل ستائش کارکردگی کا مظاہرہ کیا مگر اس مہم سے سول حکومت کی خامیاں کھل کر سامنے آئیں۔ عوام اور فوج میں یہ تاثر

- تفصیل کے لئے دیکھئے ادریس بختیار کی سٹوری ماہنامہ نیوز لائن دسمبر 1997
- جنرل کے ایم عارف "Khaki Shadows" صفحہ 366

اُبھرا کہ سیاست دان اور سول انتظامیہ سول اداروں کو شفاف طور پر چلانے میں ناکام رہے ہیں اور فوج ان اداروں کو کامیابی سے چلانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

زائرنگ نواز کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"Nawaz Sharif talked about democracy, but his administration was more like a Mughal court. Nawaz ignored the conventions of cabinet government: he neither held cabinet meetings nor made cabinet decisions. Surrounded by family members and a few close associates, Sharif's actions were more in tune with absolute monarchy than with representative government."

ترجمہ: ”نواز شریف جمہوریت کی بات کرتے تھے مگر ان کی ایڈمنسٹریشن مغل دربار کی طرح تھی۔ نواز نے کیبنٹ گورنمنٹ کی روایات کو نظر انداز کیا۔ انہوں نے نہ تو کابینہ کے اجلاس بلائے اور نہ ہی کابینہ کے مشورے سے فیصلے کیے۔ نواز اپنے خاندان کے افراد اور چند قریبی رفقاء کے درمیان گھرے رہتے۔ ان کے اقدامات ایک نمائندہ حکومت کی بجائے مکمل بادشاہت کی طرح ہوتے۔“

11 مئی 1998 کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو پاکستان کے عوام کی جانب سے بھی نواز حکومت پر ایٹمی دھماکہ کرنے کے لئے دباؤ بڑھنے لگا۔ امریکہ نے بھارت پر پابندیاں عائد کر دیں اور امریکی صدر بل کلنٹن نے پاکستان کو معاشی، دفاعی اور سیاسی امداد کی پیشکش کر کے ایٹمی دھماکہ نہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ نواز نے دھماکے کے سلسلے میں پاکستان کے معیشت اور امور خارجہ کے ماہرین اور تاجروں سے مشاورت کی۔ مذہبی جماعتوں نے دھماکے کے حق میں جلوس نکالے جن میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ بے نظیر بھٹو نے بھی نواز کو دھماکہ کرنے کی ترغیب دی۔ نواز نے بیرونی دباؤ کے باوجود 28 مئی 1998ء کو کامیاب ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کو ایٹمی طاقت ہونے کا اعلان کر دیا۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں نے پاکستان کے خلاف معاشی پابندیاں عائد کر دیں۔ ان پابندیوں کے بعد خطرہ پیدا ہوگیا کہ زرمبادلہ کے ذخائر بیرون ملک منتقل نہ ہو جائیں۔ نواز نے پاکستان کے تمام فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کر دیئے۔ عالمی پابندیوں کی وجہ سے فوج کے پیشہ وارانہ اور معاشی مفادات متاثر ہوئے اور فوج کے اندر نواز حکومت کے بارے میں منفی جذبات پیدا ہوئے۔

20 اگست 1998ء کو امریکہ نے افغانستان میں اسامہ بن لادن کے کیمپ پر کروز میزائل داغے جو پاکستان کی فضائی حدود سے گزرے۔

- لارنس زائرنگ "Pakistan At the Crosscurrent of History" صفحہ 259
- Dan Balz واشنگٹن پوسٹ 18 مئی 1998
- حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 247

امریکی فوج کے جنرل اس دن پاکستان کا دورہ ختم کر کے واپس روانہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے طیارے پر سوار ہونے سے پہلے جنرل جہانگیر کرامت کو بتایا کہ امریکی میزائل پاکستان کی فضا سے گزر کر اسامہ کے ٹھکانے کو نشانہ بنائیں گے لہٰذا وہ فکر مند نہ ہوں۔ امریکہ کو خدشہ تھا کہ پاکستان خوف زدہ ہو کر بھارت پر حملہ نہ کر دے۔ وزیراعظم نواز کو اس واقعہ کا علم نہ تھا۔ [41]

نواز نے فوج کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے اپنے ایک مسلم لیگی رفیق کو بتایا کہ وہ فوج کے 50 ہزار جوانوں کو واپڈا اور ریلوے کے محکموں میں مصروف کرنا چاہتے ہیں اور ایک سال بعد مزید فوج کو دوسرے محکموں میں کام پر لگائیں گے۔ وہ بھارت کے ساتھ تعلقات خوشگوار اور دوستانہ بنا کر فوج کے سائز کو کم کر دیں گے۔ [42]

اکتوبر 1998 میں آرمی چیف جہانگیر کرامت نے نیول کالج میں خطاب کے دوران نیشنل سکیورٹی کونسل کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں حکومت، فوج، بیوروکریسی کے نمائندے اور تھنکرز شامل ہوں جو داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کے بارے میں مشاورت کر سکیں۔ کرامت کا یہ تصور نیا نہیں تھا۔ فوج ضیاء کے دور سے نیشنل سکیورٹی کے ادارے کی ضرورت پر زور دے رہی تھی۔ ہیوی مینڈیٹ سے سرشار نواز نے اپنے آرمی چیف کے اس بیان کو پسند نہ کیا، وہ اپنے مخالف صدر اور چیف جسٹس پاکستان کو پہلے ہی مات دے چکے تھے۔ انہوں نے کرامت کو اپنے آفس میں بلایا اور کہا......:

"Resign or Take over."

ترجمہ: ''استعفیٰ دے دیں یا قبضہ کر لیں۔''

کرامت ایک پروفیشنل جرنیل تھے، انہوں نے ریٹائرمنٹ سے تین ماہ قبل استعفیٰ دے دیا۔ نواز اور ان کے رفقاء کرامت کے استعفیٰ سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے پارلیمنٹ، ایوان صدر اور عدلیہ کے بعد فوج کو بھی فتح کر لیا ہے۔ جنرل کرامت نے پاکستان اور فوج کے مفاد میں استعفیٰ دیا۔ نواز جنرل کرامت کی ریٹائرمنٹ کے بعد نئے آرمی چیف کے بارے میں اپنے قریبی رفقاء سے صلاح مشورہ کر چکے تھے۔ ان کے ذہن میں جنرل پرویز مشرف کا نام موجود تھا جو اُردو بولنے والی مہاجر کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نواز کا خیال تھا کہ وہ پنجابی اور پشتون جرنیل کی نسبت بہتر رہیں گے اور انہیں کنٹرول کرنا آسان ہوگا۔ جنرل خالد نواز اور جنرل علی قلی خان جنرل مشرف سے سینئر تھے۔ مشرف 28 اکتوبر 1998ء کو آرمی چیف نامزد ہو گئے۔

نواز شریف نے اپنی پسند کے نئے چیف کی نامزدگی کے بعد امریکہ کی آشیرباد سے پاک بھارت تعلقات کو دوستانہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ نواز کے بھارت کے ساتھ تجارتی تعلقات اُستوار

[41] جنرل (ر) حمید گل نے مصنف کو انٹرویو کے دوران بتایا۔ حوالہ وڈوارڈ: بش ایٹ وار (اردو ترجمہ) صفحہ 13

[42] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 151

ہو چکے تھے، ان کے خاندان کی شوگر ملیں بھارت کو چینی فروخت کر رہی تھیں۔ بھارت کے وزیراعظم واجپائی اور نواز نے کولمبو میں سارک کانفرنس کے موقع پر ملاقات کی اور دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کو ختم کرنے پر اتفاق کیا۔

واجپائی فروری 1999ء میں ''دوستی کی بس'' کے ذریعے واہگہ بارڈر پار کر کے لاہور آئے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے مشترکہ اعلامیہ کے لئے جو ڈرافٹ تیار کیا تھا اس میں کشمیر کا ذکر نہیں تھا جس سے جنرل مشرف بڑے پریشان ہوئے۔ سینئر فوجی کمانڈروں نے واجپائی کا واہگہ بارڈر پر استقبال نہ کیا۔ [43] بھارت کے رہنماؤں نے نواز کے ہیوی مینڈیٹ کا درست اندازہ نہ لگایا۔ واجپائی کو لاہور میں جماعت اسلامی کی طرف سے سخت احتجاج کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ لاہور نواز کا اپنا شہر تھا۔ واجپائی مینار پاکستان پر بھی گئے اور پاکستان کے بارے میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا:۔

نواز نے واجپائی کی پاکستان آمد کے موقع پر جماعت اسلامی کے احتجاج کے بارے میں کہا:۔

"It was later revealed to me that the stone-pelting on the cars of diplomats, and the processions against the then Indian prime minister Vajpayee's visit to Lahore in February 1999 were stage-managed and orchestrated by the agencies through a politico-religious party".[44]

ترجمہ: ''بعد میں میرے سامنے انکشاف کیا گیا کہ فروری 1999 میں بھارت کے وزیراعظم واجپائی کی لاہور آمد پر سفیروں کی کاروں پر پتھر پھینکنے اور جلوس نکالنے کا جو واقعہ ہوا وہ ایک سیاسی مذہبی جماعت نے خفیہ ایجنسیوں کے ایماء اور سرپرستی میں کیا تھا۔''[44]

نواز اپنے اتحادیوں ایم کیو ایم اور اے این پی کو اپنے ساتھ رکھنے میں ناکام رہے۔ دونوں اتحادی جماعتیں شدید اختلافات کی بناء پر مسلم لیگ (ن) سے علیحدہ ہو گئیں۔ کراچی میں امن و امان کی صورت حال مخدوش ہو گئی۔

1999 کے وسط میں کارگل کے سانحہ نے نواز حکومت کو کمزور کر دیا۔ کارگل فوج کا پسندیدہ عسکری منصوبہ تھا جس کا مقصد بھارت کے علاقے میں کارگل کی سٹرٹیجک چوٹیوں پر قبضہ کر کے اور بھارت کی مقبوضہ کشمیر میں سپلائی لائن کو کاٹ کر اسے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ یہ عسکری منصوبہ بے نظیر کی منظوری کے لیے بھی پیش کیا گیا مگر انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ جی ایچ کیو کے ذرائع کے مطابق کارگل پلان نواز شریف کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اتفاق کیا۔ نواز کارگل کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"As the COAS, Pervez Musharraf ventured into a tactical conflict having strategic ramifications with India on Kargil without even taking into confidence the prime minister, the

[43] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 151

[44] نواز شریف انٹرویو ڈان 10 اکتوبر 2004

Naval and the Air chiefs. Not even his fellow corps commanders. In a meeting of the Defence Committee of the Cabinet (DCC) after the Kargil battle was well under way, it shocked me when the Naval and Air chiefs strongly complained about not having been taken into confidence before the Kargil misadventure".

ترجمہ: ''جب چیف آف آرمی سٹاف پرویز مشرف نے بھارت کے خلاف کارگل پر شاطرانہ فوجی تنازعہ شروع کیا جس کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے انہوں نے وزیراعظم، نیول اور ایئر چیفس کو اعتماد میں نہ لیا۔ نہ ہی انہوں نے اپنے رفقاء کور کمانڈروں کو اعتماد میں لیا۔ کارگل کی جنگ جاری تھی کہ کیبنٹ ڈیفنس کمیٹی کے ایک اجلاس میں اس وقت میں سکتے میں آگیا جب فضائیہ اور بحریہ کے چیفس نے سخت شکایت کی کہ کارگل کی مہم جوئی سے پہلے انہیں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔''

جنرل پرویز مشرف نے ایک ٹی وی انٹرویو میں تصاویر کے حوالے سے ثابت کیا کہ جنرل محمود نے وزیراعظم نواز شریف کو کارگل پر مکمل بریفنگ دی تھی وزیراعظم برف باری کے باوجود بریفنگ کے لیے ایک پہاڑی مقام ''کیل'' پہنچے تھے۔

مئی 1999 میں بھارت کی فوج کو علم ہوا کہ مجاہدین نے کشمیر کے دراس ریجن کی چوٹیوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ کارگل کا یہ دشوار گزار علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے جسے بھارت کی فوج شدید سردی میں خالی کردیتی تھی۔ یہ منصوبہ انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ مشرف نے دسمبر 1998 میں وزیراعظم نواز سے اس منصوبے کا ذکر ضرور کیا البتہ تفصیلات نہیں بتائیں۔ اس منصوبے کا مقصد بھارت کو کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مذاکرات کی میز پر لانا تھا۔ فوج کا خیال یہ تھا کہ بھارت چند سالوں کے بعد اس قدر طاقتور ہوجائے گا کہ پھر کشمیر کا مسئلہ مستقل طور پر کھٹائی میں پڑ جائے گا لہٰذا کارگل کے مقام پر اگر بھارت کی سپلائی لائن کاٹ دی جائے تو بھارت مذاکرات پر تیار ہوسکتا ہے۔

اس منصوبے کے خالقوں نے بین الاقوامی ردعمل کا خیال نہ رکھا۔ بھارت نے کارگل میں دراندازی کو پاکستان کا دھوکہ اور فریب قرار دیا کیونکہ یہ واقعہ ''دوستی کی بس'' واجپائی کے لاہور دورہ کے چند ماہ بعد پیش آیا۔ بھارت نے عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی اور پاکستان کو ایک دہشت گرد ریاست قرار دیا۔ بھارت نے اپنی ایئرفورس اور جدید ہتھیاروں سے پاکستانی دراندازوں کے

- نواز شریف — انٹرویو ڈان — 10 اکتوبر 2004
- بریگیڈیئر شوکت قادر — "An Analysis of the Kargil Crisis" — صفحہ 24
- بریگیڈیئر شوکت قادر — "An Analysis of the Kargil Crisis" — صفحہ 27

ٹھکانوں پر شدید بمباری کی جس سے سینکڑوں فوجی شہید ہوگئے۔ نواز شریف کے مطابق کارگل کی جنگ میں 2700 نوجوان شہید ہوئے یہ تعداد 1965ء اور 1971 کی دونوں جنگوں کے شہدا سے زیادہ تھی۔

بھارت نے جنرل مشرف اور چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان کے درمیان گفتگو کی ٹیپ جاری کردی جس سے ثابت ہوگیا کہ کارگل کی چوٹیوں پر پاکستانی فوج موجود تھی۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کا خیال ہے کہ یہ گفتگو امریکہ کی خفیہ ایجنسی نے ٹیپ کی اور یہ ٹیپ بھارت کو فراہم کی۔

نواز نے پاک فوج اور اپنی سول حکومت کو خفت سے بچانے کے لئے ہنگامی طور پر امریکہ کے صدر کلنٹن سے مداخلت کی اپیل کی۔ نواز امریکہ پہنچے اور کلنٹن سے ملاقات کی۔ کلنٹن نے ملاقات کے دوران سخت الفاظ استعمال کیۓ اور نواز کو باور کرایا کہ بھارت اور پاکستان ایٹمی جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ کلنٹن نے شکوہ کیا کہ امریکہ نے کئی بار پاکستان سے کہا کہ اسامہ کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے مگر پاکستان نے وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ آئی ایس آئی طالبان کی سرپرستی کرکے دہشت گردی کو سپورٹ کررہی ہے۔ نواز نے پاک افواج کی بلامشروط واپسی کے فیصلے کو قبول کرلیا۔ فوج کے سینئر کمانڈرز نواز کے اس فیصلے سے ناراض ہوگئے۔ نواز شریف نے امریکہ کے صدر کلنٹن سے ملاقات کے دوران ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا ''جی جی بالکل یہ بات ہوئی تھی کہ پاکستان نے ایٹمی ہتھیار اپنے ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن منتقل کیۓ تھے۔ میں نے صدر کلنٹن کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا کیونکہ مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا صدر کلنٹن نے مجھے کہا کہ ہمارے پاس یہ بالکل درست اطلاع موجود ہے کہ پاکستان نے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے لیے ان کی نقل و حرکت کی تھی۔ امریکی صدر کلنٹن نے مجھ سے پوچھا کہ بطور چیف ایگزیکٹو اور وزیراعظم آپ کو اس کا علم کیوں نہیں۔ اب آپ دیکھئے اگر واقعی یہ بات سچی ہے تو کیا جنرل مشرف کو وزیراعظم سے پوچھے بغیر ایٹمی ہتھیاروں کی نقل و حرکت کرنی چاہیۓ تھی۔ اگر ملک کو کوئی نقصان پہنچتا تو ذمے داری حکومت پر آئی تھی جنرل مشرف کا یہ رویہ سراسر غیر ذمہ دارانہ تھا۔''

پاکستان واپسی پر نواز نے فوج کو حکم دیا کہ کارگل کے منصوبہ سازوں کی نشاندہی کرکے ان کو فارغ کیا جائے۔ مشرف کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ انکوائری کی صورت میں ان پر عتاب آئے گا لہٰذا انہوں نے فوجی گیریژن کا دورہ کرکے فوج کو اعتماد میں لیا۔ کارگل کے تنازعہ کی وجہ سے فوج کے کمانڈروں اور نواز کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ سینئر کمانڈروں کے خیال میں نواز کا کارگل سے فوجیوں کی بلامشروط واپسی کا

- بریگیڈیئر شوکت قادر — "An Analysis of the Kargil Crisis" — صفحہ 27
- سہیل وڑائچ — غدار کون — صفحہ 143
- حسین حقانی — "Pakistan between Mosque and Military" — صفحہ 252
- حسین حقانی — "Pakistan between Mosque and Military" — صفحہ 253
- سہیل وڑائچ — غدار کون — صفحہ 151
- بریگیڈیئر شوکت قادر — "An Analysis of the Kargil Crisis" — صفحہ 29

فیصلہ قومی مفاد کے خلاف تھا۔ نواز کے مطابق اگر پاک فوج کے جوانوں اور مجاہدین کو کارگل سے واپس نہ بلایا جاتا تو پاکستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ یہ مناسب موقع تھا کہ نواز کارگل میں مہم جوئی کی بنیاد پر جنرل مشرف کے خلاف کارروائی کرتے مگر انہوں نے یہ موقع کھو دیا اور بعد میں خود ان کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔

ستمبر 1999ء کے وسط میں مشرف نے ایک اجلاس میں نواز کو ٹھوس ثبوت فراہم کر دیئے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ نواز مشرف کی جگہ اپنا وفادار جنرل لانا چاہتے ہیں۔ نواز نے مشرف کو وقتی طور پر مطمئن کرنے کے لئے انہیں آرمی چیف کے علاوہ جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بھی نامزد کر دیا۔ مگر اس فیصلے سے مشرف اور نواز کے درمیان شکوک و شبہات ختم نہ ہوئے۔ مجید نظامی نے مصنف کو بتایا کہ نواز اور مشرف کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہوگئے تھے کہ نواز مشرف کو انٹرویو نہیں دے رہے تھے۔ میں (مجید نظامی) نے میاں شریف سے بات کی۔ مشرف کو رائے ونڈ لاہور میں ملاقات کا وقت مل گیا۔ میاں شریف (اباجی) نے مشرف کے گلے میں ہار ڈال کر استقبال کیا اور پرتکلف لنچ دیا۔ مشرف نواز کی ملاقات ہوگئی۔

اکتوبر 1999ء میں آرمی چیف مشرف نے کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز خان کو ریٹائر کر دیا۔ جنرل طارق نے عسکری رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وزیراعظم نواز سے ملاقات کی تھی اور انہیں کور کمانڈروں کے اجلاس کی اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ کور کمانڈرز کے اجلاس میں ہونے والی گفتگو سے باخبر ہونے کے بعد نواز، مشرف سے بدظن ہوگئے۔ فوج میں سروس رولز کی خلاف ورزی کو سنگین جرم مگر آئین کی خلاف ورزی کو معمول کی کارروائی سمجھا جاتا ہے۔ نواز شریف کے مطابق جنرل طارق نے ان سے ملاقات نہیں کی تھی بلکہ کور کمانڈرز کے کوئٹہ اجلاس میں کارگل کے بارے میں مشرف سے سخت سوال کیے تھے اور نواز شریف کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُنہوں نے کارگل میں شکست کے بعد فوج کو انتہائی مشکل صورت حال سے باہر نکالا ان ریمارکس کے بعد جنرل مشرف نے جنرل طارق کو ریٹائر کر دیا۔ کور کمانڈرز نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر نواز فوج کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو فوج پیش قدمی کر کے وزیراعظم ہاؤس اور دوسری سٹریٹجک عمارتوں کو اپنی تحویل میں لے لے۔ [42] نواز نے مشرف کو ہٹانے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ مشرف ایک دو روز کے لیے ملک سے باہر چلیں جائیں تاکہ ان کی عدم موجودگی میں فوج کی کمان تبدیل کر سکیں۔ سری لنکا میں فوجی سربراہوں کی ایک کانفرنس ہونے والی تھی جس میں ڈی جی آئی ایس آئی ضیاء الدین بٹ کو شرکت کرنا تھی۔ نواز نے مشرف کو ترغیب دی کہ اس اہم کانفرنس میں وہ خود شرکت کریں۔ مشرف اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کو فوج کی کلیدی آسامیوں پر فائز کر چکے تھے لہٰذا وہ اطمینان کے ساتھ سری لنکا چلے گئے۔

12 اکتوبر 1999ء کو نواز نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کے منصب سے ہٹا کر اپنے فیملی فرینڈ

[42] Brian Clougley "A History of the Pakistan Army" صفحہ 406

آرمی انجینئر ضیاء الدین بٹ کو نیا آرمی چیف نامزد کر دیا۔ چیف آف جنرل سٹاف جنرل عزیز نے نواز سے کہا کہ وہ اپنا فیصلہ جنرل مشرف کے وطن پہنچنے تک مؤخر کر دیں۔ نواز اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور جنرل بٹ کو آرمی چیف بنانے کے فیصلے کا اعلان ٹیلی ویژن پر کر دیا۔ جی ایچ کیو اگر جونیئر جنرل ضیاء الدین بٹ کو نیا آرمی چیف تسلیم کر لیتا تو بہت سے سینئر جرنیلوں کو مستعفی ہونا پڑتا۔ جی ایچ کیو نے طے شدہ پلان کے مطابق وزیراعظم ہاؤس، ٹیلی ویژن اور دیگر حساس عمارتوں کو گھیرے میں لے لیا۔ [43] جنرل مشرف فوری طور پر بذریعہ کمرشل فلائٹ سری لنکا سے پاکستان کے لیے روانہ ہوگئے۔ نواز نے احکامات جاری کر دیئے کہ جنرل مشرف کے جہاز کو پاکستان میں لینڈ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی نے کراچی ایئرپورٹ کے رن وے کو بڑے ٹرالے کھڑے کر کے بلاک کر دیا تاکہ طیارہ لینڈ نہ کر سکے۔ طیارے کو پاکستان میں لینڈ کرنے کی اجازت نہ دینے کا فیصلہ انتہائی احمقانہ تھا۔ مشرف کے طیارے میں پٹرول کم تھا، نواز کے فیصلے سے مشرف اور طیارے کے دوسرے مسافروں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ کراچی کے کور کمانڈر نے ایئرپورٹ کا کنٹرول سنبھال لیا اور مشرف کراچی ایئرپورٹ پر اُترنے میں کامیاب ہوگئے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایک جنرل ضیاء الحق فضا میں اقتدار سے محروم ہوا جبکہ دوسرے جنرل پرویز مشرف کو فضا میں اقتدار حاصل ہوگیا۔ فوج نے نواز کو گرفتار کر لیا، ان کے خلاف طیارہ ہائی جیک کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی۔ بعد میں امریکہ کے صدر کلنٹن اور سعودی عرب کے شہنشاہ کی فرمائش پر نواز اور ان کے خاندان کو جدہ سعودی عرب جلاوطن کر دیا گیا۔ جب مشرف نے اقتدار سنبھالا تو عوام نے احتجاج کی بجائے ان کا خیر مقدم کیا اور نواز کا ہیوی مینڈیٹ ہوا سے بھرا ہوا غبارہ ثابت ہوا۔

جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد 12 اکتوبر کو رات تین بجے قوم سے مختصر خطاب کر کے اپنے مؤقف کا اظہار کیا۔

"میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم! آپ سب اس بحرانی اور غیر یقینی صورتحال سے آگاہ ہیں جس میں سے ملک حالیہ دنوں میں گزرا ہے۔ نہ صرف تمام اداروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی اور انہیں منظم طریقے سے تباہ کیا گیا، بلکہ معیشت بھی مفلوج ہوکر رہ گئی۔ ہم ان خود غرضانہ پالیسیوں سے بھی آگاہ ہیں جنہوں نے وفاق پاکستان کی بنیادوں تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلح افواج پر مسلسل عوام اور مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے دباؤ تھا کہ ملک کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتحال کا مداوا کیا جائے، ملک کے بہترین مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ وزیراعظم کو ہمیشہ ان خدشات سے آگاہ کیا گیا۔ یہ واضح ہے کہ انہیں کبھی بھی درست معنوں میں نہیں لیا گیا، میری ان کوششوں کا واحد مقصد ملک کی فلاح تھا، صرف یہی وجہ تھی کہ فوج نے خوشی سے تعمیر

[43] مقبول ارشد چوتھا مارشل لاء صفحہ 21

ملت کے کاموں کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔ جن کے نتائج کا آپ بخوبی اندازہ کر چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میری تمام کوششوں اور مشاورت کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس کے بجائے اب انہوں نے اپنی تمام توجہ فوج پر مرکوز کردی، میرے تمام مشوروں کے باوجود انہوں نے مسلح افواج میں مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ فوج وہ کارآمد ادارہ ہے جس پر آپ ملک کے استحکام، اتحاد کے لئے اس کی جانب دیکھتے ہیں اور اس پر آپ سب بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ ہمارے خدشات ایک مرتبہ پھر غیر مبہم انداز میں حکومت تک پہنچائے گئے، مسٹر نواز شریف کی حکومت نے انہیں نظر انداز اور فوج کو سیاست میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اسے غیر مستحکم کرنے اور اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ میں سرکاری دورے پر سری لنکا میں تھا۔ میری واپسی پر پی آئی اے کی کمرشل پرواز کو کراچی ایئرپورٹ پر اُترنے کی اجازت نہ دی گئی اور ایندھن کی انتہائی کمی کے باوجود حکم دیا گیا کہ اسے پاکستان سے کہیں باہر اُتارا جائے، اس طرح تمام مسافروں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ فوج کے تیز رفتار ایکشن سے ان مکروہ عزائم کو ناکام کردیا گیا۔ میرے عزیز ہم وطنو! اس پس منظر کی اختصار سے وضاحت کرنے کے بعد میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلح افواج نے آخری چارہ کار کے طور پر ملک کی باگ ڈور سنبھال لی ہے، تاکہ ملک کو مزید عدم واستحکام سے بچایا جاسکے۔ میں نے یہ کام پورے خلوص و وفاداری اور ملک کے ساتھ بے غرض وابستگی کے جذبے سے کیا ہے اور مسلح افواج مضبوطی کے ساتھ میرے پیچھے ہیں۔ میں اس وقت کوئی طویل پالیسی بیان جاری نہیں کرنا چاہتا، لیکن میں جلد ہی طویل پالیسی بیان جاری کروں گا۔ اس وقت میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ملک میں صورتحال مکمل طور پر پرامن، مستحکم اور قابو میں ہے۔ پیارے بھائیو اور بہنو! آپ کی مسلح افواج نے آپ کو کبھی مایوس نہیں کیا اور نہ آئندہ کرے گی، انشاء اللہ ہم ملک کے اتحاد اور اقتدار اعلیٰ کا اپنے خون کے آخری قطرے تک تحفظ کریں گے۔ میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ پُرامن رہیں اور اپنی مسلح افواج کی حمایت کریں تاکہ پاکستان کا مستقبل روشن ہو اور خوشحال بنانے کیلئے اسے دوبارہ مستحکم بنا دیا جائے۔ اللہ ہمیں سچائی اور عزت کی راہ پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ حافظ، پاکستان پائندہ باد۔"[14]

عائشہ صدیقہ آغا نواز کی سیاسی بصیرت کے بارے میں کہتی ہیں:۔

"Nawaz Sharif was accused of conspiring to destroy the institution of the military. Notwithstanding the lack of Sharif's political acumen and the mistakes he made, he had threatened the military's core interests, which led to his removal. Administrative control of the armed forces and general military planning are areas where the armed forces do

[14] جنرل پرویز مشرف کا قوم سے خطاب "پاکستان میں فوجی حکومتیں"۔ مرتضیٰ انجم صفحہ 420

not allow any interference. Prime Minister Junejo, it must be remembered, was removed in 1988 because he had tried to take a course opposed to the Army. His efforts to probe into the 'Ojhri' camp disaster and introduce austerity measures in the defence establishment had backfired. Benazir Bhutto's government elected in 1988 had a similar fate. The Army manipulated her removal in 1990. Despite her knowledge of this information she remained silent which was due to her fear of the Army's possible retaliation".[15]

ترجمہ: "نواز شریف پر فوج کے ادارے کو تباہ کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا۔ نواز میں سیاسی بصیرت کی کمی تھی۔ اس نے ایسی غلطیاں کیں جن سے فوج کے بنیادی مفادات خطرے میں پڑ گئے اور نواز کو معزول ہونا پڑا۔ افواج پاکستان کی ایڈمنسٹریشن اور فوجی منصوبہ بندی ایسے شعبے ہیں جن میں فوج کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔ وزیراعظم جونیجو کو 1988 میں اس لیے برطرف کیا گیا کیونکہ انہوں نے فوج سے مختلف حکمتِ عملی اپنائی تھی۔ انہوں نے اوجڑی کیمپ کی تباہی کے بارے میں تحقیقات کرانے کی کوشش کی اور عسکری دفاعی اسٹیبلشمینٹ میں سادگی اور کفایت شعاری لانے کا فیصلہ کیا جن کا فوج کی جانب سے ردِعمل ہوا۔ 1988 میں بے نظیر کی منتخب حکومت کو بھی اسی مقدر کا سامنا کرنا پڑا۔ فوج نے 1990 میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کی منصوبہ بندی کی۔ بے نظیر کو اس منصوبے کا علم تھا مگر وہ خاموش رہیں کیونکہ ان کو ممکنہ فوجی ردِعمل کا خوف تھا۔"[15]

نواز شریف کا پاک فوج کے چار آرمی چیفس سے واسطہ رہا۔ وہ آرمی چیفس کے خاموش سیاسی کردار کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"I don't think the problem in Pakistan lies with the prime ministers. It is the attitude of all-powerful, hawkish and snobbish army chiefs who after becoming COAS start acting as 'super prime ministers' and consider it their right to call the shots even in political matters. They start giving baits to the people who matter, including the politicians, to conspire against the sitting government. Their frequent contacts with the opposition leaders by employing coercive tactics through the intelligence agencies eventually leads to the destabilisation of the government. They are instrumental in activating the press against the government, thus creating uncertainty

[15] عائشہ صدیقہ آغا "Pakistan's Arms P· rement And Military Build-up1979-99" صفحہ 74

amongst the politicians and people at large." [46]

ترجمہ: ''میرے خیال میں پاکستان کے مسائل کے ذمہ دار پاکستان کے وزیراعظم نہیں ہیں۔ مسائل کی ذمہ داری ان عقابی امارت پرست اور طاقت ورترین آرمی چیفس کے رویے پر عائد ہوتی ہے جو آرمی چیف بننے کے بعد ''سپر پرائم منسٹرز'' کے طور پر ایکٹ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سیاسی معاملات پر بھی حکم جاری کرتے ہیں۔ وہ سیاست دانوں اور دوسرے بااثر افراد کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ حکومت وقت کے خلاف سازش کریں۔ وہ اپوزیشن لیڈروں سے رابطے کرتے رہتے ہیں اور خفیہ ایجنسیوں سے جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کروانے کے بعد حکومت کو عدم استحکام کا شکار کرتے ہیں۔ وہ صحافت کو حکومت کے خلاف متحرک کرنے کے لیے آلۂ کار بنتے ہیں، چنانچہ اس طرح وہ کھلے بندوں سیاست دانوں اور عوام میں غیر یقینی پیدا کرتے ہیں۔'' [46]

عائشہ صدیقہ آغا رقم طراز ہیں:۔

"Notwithstanding Sharif's policies the coup was driven more by the Army's concern for saving its own institution. It was feared that by instituting personal control of the Army, Sharif would eventually downsize the military and reduce its size. Moreover, the Army did not appreciate the Prime minister's interference in military matters. Defence related issues have always fallen in the military's ambit." [47]

ترجمہ: ''نواز شریف کی پالیسیوں کے برعکس فوج نے خدشات کے پیش نظر اپنے ادارے کو محفوظ کرنے کے لئے اقتدار پر قبضہ کیا۔ خدشہ یہ تھا کہ نواز فوج کو اپنے کنٹرول میں لا کر فوج میں ڈاؤن سائزنگ کر کے اس کی تعداد کم کر دیں گے علاوہ ازیں، فوج نے وزیراعظم کی عسکری اُمور میں مداخلت کو بھی پسند نہ کیا۔ دفاعی اُمور ہمیشہ فوج کے اپنے دائرہ اختیار میں رہے ہیں۔'' [47]

نواز شریف فوج پر سول حکومت کی بالادستی قائم کرتے وقت بھول گئے کہ فوج کبھی اس حد تک سول حکومت کے تابع نہیں رہی کہ اس کے کارپوریٹ مفادات خطرے میں پڑ جائیں۔ نواز کا خیال تھا کہ فوج ہیوی عوامی مینڈیٹ سے نہیں ٹکرائے گی۔ ان کی اگر تاریخ پر نظر ہوتی تو انہیں علم ہوتا کہ فوج نے مشرقی پاکستان کے فطری اور حقیقی عوامی مینڈیٹ سے متصادم ہونے سے گریز نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ ملک

[46] نواز شریف انٹرویو ڈان 10 اکتوبر 2004

[47] عائشہ صدیقہ آغا "Pakistan's Arms Procurement And Military Build-up1979-99" صفحہ 192

دولخت ہو گیا۔ نواز شریف نے بیک وقت عدلیہ، پارلیمنٹ، صدر اور فوج کو اپنے کنٹرول میں لانے کی کوشش کی جو پاکستان کے موجودہ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام میں ممکن نہیں۔ ایسا صرف منظم انقلاب کی صورت میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

نواز شریف نے اپنی حکومت کے تختہ اُلٹے جانے کے بارے میں بتایا ''سچ تو یہ ہے کہ جرنیل اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ وگرنہ چند گھنٹوں میں بغاوت ممکن نہیں ہوتی ٹیک اوور کے بعد 12 اکتوبر کی رات میرے پاس جنرل محمود اور جنرل اورک زئی آئے اور کہا ''اس کاغذ پر دستخط کر دیں'' وزیراعظم کی طرف سے اسمبلیاں توڑنے کا مشورہ تحریر تھا میں نے انکار کیا اور کہا "Over My Dead Body" اور کاغذ اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس پر جرنیلوں نے کہا ''اب آپ سے بدلہ لیا جائے گا'' بعد ازاں مجھے وہاں سے چند فٹ کے کمرے میں منتقل کر دیا اور اس کے شیشوں کو رنگ دیا گیا کہ میں باہر بھی نہ دیکھ سکوں۔ [48]

[48] سہیل وڑائچ غدار کون صفحہ 166

باب 11

روشن خیال جنرل

''جنرل پرویز مشرف نے شہباز شریف اور چوہدری نثار کو جی ایچ کیو طلب کیا اور کیسٹ آن کر دیا۔ حکمران فوج کو فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔''[1] فوج کی خفیہ ایجنسیاں سول حکمرانوں کی سرگرمیوں کو مانیٹر اور ان کی گفتگو کو ٹیپ کرتی رہی ہیں۔ جنرل مشرف کو بھی ایسی ٹیپ مل گئی جس سے اُن کو یقین ہو گیا کہ نواز شریف فوج کو فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک سٹرٹیجک منصوبہ تیار کر رکھا تھا جس پر عمل کر کے فوج اقتدار پر قبضہ کر سکتی تھی۔

مخصوص معروضی حالات کی بناء پر پاکستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے جنرل مشرف کا خیر مقدم کیا۔ پاکستان کے کم و بیش سب کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں نے جنرل مشرف کے فیصلہ پر مثبت رائے کا اظہار کیا۔ جنرل مشرف کی خواہش تھی کہ صدر مملکت رفیق تارڑ اپنے منصب پر برقرار رہیں تا کہ ان کی حکومت کو منتخب صدر کا کور (cover) حاصل رہے۔ رفیق تارڑ نے شریف خاندان کی خواہش پر صدارت کے منصب سے استعفیٰ دینے سے گریز کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ صدر مملکت کی حیثیت سے بوقت ضرورت اپنے محسن شریف خاندان کے کام آسکیں۔[2] جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد امریکی سینٹرل کمانڈ کے جنرل انتھونی زینی کو فون کر کے ان وجوہات سے آگاہ کیا جن کی بناء پر انہیں اقتدار سنبھالنا پڑا۔[3] دولت مشترکہ اور یورپی یونین نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور سویلین رول بحال کرنے پر زور دیا۔ مشرف نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی بجائے پاکستان کا چیف ایگزیکٹو بننا پسند کیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق سے مختلف نظر آنا چاہتے تھے۔

مشرف نے 17 اکتوبر 1999ء کو قوم سے تفصیلی خطاب کیا اور سات نکاتی ایجنڈا پیش کیا۔

1- قومی اعتماد اور مورال کی تعمیرِ نو

2- وفاق کو مضبوط بنانا، صوبوں کے درمیان رابطے کو فروغ دینا اور قومی یک جہتی پیدا کرنا۔

---

[1] منیر احمد ''جنرل پرویز مشرف جی ایچ کیو سے ایوان صدر تک''

[2] رفیق تارڑ نے ایک ملاقات میں مصنف کو بتایا۔

[3] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 256

3- معیشت کی بہتری کے لئے فوری اقدامات کرنا تاکہ سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال ہو سکے۔
4- قانون کی حاکمیت کو یقینی بنانا اور فوری انصاف کی فراہمی۔
5- قومی اداروں سے سیاست کا خاتمہ
6- اقتدار کی بنیادی سطح تک منتقلی تاکہ ملکی معاملات میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔
7- فوری اور غیر جانبدارانہ احتساب۔ [4]

مشرف اپنے قومی ایجنڈے کو ترجیحی بنیادوں پر آگے نہ بڑھا سکے۔ ان کی اپنی ذات آگے نکل گئی اور ایجنڈا پیچھے رہ گیا۔

پاکستان کے سابق صدر رفیق تارڑ نے مصنف کو بتایا کہ جنرل مشرف نے ان سے ایوان صدر میں 13 اکتوبر 1999ء کی صبح ملاقات کی اور رفیق تارڑ سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کے مفاد کے لیے صدارت کے عہدے پر فائز رہیں کیونکہ اگر انہوں نے استعفیٰ دیا تو خدشہ ہے کہ عالمی طاقتیں پاکستان کو روگ سٹیٹ (rogue state) قرار نہ دے دیں۔ رفیق تارڑ نے جنرل مشرف سے کہا کہ جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاء نے مارشل لاء لگایا۔ آج کوئی بھی ان کے غیر آئینی اقدام کی حمایت نہیں کرتا آپ آئین توڑیں گے تو یہی کہا جائے گا کہ آپ نے اپنی نوکری کے لیے جمہوریت کو ختم کر دیا۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں کہ جمہوریت بھی جاری رہے اور آپ کی سروس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ مشرف نے اپنے رفقاء سے مشورہ کے بعد رفیق تارڑ سے رابطہ کرنے کا وعدہ کیا۔ مشرف مضطرب تھے مگر ان کو مبارکباد اور خراج تحسین کے پیغامات آنے لگے اور انہوں نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔

جرنیل حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد احتساب کا نعرہ لگاتے ہیں جو عوام کے لئے بڑا پرکشش ہوتا ہے۔ احتساب کا بڑا مقصد سیاسی مخالفین کو خوف زدہ کرنا اور اپنی حکومت کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ جنرل مشرف نے احتساب پر بڑا زور دیا اور اس مقصد کی خاطر ایک ادارہ نیب (NAB) (National Accountibility Bureau) قائم کیا جس کے سربراہ حاضر سروس لیفٹیننٹ جنرل تھا۔ ابتداء میں نیب کی کارکردگی بڑی پُرجوش رہی اور نیب نے سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور ریٹائرڈ فوجی افسروں سے لوٹی ہوئی قومی دولت کے اربوں روپے وصول کیے۔ رفتہ رفتہ نیب کا ادارہ اقتدار کی مصلحتوں کا شکار ہو گیا اور اپنا امیج برقرار نہ رکھ سکا۔ جن سیاست دانوں کے خلاف نیب میں کیس چل رہے تھے وہ وفاقی کابینہ میں شامل ہو گئے۔

پاکستان کے سیاسی اور انتظامی نظام کا نیا منصوبہ تیار کرنے اور اختیارات کو نچلی سطح پر تقسیم کرنے کے لیے این آر بی (NRB) کا ادارہ تشکیل دیا گیا جس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) تنویر نقوی تھے۔ این آر بی نے ضلعی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا جس کے تحت اگست 2001 میں لوکل باڈیز کے انتخابات کرائے گئے اور

[4] مرتضیٰ انجم "پاکستان میں فوجی حکومتیں" صفحہ 477

ضلعی ناظمین منتخب ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا نظام ایک انقلابی اقدام تھا جسے عوامی سطح پر پذیرائی ملی۔ البتہ چونکہ اس نظام کا خاکہ ترتیب دیتے وقت مقامی قیادتوں سے مشاورت نہ کی گئی لہٰذا اس میں کئی سقم رہ گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار خواتین کو بلدیات، صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں ایک تہائی نشستیں دی گئیں۔ یہ نظام اس وقت متعارف کرایا گیا جب ملک میں صوبائی اور قومی اسمبلیاں موجود نہیں تھیں۔ عام انتخابات تک ضلعی نظام خوش اُسلوبی سے چلتا رہا مگر عام انتخابات کے بعد تضادات کا شکار ہو گیا۔ اس نظام میں صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اختیارات صوبائی حکومتوں سے لے کر ضلعی حکومتوں کو تو منتقل کیے گئے مگر وفاق سے صوبوں کو ایک بھی اختیار منتقل نہ ہوا۔ صوبائی حکومتوں کو مطمئن کرنے کے لیے لوکل باڈیز آرڈی نینس میں غیر معمولی ترامیم کی گئیں۔ ان ترامیم کے بعد منتخب ضلعی ناظم صوبائی وزیراعلیٰ کے تابع ہو گئے۔ پلان کے مطابق ضلع کی سطح پر احتساب کا نظام (ضلعی محتسب کا تقرر) قائم نہ کیا جا سکا لہٰذا ضلعی ناظمین پر چیک نہ ہونے کی وجہ سے کرپشن کے سنگین واقعات منظر عام پر آئے۔ حکومتی پارٹی کے 140 اراکین پارلیمنٹ نے وزیراعظم کو اپنے دستخطوں کے ساتھ تحریری شکایت کی کہ ضلعی ناظمین نے 5 ارب روپے کی کرپشن کی ہے لہٰذا ان کا احتساب کیا جائے۔ یہ شکایت قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی آڈٹ رپورٹ کی روشنی میں کی گئی۔ اس کمیٹی کے چیئرمین کا تعلق حکومتی پارٹی سے تھا۔ ضلعی حکومتوں کے دوسرے انتخابات ستمبر 2005 میں ہوئے۔ جن کے شفاف ہونے کے بارے میں حکومتی جماعت کے اہم رہنماؤں اور اپوزیشن کی تمام جماعتوں نے اپنے گہرے تحفظات کا اظہار کیا۔

سپریم کورٹ نے روایت کے مطابق جنرل مشرف کے اقتدار پر قبضے کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا۔ چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں سپریم کورٹ سابقہ عدالتی روایات سے بھی ایک قدم آگے چلی گئی اور اس نے جنرل مشرف کو آئین میں حسب ضرورت ترمیم کا اختیار بھی دے دیا۔ البتہ سپریم کورٹ نے تین سال کے اندر عام انتخابات کرانے کی پابندی عائد کر دی اور قرار دیا کہ آئین کا بنیادی ڈھانچہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مشرف نے جسٹس ارشاد حسن خان کو ریٹائرمنٹ کے بعد چیف الیکشن کمشنر پاکستان نامزد کر دیا۔

چیف ایگزیکٹو جنرل مشرف نے جولائی 2001 میں صدر پاکستان رفیق تارڑ کو فارغ کر دیا اور صدارت کا منصب خود سنبھال لیا۔ اس طرح وہ حکومت اور ریاست دونوں کے سربراہ بن گئے۔ [5] آئین کے ماہرین کے مطابق جنرل مشرف از خود پاکستان کے صدر نہیں بن سکتے تھے۔ رفیق تارڑ کا دعویٰ تھا کہ ایوان صدر سے رخصت ہونے کے باوجود وہ پاکستان کے آئینی صدر ہیں اور جب تک کوئی فرد آئین میں دیئے گئے طریقہ کار کے مطابق صدر منتخب نہیں ہوتا وہ صدارت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ مشرف نے

[5] زائرنگ لارنس "Pakistan At The Crosscurrent Of History" صفحہ 276

اخلاقی جواز حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں ریفرنڈم کرایا اور 98 فیصد ووٹ حاصل کر کے پانچ سال کے لیے صدر منتخب ہوگئے۔ پاکستان اور عالمی تبصرہ نگاروں نے اس ریفرنڈم کو بناوٹی اور مصنوعی قرار دیا۔ [6] مشرف نے خود افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ انہیں ریفرنڈم کے دوران بے ضابطگی کی چند اطلاعات ملی ہیں۔ [7]

مشرف نے سعودی عرب سے خفیہ معاہدہ کر کے نواز اور ان کے خاندان کو جدہ روانہ کر دیا۔ نواز نے وعدہ کیا کہ وہ دس سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گے۔ مشرف نے نواز کی سزائیں بھی ختم کر دیں۔ ضیاء الحق نے پوری دنیا کی اپیلوں کے باوجود بھٹو کی سزائے موت ختم نہیں کی تھی اور نہ ہی بھٹو نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ عوام نے اس کھلے تضاد کو بہت زیادہ محسوس کیا، صحافیوں نے تبصرے لکھے اور بھٹو ایک بار پھر عوام کے دلوں میں زندہ ہوگئے۔ [8] نواز کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ (ن) کو مسلم لیگ (ق) میں تبدیل کرنا آسان تھا۔ بے نظیر پہلے ہی ملک سے باہر تھیں نواز کے جدہ روانہ ہونے کے بعد مشرف کے لیے کوئی چیلنج باقی نہ رہا۔

مشرف 2002 کے انتخابات میں اپنے حامیوں کی کامیابی کے متمنی تھے تاکہ منتخب پارلیمنٹ سے اپنے اقتدار کے لئے آئینی جواز حاصل کر کے پاکستان کے عوام اور بین الاقوامی رائے عامہ کو مطمئن کر سکے۔ آئی ایس آئی نے سیاسی انجینئرنگ کر کے پاکستان مسلم لیگ (ق) کھڑی کر دی جو کنگز پارٹی کہلائی۔ مسلم لیگ (ن) کے لیڈروں کی اکثریت مسلم لیگ (ق) میں شامل ہوگئی، مذہبی جماعتوں نے متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) کے نام سے سیاسی انتخابی اتحاد قائم کر لیا۔ حکومت نے مذہبی مدارس کی اسناد کو بی اے کے مساوی قرار دے کر ایم ایم اے سے تعاون کیا۔ اپوزیشن کی جماعتوں نے ایم ایم اے کو "ملا ملٹری آلائینس" کا نام دیا۔ نواز اور بے نظیر کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی گئی۔ انتخابات سے قبل اور پولنگ ڈے پر دھاندلی کے باوجود مسلم لیگ (ق) اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ مسلم لیگ (ق) نے قومی اسمبلی کی 118، پی پی پی نے 81، ایم ایم اے نے 60، مسلم لیگ (ن) نے 19 اور ایم کیو ایم نے 17 نشستیں حاصل کیں۔ مشرف کے لیے مرکز میں اپنی حامی جماعتوں کی حکومت بنانا دشوار ہوگیا۔ اکثریت حاصل کرنے کے لیے جمہوری روایات کے برعکس معروف اور سزا یافتہ افراد کو وزیر بنایا گیا۔ ایم کیو ایم کو مرکز اور سندھ کی حکومت میں شامل کیا گیا۔ [9]

وفاقی حکومت کی تشکیل میں چالیس روز لگے۔ پی پی پی کے ایک درجن اراکین قومی اسمبلی اگر اپنی

---

6. سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 154
7. آئن ٹالبوٹ "Pakistan in 2002" ایشین سروے 2002 صفحہ 202
8. زائرنگ لارنس "Pakistan At The Crosscurrent Of History"
9. اصغر خان "ہم نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا" صفحہ 254

وفاداریاں تبدیل کر کے حکومت میں شامل نہ ہوتے تو مشرف کے لیے مرکز میں حکومت بنانا ممکن نہ ہوتا۔ بلوچستان کے ظفر اللہ جمالی قومی اسمبلی کے 342 ووٹوں میں سے 170 ووٹ لے کر وزیر اعظم منتخب ہوگئے۔

مشرف نے ریاستی مشینری کو استعمال کر کے پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) کے اراکین اسمبلی کی وفاداریاں تبدیل کر کے مرکز میں حکومت تو بنا لی مگر آئین میں ترمیم کے لیے انہیں دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی جو صرف اس صورت میں ممکن تھی کہ پی پی پی یا ایم ایم اے ان سے تعاون کرے۔ آئین میں ترمیم کے بغیر چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے ان کے آئین سے ماورا اقدامات، احکامات، قوانین اور فیصلوں کو آئینی تحفظ نہیں مل سکتا تھا۔ پی پی پی نے جمہوری اُصولوں اور روایات کی پاسداری کرتے ہوئے مشرف کو آئینی صدر قبول کرنے اور ان کے جاری کردہ ایل ایف او (Legal Framework Order) کو آئین کا حصہ بنانے سے انکار کر دیا۔ مشرف نے ایل ایف او جاری کر کے 1973 کے آئین کی 29 شقوں کو تبدیل کر دیا تھا اور کابینہ کو برطرف کرنے اور پارلیمنٹ کو ختم کرنے کا اختیار بھی حاصل کر لیا تھا۔ [10] ایم ایم اے میں شامل مذہبی جماعتوں کو پہلی بار صوبہ سرحد میں حکومت بنانے اور بلوچستان میں حکومتی جماعت کے ساتھ صوبائی حکومت میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ ایم ایم اے کے مرکزی لیڈروں کے فوج کے ساتھ دیرینہ روابط تھے۔ ایم ایم اے کے اراکینِ اسمبلی کی مدرسوں کی سندوں کی اہلیت کے بارے میں ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ ایم ایم اے نے متحدہ اپوزیشن کے موٴقف کے برعکس مشرف کو آئینی راستہ دینے کا فیصلہ کر لیا اور سترہویں ترمیم منظور کر کے صدر مشرف کے جاری کردہ ایل ایف او کو آئین کا حصہ تسلیم کر لیا۔ البتہ ایم ایم اے مشرف کو دسمبر 2004 میں وردی اُتارنے کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مشرف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب میں وعدہ کیا کہ وہ ایم ایم اے سے معاہدہ کے مطابق دسمبر 2004 تک آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیں گے۔ مشرف ایم ایم اے سے سترہویں آئینی ترمیم کی حمایت میں ووٹ لینے کے بعد حالات کا بہانہ بنا کر اپنے وعدے سے منحرف ہوگئے۔

امریکہ میں 11 ستمبر 2001 کے المناک سانحہ نے دنیا کے عالمی نظام کو متاثر کیا۔ دہشت گردوں کا تعلق القائدہ سے جوڑا گیا اور اسامہ بن لادن کو امریکہ کا دشمن نمبر ایک قرار دیا گیا۔ 11 ستمبر کے بعد پاکستان شدید عالمی دباؤ میں آگیا۔ مشرف چونکہ منتخب عوامی لیڈر نہیں تھے لہٰذا وہ اس دباؤ کو برداشت نہ کر سکے انہوں نے امریکی سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ایک فون کال پر امریکہ کی سات شرائط تسلیم کر لیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی جگہ کوئی بھی لیڈر ہوتا اس کے لئے بھی امریکہ کے سامنے کھڑا ہونا ممکن نہ ہوتا مگر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ مشرف ضرورت سے زیادہ دباؤ میں آگئے۔ وہ امریکہ سے تعاون کا وعدہ ضرور کرتے مگر شرائط کے سلسلے میں مہلت طلب کرتے اور اپنی کابینہ اور کور کمانڈرز کو اعتماد میں لیتے۔ منتخب عوامی لیڈر کے لئے

---

10. Maria Madalena "Pakistan under Siege" صفحہ 181

اس نوعیت کے پالیسی فیصلہ کے سلسلے میں پارلیمنٹ اور کابینہ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔ مشرف کے فیصلے کے بعد پاکستان ایک بار پھر عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے اتحادی کی حیثیت سے فرنٹ لائن سٹیٹ بن گیا۔

امریکہ کے ممتاز صحافی باب وڈ ورڈ (Bob Woodward) نے ایک کتاب 'Bush At War' تحریر کی۔ اس کتاب نے دنیا کی بیسٹ سیلر کتاب ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ باب وڈ ورڈ نے اپنی کتاب کے آٹھویں باب میں 11 ستمبر کے سانحہ کے بعد امریکہ اور پاکستان کے درمیان خاموش مگر برق رفتار ڈپلومیسی پر روشنی ڈالی ہے۔

''پاول پہلے ہی بش کو خبردار کر چکا تھا کہ وہ کوئی بھی کارروائی کریں لیکن یہ ایکشن پاکستان کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے پاکستانیوں کو خبردار کر دینا ضروری ہے۔ پرویز مشرف پر زیادہ دباؤ ڈالنا بھی خطرناک تھا اور دباؤ نہ ڈالنا اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ پاول کے ذہن میں اس سلسلے میں ایک منصوبہ موجود تھا۔

جو بھی کر سکتے ہو کرو، بش نے پاول سے کہا۔
ان لوگوں کو کس طرح قابو کیا جائے، پاول نے آرمیٹج سے کہا
ہمیں ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔ انہوں نے ترجیحات کا تعین اس طرح کیا۔

1- پاکستان میں القاعدہ کی سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ پاکستان کے ذریعہ افغانستان میں ہتھیاروں کی ترسیل بند کرائی جائے اور اسامہ بن لادن کو پاکستان کے راستے ہر طرح کی اخلاقی اور مادی اعانت رکوائی جائے۔
2- امریکہ پاکستان میں تمام پروازوں اور ہوائی اڈوں وغیرہ پر اُترنے کے حقوق حاصل کر لے۔
3- پاکستان کے تمام عسکری، بحری فضائی اڈوں، فوجی مراکز اور سرحدوں کو استعمال کرنے کا حق حاصل کر لیا جائے۔
4- انٹیلی جنس اور نقل مکانی کی معلومات کو بہتر بنایا جائے۔
5- امریکہ میں 11 ستمبر کے حملوں کے حوالے سے ایک مذہبی مہم چلائی جائے۔ امریکہ کے خلاف تخریب کاری کی حمایت میں (پاکستان میں) مقامی طور پر اظہار خیال کو سختی سے کچل دیا جائے (پاول اور آرمیٹج جانتے تھے کہ امریکہ کے خلاف بیان بازی اور مخالفانہ مظاہروں کو وہ امریکہ کے اندر بھی نہیں روک سکتے)۔
6- طالبان کو ہر قسم کے ایندھن کی فراہمی مکمل طور پر بند کر دی جائے اور پاکستان سے رضا کاروں کی طالبان کی حمایت میں روانگی پر پابندی لگوائی جائے۔
7- اس مطالبہ کا مقصد پاکستانی حکومت اور پرویز مشرف کے ہاتھ باندھنا ہے۔ اسامہ بن لادن اور

القاعدہ کے خلاف ایسی مضبوط شہادتیں سامنے لائی جائیں اور طالبان کے سرپرست ہونے کے تعلق سے پاکستان پر غیر معمولی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ طالبان کی مدد اور حمایت سے بالکل ہاتھ اُٹھا لے اور اس کے بعد اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے کیلئے امریکہ کی کھلی حمایت اور مدد کرے۔

دوسرے الفاظ میں پاول اور آرمیٹج پاکستان سے وہ کام لینا چاہتے تھے کہ جو پاکستان کی انٹیلی جنس نے طالبان کی تشکیل اور انہیں افغانستان کا حکمران بنوانے کیلئے کیا تھا اور اب اسے تباہ کرنا بھی انہیں کی ذمہ داری قرار دی جا رہی تھی۔

آرمیٹج نے پاکستانی انٹیلی جنس کے سربراہ جنرل محمود کو سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں طلب کیا* اور کہا:۔

''یہ ہمارے سات مطالبات ہیں، جن میں کسی کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپ کو یہ سارے مطالبات من وعن قبول کرنے ہوں گے۔'' ڈیڑھ بجے دوپہر پاول نے جنرل پرویز مشرف سے بات کی۔

''ایک جنرل دوسرے جنرل سے مخاطب ہے۔'' پاول نے کہا ''ہم اپنے خلاف جنگ میں مدد چاہتے ہیں، امریکی عوام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ پاکستان اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ نہ دے۔''

پرویز مشرف نے پاول کو یہ جواب دے کر حیران کر دیا کہ پاکستان امریکہ کے ساتوں مطالبات تسلیم کرتا ہے اور وہ امریکہ کی ہر کارروائی کی حمایت میں ہے۔

اسی دوپہر کو نیشنل سکیورٹی کونسل کا اجلاس سچوایشن روم میں ہوا۔ بش نے کہا کہ وہ افغانستان کے اندر خفیہ آپریشن کو وسعت دینے اور شمالی اتحاد کو مالی اور نیم فوجی امداد کی فراہمی کیلئے سی آئی اے کی تجاویز کی منظوری دے رہا ہے۔

''میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ ہم نے آج پاکستانیوں سے کیا کہا؟'' پاول بولا۔ پھر اس نے سات امریکی مطالبات کی کاپی نکالی اور اسے اجلاس کے سامنے پیش کیا۔ اسے معلوم تھا کہ بش لمبی تحریروں کو پسند نہیں کرتا لیکن اس نے نہایت فخر کے ساتھ یہ مطالبات بلند آواز میں پڑھے۔ جب اس نے انہیں ختم کیا تو بش نے بتایا کہ جنرل مشرف پہلے ہی ان مطالبات کو قبول کر چکا ہے۔

''ایسا لگتا ہے کہ ہم نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے''، بش نے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو اپنے کپڑے اُتارے بغیر ہی سب کچھ حاصل کرنے میں کامیابی ہوگئی''[1]۔

باب وڈ ورڈ کی تحریر اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ امریکہ کا خیال تھا کہ اسے پاکستان کی حمایت کے بدلے بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی مگر پاکستان کی قیادت مناسب معاوضہ وصول کرنے سے بھی قاصر رہی۔ معاشی ماہرین کے خیال میں پاکستان کی حکومت کے لیے بیرونی قرضے معاف کرانے کا ایک سنہری موقع تھا

* جنرل محمود ان دنوں واشنگٹن میں تھے۔

[1] باب وڈ ورڈ ''بش ایٹ وار'' (اُردو ترجمہ فیکٹ پبلی کیشنز لاہور) صفحہ 69-73

جسے ضائع کر دیا گیا۔

مشرف کے فیصلے نے پاکستان کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر دور رس اثرات مرتب کیئے۔

پاکستان کے عوام کا تاثر یہ ہے کہ پاکستان نے امریکی مفادات کے لئے غیر معمولی کردار ادا کیا مگر پاکستان ان خدمات کے عوض امریکہ سے قابلِ ذکر امداد حاصل کرنے سے قاصر رہا۔ پاکستان کی معیشت آج بھی بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

5 نومبر 2002 کو روزنامہ نیوز میں اکرم ہوتی کی ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں سرکاری ذرائع کے حوالے سے انکشاف کیا گیا کہ پاکستان میں فوجی حکومت کے تین سالوں کے دوران 35000 کاروباری اور تجارتی ادارے بند ہوئے۔

12 جنوری 2002 کو جنرل مشرف نے سخت اقدام اُٹھاتے ہوئے پانچ معروف جہادی گروپوں پر پابندی عائد کردی۔ ان کا یہ اقدام پاکستان کی روایتی خارجہ پالیسی سے انحراف تھا جو 1979 میں روسی افواج کی افغانستان میں آمد کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔ نائین الیون کے واقعات کے بعد عالمی حالات تبدیل ہوگئے تھے۔ مشرف نئے حالات کے پیشِ نظر پاکستان میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے کارروائیاں کررہے تھے۔ انہوں نے وزیرستان (وانا) میں فوجی آپریشن کر کے 700 دہشت گردوں کو گرفتار کیا جو غیر ملکی تھے۔ مشرف پر دو قاتلانہ حملے ہوئے جن میں وہ معجزانہ طور پر بچ سکے۔ ان حملوں کے باوجود مشرف نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ عالمی طاقتوں نے مشرف کو کھل کر خراجِ تحسین پیش کیا البتہ مشرف پاکستان کو اسلحہ سے پاک بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ [12]

پاکستان کے فوجی حکمران اپنے دورِ اقتدار میں فوجی افسروں کو نوازتے رہے ہیں، ان نوازشات کا مقصد فوج کو مطمئن رکھنا ہوتا ہے۔ مشرف کے دور میں ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجی افسروں کو بڑی تعداد میں سول محکموں اور کارپوریشنوں میں کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس ضمن میں مشرف نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جنرل مشرف سمیت ایک سو فوجی افسروں کو بہاولپور میں ''سرحدوں کے دفاع'' کے نام پر معمولی قیمت پر اراضی الاٹ کی گئی۔ ان افسروں میں میجر، لیفٹیننٹ کرنل، بریگیڈیئر، میجر جنرل، لیفٹیننٹ جنرل اور جنرل شامل تھے۔ اراضی کی قیمت 380 روپے فی ایکڑ کے حساب سے وصول کی گئی۔ [13]

نومبر 2003 میں این آر بی کے تعاون سے ایک این جی او (Community CIET Information Empowerment and Training) نے ایک سروے جاری کیا جو پاکستان کی تاریخ کا پہلا سروے تھا۔ اس سروے کے دوران پاکستان کے 97 ضلعوں میں 57000 خاندانوں سے رابطہ کر کے اُن سے حکومت کے مختلف شعبوں کی کارکردگی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اس سروے کے

[12] پرویز اقبال چیمہ "The Armed Forces of Pakistan" صفحہ 156

[13] ڈیلی ٹائمز 26 اگست 2002، حوالہ ساؤتھ ایشیا ٹریبیون

مطابق 75 فیصد افراد نے حکومت کی کارکردگی کو مایوس کن قرار دیا۔ [14] اس سروے کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرف حکومت نے حکومتی کارکردگی پر تنقید کرنے کی کھلی اجازت دی۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو جس قدر آزادی مشرف دور میں ملی وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک نیا ریکارڈ ہے۔

مشرف نے جنوری 2004 میں سینٹ، قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ 658 منتخب اراکین نے صدر مشرف پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ 175 اراکین نے ووٹ کا حق استعمال نہ کیا جبکہ 336 اراکین رائے شماری کے وقت غیر حاضر رہے۔ حکومتی جماعت نے اسے جمہوریت کی فتح قرار دیا جبکہ اپوزیشن کے مطابق مشرف نے آئین میں دیئے گئے طریق کار سے انحراف کیا اور صدارتی انتخاب لڑنے کی بجائے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا۔ [15]

فوج کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اسے حکومت میں مداخلت کا آئینی کردار مل جائے۔ ضیاء الحق نے آٹھویں ترمیم کے تحت نیشنل سیکیورٹی کونسل کا ادارہ بنانے کی کوشش کی مگر غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والی اسمبلی نے ضیاء کی اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ مشرف 2004 میں ایکٹ آف پارلیمنٹ کے تحت نیشنل سیکیورٹی کونسل کو ایک قانونی ادارہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والی اسمبلی نے این ایس سی ایکٹ کو منظور کرلیا۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے اراکین میں صدر، وزیراعظم، چیئرمین سینٹ، سپیکر قومی اسمبلی، آرمی چیف، چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی، فضائیہ اور بحریہ کے سروس چیفس، قائد حزب اختلاف اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ شامل ہیں۔ مشرف اور ان کے رفقاء کے خیال میں فوج کی مداخلت کو روکنے کے لئے نیشنل سیکیورٹی کونسل کا ادارہ ضروری ہے۔ اپوزیشن کا خیال ہے کہ سیکیورٹی کونسل نے پارلیمنٹ کی بالادستی کو ختم کر دیا ہے۔ مشرف کی رائے میں قومی پالیسیوں کے لیے مشاورت ضروری ہے اور سنجیدہ مشاورت کے لیے نیشنل سیکیورٹی کونسل انتہائی موزوں ادارہ ہے۔ [16]

جون 2004 میں مشرف نے اپنے ایک انٹرویو میں کرپشن کے بارے میں کہا کہ اعلیٰ سطح پر کرپشن پر قابو پالیا گیا ہے۔ سابقہ دور میں اربوں روپے کی کرپشن کی گئی۔ پاکستان کے بینک، بڑے قومی ادارے پی آئی اے، سٹیل ملز دیوالیہ ہوگئے کیونکہ اوپر کی سطح پر اداروں کو لوٹا گیا۔ ہم نے اس کرپشن پر قابو پالیا ہے جو ہمارا بڑا کارنامہ ہے البتہ مختلف وجوہات کی بناء پر نچلی سطح پر کرپشن موجود ہے۔ [17]

ظفر اللہ جمالی صدر پرویز مشرف کو اپنا باس قرار دیتے رہے۔ صدر اور وزیراعظم کے تعلقات بھی خوشگوار تھے مگر اگست 2004 میں جمالی وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگ (ق) کے

[14] مبشر حسن — دی نیشن 14 نومبر 2003

[15] دی نیوز — 2 جنوری 2004

[16] سٹیفن کوہن — "The Idea of Pakistan" صفحہ 159

[17] جنرل پرویز مشرف — انٹرویو ڈیلی ٹائمز — 21 جون 2004

صدر چوہدری شجاعت حسین عبوری مدت کے لیے پاکستان کے وزیراعظم منتخب ہوئے ان کے بعد ایک ٹیکنو کریٹ شوکت عزیز غیر متوقع طور پر وزیراعظم بن گئے۔ صدر کا تعلق فوج سے ہے جبکہ شوکت عزیز بھی غیر سیاسی ہیں، یہ صورت حال سیاست دانوں کی کمزوری اور ناکامی کی بڑی دلیل ہے۔ مشرف اپنے اتحادی گروپوں کو مطمئن کرنے کے لیے پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی کابینہ بنانے پر آمادہ ہوگئے۔ وفاقی وزراء، وزرائے مملکت، مشیروں اور وفاقی وزیر کا درجہ حاصل کرنے والوں کی کل تعداد ستّر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو کابینہ تشکیل دی گئی اس میں وزراء کی تعداد صرف دس تھی۔ [18] پاکستان کے چالیس فیصد افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں۔ ان کو ایک وقت کی روٹی اور پینے کے لیے صاف پانی میسر نہیں ہے۔ پاکستان کے کروڑوں عوام تعلیم اور صحت کی سہولتوں سے محروم ہیں۔ ان حالات میں حکومت غیر ضروری منصوبوں پر قومی وسائل ضائع کررہی ہے۔ اسلام آباد میں امیروں کے لیے جدید پارک تعمیر کرنے کے لیے 1.2 بلین روپے اور یادگار کی تعمیر پر 500 ملین روپے، لاہور میں گیٹ وے کی تعمیر کے لئے 450 ملین روپے صرف کیے جارہے ہیں۔ [19] ملک میں غربت اور افلاس کی بناء پر خودکشیوں میں تشویش ناک حدتک اضافہ ہوا ہے۔

وفاقی حکومت کے وزیر مملکت برائے پارلیمانی اُمور رضا حیات ہراج نے اعتراف کیا کہ انہوں نے 62 وزراء اور 130 اراکین پارلیمنٹ کی قومی اسمبلی میں حاضری کی رپورٹ ڈی جی آئی ایس آئی، ڈی جی ایم آئی اور جی ایچ کیو کو روانہ کی حالانکہ انہیں یہ رپورٹ وزیراعظم کے سیکرٹریٹ کو ارسال کرنی چاہیے تھی۔ [20] رضا ہراج کے اعتراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی سیاست اور جمہوری اداروں میں فوج کا اثر و رسوخ افسوسناک حدتک بڑھ چکا ہے۔ منتخب پارلیمنٹ عملی طور پر ایک ربڑ سٹیمپ بن چکی ہے۔

جب مشرف نے 1999 میں اقتدار سنبھالا اس وقت پاکستانی معیشت کی حالت دگرگوں تھی۔ تقریباً 80 فیصد بجٹ دفاعی اخراجات اور قرضوں کی ادائیگی پر صرف ہورہا تھا۔ برآمدات کی رفتار سست تھی شرح نمو (growth rate) 3 فیصد تھا۔ مشرف نے معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انقلابی تبدیلیاں کیں۔ نائن الیون کے بعد پاکستان کو قرضوں کی ادائیگی کے لیے سہولیات ملیں۔ پاکستان کے بیرونی قرضے معاف اور ری شیڈول کیۓ گئے۔ بیرونی ملکوں میں مقیم پاکستانیوں نے زرمبادلہ پاکستان ارسال کیا۔ حکومت نے معیشت پر خصوصی توجہ دی اور زرمبادلہ کے ذخائر بارہ بلین ڈالر تک پہنچ گئے۔ آئی ایم ایف، اے ڈی بی اور ورلڈ بینک کی رپورٹوں کے مطابق زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ حکومت پاکستان کی معاشی پالیسیوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ [21] حکومت پاکستان کی معاشی پالیسی کی وجہ سے شرح نمو (growth rate) میں نمایاں اضافہ

---

[18] اصغر خان "ہم نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا" صفحہ 256

[19] اصغر خان "ہم نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا" صفحہ 256

[20] دی نیوز 9 جولائی 2005

[21] ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی "Economic Growth Myth or Reality" صفحہ xv

ہوا اور دیگر معاشی اشاریوں میں بھی بہتری آئی مگر حکومت غربت اور بے روزگاری میں اضافے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکی اور عوام کے معیار زندگی میں قابل ذکر تبدیلی نہ آئی۔ مشرف دور میں اربوں روپے کی 40 بلٹ پروف مرسڈیز بینز کاریں خریدی گئیں۔ حکومت پاکستان کے پاس کل 75 مرسڈیز کاریں ہیں جو صدر، وزیراعظم اور دوسرے وی آئی پیز کے استعمال میں ہیں۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے ذاتی استعمال کیلئے 2 وی وی آئی پی بزنس جیٹ طیارے خریدے۔

ماضی کی طرح مشرف دور میں بھی سول ملٹری ملازمین، اراکین اسمبلی، وزیروں، مشیروں اور ججوں کی تنخواہوں اور مراعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ مشرف نے ایک آرڈی نینس جاری کر کے صدر پاکستان کی تنخواہ 23000 ہزار روپے ماہانہ سے 57000 روپے ماہانہ کردی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صدر کو تنخواہ کا 85 فیصد پنشن ملے گی۔ جبکہ صدر کو صرف دس ہزار روپے پنشن ملتی تھی۔ مشرف نے ریٹائرڈ صدر کو تاحیات فری سرکاری رہائش یا 50 ہزار روپے ماہانہ رینٹ الاؤنس، 20 ہزار روپے کار الاؤنس اور بجلی، گیس، فون اور پانی کی سہولت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ [22]

مشرف کو شمالی وزیرستان میں ملٹری آپریشن کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔ یہ ان کا دلیرانہ اقدام تھا جس کے نتیجے میں ان کی زندگی پر دو حملے ہوئے مگر وہ ثابت قدم رہے اور شمالی وزیرستان کو دہشت گردوں سے کافی حدتک پاک کردیا۔ اس تاریخی کارنامے کی بناء پر مشرف عالمی طاقتوں کے محبوب لیڈر بن گئے۔

مشرف کو قیامت خیز زلزلہ کے حوالے سے بھی یاد رکھا جائے گا۔ اس قدرتی آفت میں ایک لاکھ افراد ہلاک، 80 ہزار زخمی اور چالیس لاکھ بے گھر ہوگئے۔ زلزلے کی شدت اور وسعت کی وجہ سے پاک فوج کی امدادی سرگرمیوں میں تاخیر ہوئی۔ البتہ بعد میں پاک فوج کے جوانوں نے دور دراز علاقوں میں ریلیف کا سامان فراہم کرکے اور زخمیوں کو ہسپتالوں میں پہنچا کر یادگار خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے عوام نے بے مثال جذبے کا مظاہرہ کیا۔ ان حالات میں اگر کوئی جمہوری سیاسی لیڈر حکومت کا سربراہ ہوتا تو عالمی سطح پر بہترین ڈپلومیسی کا مظاہرہ کرکے بیرونی قرضے معاف کرانے اور پاکستان کے عوام کو غربت سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوجاتا۔ دنیا کے تمام بڑے ممالک، اقوام متحدہ اور عالمی مالیاتی اداروں نے انسانی بنیادوں پر زلزلہ کے متاثرین کے ریلیف اور بحالی کے لیے خصوصی دلچسپی لی مگر حکومت اعلیٰ سفارت کاری کا مظاہرہ کرکے نقصان کے مطابق مالی امداد حاصل کرنے میں ناکام رہی اور مزید قرضے حاصل کرلیے۔

حکمران کی موجودگی میں اس کے دور کے بارے میں تجزیہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تجزیہ نگاروں کو مکمل معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔ حکمران کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد ہی حقائق منظر عام پر آتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق ایک بنیاد پرست جرنیل تھے۔ انہوں نے اسلامی جذبے اور امریکی ضرورت کے تحت مجاہد تیار

---

[22] ڈان 28 فروری 2002

کیے۔ جنرل مشرف روشن خیال ماڈرن جرنیل ہیں۔ انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد کتوں کے ساتھ تصویر بنوا کر اور اتاترک کو اپنا آئیڈیل قرار دے کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت پیش کیا۔ نائن الیون کے بعد امریکی ضرورتوں کے پیش نظر مجاہدین کو ختم کرنے کے لیے فوجی طاقت کو استعمال کیا اور روشن خیالی کو اپنا سیاسی فلسفہ قرار دیا جسے وہ قومی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

جلا وطن جمہوری سیاسی رہنماؤں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے لندن میں میثاق جمہوریت (Charter of Democracy) پر دستخط کیے جس میں فوج کی سیاست میں مداخلت ختم کرنے، جمہوری کلچر کو پروان چڑھانے، عدلیہ کے ججوں کی نامزدگی، صاف شفاف انتخابات اور عوامی مینڈیٹ کے احترام کے لیے ضابطۂ اخلاق پر اتفاق کیا گیا۔ پاکستان کے سیاسی، صحافتی اور وکلا کے حلقوں میں میثاق جمہوریت کا خیر مقدم ہوا البتہ صدر پرویز مشرف کے حامیوں نے اس پر تنقید کی اور تحفظات کا اظہار کیا۔

باب 12

عدلیہ کے تاریخی آئینی فیصلے

مولوی تمیز الدین خان کیس (1955)

24 اکتوبر 1954 کو گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو برطرف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اس اقدام سے پارلیمانی افراتفری کو ختم کر دیا ہے۔ [1] مولوی تمیز الدین دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے، وہ ایک شریف، دیانت دار اور بااُصول شخص تھے۔ انہوں نے گورنر جنرل کے فیصلے کو سندھ چیف کورٹ میں چیلنج کر دیا اور مؤقف اختیار کیا کہ گورنر جنرل کا یہ اقدام غیر آئینی اور غیر قانونی ہے اور انہیں دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ مولوی تمیز الدین نے نئی وفاقی کابینہ کے وزراء کو بھی فریق بنایا اور عدلیہ سے استدعا کی کہ گورنر جنرل کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے اور کابینہ کو کام کرنے سے روک دیا جائے کیونکہ گورنر جنرل ایسے افراد کو وزیر نامزد نہیں کر سکتا جو اسمبلی کے رکن نہ ہوں۔

سندھ چیف کورٹ کے فل بنچ نے اتفاقِ رائے سے مولوی تمیز الدین کی اپیل کے حق میں فیصلہ دیا۔ [2] چیف کورٹ نے وفاقی حکومت کے اس اعتراض کو مسترد کر دیا جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا چونکہ گورنر جنرل نے انڈیا ایکٹ 1935ء کے سیکشن 223/A کی توثیق نہیں کی تھی لہٰذا سندھ کورٹ کو سماعت کا اختیار نہیں ہے۔ سیکشن 223/A کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اس لیے سندھ کورٹ کو اس سیکشن کی روشنی میں رٹ کی سماعت کے جو اختیارات دیئے گئے ہیں انہیں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ کورٹ نے قرار دیا کہ دستور ساز اسمبلی کو قانون سازی کرنے، آئین بنانے اور قوانین میں ترامیم کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے اور قوانین کے لیے گورنر جنرل کی منظوری ضروری نہیں ہے۔ دستور ساز اسمبلی کو آئین سازی کے مخصوص کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا لہٰذا جب تک وہ اپنی ذمہ داری پورا نہ کر لے اسے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔

وفاقی حکومت نے سندھ کورٹ کے فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل کی۔ فیڈرل کورٹ کے

[1] Wilcox "The Consolidation of a Nation" صفحہ 179

[2] مولوی تمیز الدین خان بنام فیڈریشن آف پاکستان پی ایل ڈی 1955 سندھ صفحہ 96

پانچ میں سے چار ججوں جسٹس منیر، جسٹس ایس اے رحمٰن، جسٹس محمد شریف اور جسٹس ایس اے ایم اکرم نے سندھ کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا اور کہا کہ سندھ کورٹ نے جس سیکشن 233/A کے تحت فیصلہ دیا ہے اس کی توثیق گورنر جنرل نے نہیں کی تھی لہٰذا وہ ابھی قانون کا درجہ حاصل نہیں کر سکا چنانچہ اس سیکشن کے تحت سندھ کورٹ کو گورنر جنرل کے فیصلوں کے خلاف سماعت کا اختیار نہیں ہے۔ فیڈرل کورٹ بنچ کے جسٹس اے آر کارنیلیس نے اپنے برادر ججوں سے اختلاف کرتے ہوئے اختلافی نوٹ لکھا اور تحریر کیا کہ دستور ساز اسمبلی کی آئینی نوعیت کی ترامیم کے لیے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت نہیں تھی۔

فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر نے گورنر جنرل کے فیصلے کو آئینی قرار دے کر ایک افسوسناک بلکہ شرمناک روایت قائم کی اور مستقبل کے حکمرانوں کے لیے اپنی خواہش پر اسمبلی توڑنے کا دروازہ کھول دیا۔ اس فیصلے سے آئینی بحران پیدا ہو گیا جس پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔ جسٹس منیر نے اپنی برادری (ککے زئی) سے تعلق رکھنے والے گورنر جنرل غلام محمد کا ساتھ دیا اور آئین اور قانون کی روح کے برعکس فیصلہ دیا۔ جسٹس منیر اپنی ساری زندگی کے دوران اپنے اس فیصلے کے بارے میں معذرت خواہانہ اور مدافعانہ رویہ اختیار کرتے رہے۔ [3]

جسٹس منیر کے فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عدلیہ کا فرض ہے کہ وہ ہر اس اقدام پر اپنی مہر ثبت کرے جو ڈی فیکٹو (de facto) نوعیت کا ہو مگر وہ وقت پر رائج رہنے کے لیے ہو۔ ہر چند کہ وہ اقدام غیر آئینی، غیر قانونی، غیر ضروری اور غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ جسٹس منیر کے اس فیصلے نے عدلیہ کی کارکردگی کو متاثر کیا۔ [4] جسٹس منیر نے 64 صفحات پر مشتمل فیصلہ تحریر کیا مگر اس میں گورنر جنرل کے اسمبلی کو برطرف کرنے کے اختیار پر اپنی رائے نہیں دی اور محض ٹیکنیکل بنیاد پر چیف کورٹ سندھ کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا۔ [5]

دوسو کیس (1958)

صدر سکندر مرزا نے آئین کو منسوخ کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا اور ملک پر مارشل لاء نافذ کر کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نامزد کر دیا۔ سپریم کورٹ نے ایک بار پھر چیف جسٹس منیر کی سربراہی میں سکندر مرزا کے اقدام کو جائز قرار دے دیا۔ [6] سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کی بنیاد ہینس کیلسن کی تھیوری (Hans Kelsen's General Theory of Law and State) پر رکھی۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ جب انقلاب کامیاب ہو جائے تو وہ ریاست کا بنیادی قانون

[3] چوہدری نذیر حسین "Life and Judgements of Justice Munir" صفحہ 21

[4] جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی غیر مطبوعہ تحقیقی پیپر "Role of Judiciary in Constitutional Crisis" جو مصنف کو دیا گیا

[5] حامد خان "Constitutional History of Pakistan" صفحہ 143

[6] سٹیٹ بنام دوسو پی ایل ڈی سپریم کورٹ 1958 صفحہ 533

بن جاتا ہے۔ اس تھیوری نے مولوی تمیز الدین کیس کے فیصلے سے بھی زیادہ آئین کی بنیادوں کو نقصان پہنچایا۔ قانونی اور آئینی سوال قانون کے ماہرین کے سامنے علمی مباحثے کے لیے نہیں رکھا گیا تھا۔

سپریم کورٹ کے ججوں نے 1956 کے آئین کے مطابق فیصلہ دینا تھا جس کی حفاظت کا انہوں نے حلف اُٹھایا ہوا تھا۔ لہٰذا وہ آئین کی رٹ کے بارے میں فیصلہ دینے کے مجاز نہ تھے۔ ان کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ پہلے وہ اپنے منصب سے مستعفی ہوتے اور نئے آرڈر کے مطابق جج نامزد ہو کر 1956 کے آئین کے مؤثر یا مؤثر نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ دیتے۔ انہوں نے چونکہ آئین کے تحفظ کی قسم کھا رکھی تھی لہٰذا وہ اس آئین کو منسوخ یا کالعدم قرار نہیں دے سکتے تھے۔ [7]

صدر کو آئین منسوخ کرنے کا اختیار نہیں تھا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صدر کو فارغ کر کے چیف ایگزیکٹو نہیں بن سکتا تھا۔ اگر کوئی فرد یا گروپ طاقت استعمال کر کے اقتدار پر قبضہ کر لے تو ان کا یہ عمل انقلاب نہیں بغاوت کہلائے گا۔ انقلاب کے لیے عوام کی تائید اور حمایت ضروری ہوتی ہے جیسا کہ فرانس، روس اور چین کے انقلاب کو حاصل تھی۔ دوسو کیس کے فیصلے نے انتہائی مکروہ روایت قائم کی۔ چیف جسٹس کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر عملدرآمد کرائے۔ اس کا کام جائز اور ناجائز، قانونی یا غیر قانونی کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس بنیاد پر غلط فیصلہ نہیں دیا جا سکتا کہ درست فیصلہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جج کا فرض ہے کہ وہ ہر صورت میں صرف اور صرف قانون کے مطابق فیصلہ دے اور اس پر عمل کرنے کا کام ریاست اور حکمرانوں پر چھوڑ دے۔

عاصمہ جیلانی کیس (1972)

معروف سیاست دان ملک غلام جیلانی اور ڈان کے ایڈیٹر انچیف کی نظر بندی کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ سماعت کے دوران سٹیٹ بنام دوسو کیس اور جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے بارے میں قانونی سوالات زیرِ بحث آئے۔ پاکستان کی تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جنرل یحییٰ کے اڑھائی سالہ غیر آئینی دور اقتدار کے دوران کسی نے عدلیہ میں اس کے اقتدار کو چیلنج نہ کیا اور عدلیہ کے جج جنہوں نے آئین کے دفاع اور تحفظ کا حلف اُٹھا رکھا تھا خاموش رہے اور سوؤ موٹو (suo moto) نوٹس نہ لیا۔ جنرل یحییٰ کو غاصب حکمران اس وقت قرار دیا گیا جب وہ اقتدار میں نہیں تھے۔

سپریم کورٹ نے سٹیٹ بنام دوسو کیس کے فیصلے اور کیلسن کے نظریے کو مسترد کر دیا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں فل بینچ نے فیصلہ دیا کہ 1962ء کے آئین کے مطابق صدر ایوب کو اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ صدر ایوب کو آئین کے مطابق اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے سپرد کرنا چاہیئے تھے لہٰذا جنرل یحییٰ خان غاصب تھے ان کا دورِ حکومت غیر آئینی تھا ان

[7] جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی غیر مطبوعہ تحقیقی پیپر "Role of Judiciary in Constitutional Crisis" جو مصنف کو دیا گیا

کے تمام اقدامات اور احکامات غیر آئینی تھے۔ البتہ سپریم کورٹ نے ریاست کے مفاد میں یحیٰی خان کے فیصلوں کو درست قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کو مسترد کر دیا۔ سپریم کورٹ کے جج 1962 کے آئین کی رو سے جج تھے جس کے تحفظ کا انہوں نے حلف اُٹھا رکھا تھا۔ جج جنرل یحیٰی خان کے مارشل لا آرڈر (The Laws Continuance In Force) کے پابند نہیں تھے لہٰذا اس آرڈر کے بعد ججوں کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے حلف کے مطابق آئین کا دفاع اور تحفظ کرنے سے قاصر رہے تھے۔

خان عبدالولی خان کیس (1976)

بھٹو حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) پر ملک دشمنی اور غداری کے الزامات لگا کر پابندی عائد کر دی اور اسے سیاسی سرگرمیوں سے روک دیا۔ پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ چیف جسٹس حمود الرحمٰن اور بینچ کے دوسرے ججوں نے حکومت کے ان الزامات کو درست اور جائز قرار دیا کہ نیپ پاکستان کو توڑنے اور پختونستان قائم کرنے کی سازش کر رہی تھی۔ سپریم کورٹ نے نیپ پر پابندی کے حکومتی فیصلہ کو بحال رکھا۔ خان عبدالولی خان نے مؤقف اختیار کیا کہ پختونستان کے مطالبے کو آئین میں دی گئی صوبائی خودمختاری اور قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی روشنی میں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔

نصرت بھٹو کیس (1977)

جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977 کو بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا اور بھٹو سمیت کئی سیاست دانوں کو نظر بند کر دیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی رہنماؤں کی نظر بندی کے خلاف اپیل دائر کی۔ اس مقدمے میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بارے میں آئینی سوالات زیر بحث آئے۔ بھٹو کے وکیل یحیٰی بختیار کا مؤقف یہ تھا کہ 1973ء کے آئین کے تحت جنرل ضیاء الحق کو مارشل لاء نافذ کرنے کا اختیار نہیں تھا اور ان کا اقدام آئین کے آرٹیکل نمبر 6 کی خلاف ورزی ہے۔ 5 جولائی کو پی پی پی اور پی این اے کی جماعتوں کے درمیان معاہدہ طے پا چکا تھا اور ملکی حالات غیر معمولی نہیں تھے کہ مارشل لاء کا جواز بنتا۔ سپریم کورٹ میں ایک تحریری بیان داخل کیا گیا جس میں عدالت کو مطلع کیا گیا کہ ضیاء الحق نے بیرونی سازش کے پیشِ نظر منتخب جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹا۔ یحیٰی بختیار نے عاصمہ جیلانی کیس کو دفاع کے طور پر پیش کیا۔ نصرت بھٹو کیس کی سماعت چیف جسٹس انوار الحق کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے فل بنچ نے کی۔

فیڈریشن کے وکلاء اے کے بروہی اور شریف الدین پیرزادہ نے مؤقف اختیار کیا کہ چونکہ 1977 کے انتخابات میں منصوبہ بندی کے تحت وسیع پیمانے پر دھاندلی ہوئی لہٰذا بھٹو حکومت آئینی جواز کھو

بیٹھی تھی۔ دھاندلی کے نتیجے میں ملک گیر تحریک چلائی گئی اور پاکستان سول وار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا لہٰذا ریاست کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے افواج پاکستان کا اقدام قومی ضرورت تھا۔ آئین کو توڑا نہیں گیا بلکہ عارضی طور پر اس پر عملدرآمد روک دیا گیا ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حالات نارمل ہوتے ہی انتخابات کرا دیں گے۔

سپریم کورٹ کے سامنے دوسو کیس اور عاصمہ جیلانی کیس کے عدالتی فیصلے موجود تھے۔ چیف جسٹس نے فیصلہ دیا کہ ریاستی ضرورت کے تحت افواجِ پاکستان کا غیر آئینی اقدام جائز تھا اور عوام کی فلاح کے مطابق تھا۔ 1973ء کا آئین پاکستان کا سپریم لاء رہے گا۔ عدالتیں آئین کے مطابق کام کرتی رہیں گی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اقدامات اور فیصلے جائز اور قانونی تصور کیے جائیں گے۔ ایک رپورٹ کے مطابق چیف جسٹس انوار الحق نے فیصلہ لکھنے کے بعد دباؤ کے تحت "Including the power to amend it" اور (آئین) میں ترمیم کرنے کا اختیار ہوگا) کا جملہ فیصلے میں شامل کیا۔ [8]

صوبوں کی ہائی کورٹس کے چیف جسٹس ضیاء الحق کے مارشل لاء میں صوبائی گورنر بن گئے۔ سپریم کورٹ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے پر عملدرآمد کرانے میں ناکام رہی اور ضیاء الحق آئین کی تذلیل کرتے رہے۔ جسٹس (ر) ایم اے کے صمدانی عدلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> ''آئینی بحرانوں کے دوران عدلیہ کی کارکردگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند مستثنیات کے سوا عدلیہ کے جج سچ کو سچ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے قوم کے اعتماد کو پامال کیا اور اپنے حلف کی خلاف ورزی کی۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ عدلیہ کی ہیئت تبدیل ہو چکی ہے مگر ججوں کا رویہ تبدیل نہیں ہوا۔ انہوں نے عوام کو ہمیشہ تسلسل کے ساتھ مایوس کیا ہے''۔ [9]

ضیاء نے حلف کی عبارت تبدیل کر کے اس میں سے آئین کی وفاداری کا جملہ حذف کر دیا۔ اکثر ججوں نے ضیاء کی غیر آئینی تحریر کے مطابق نیا حلف اُٹھا لیا اور ضیاء نے آئین میں ترمیم کر کے عدلیہ سے مارشل لاء اقدامات اور فیصلوں پر نظر ثانی کے اختیارات بھی واپس لے لیے۔

خواجہ احمد طارق رحیم بنام فیڈریشن آف پاکستان (بے نظیر) (1988)

اگست 1990ء میں صدر غلام اسحٰق خان نے آئین کے آرٹیکل 58(2)(b) کے تحت بے نظیر حکومت کو ختم کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔ لاہور ہائی کورٹ نے صدر کے اس اقدام کو جائز قرار دیا۔

---

[8] حامد خان "Constitutional History of Pakistan" صفحہ 591
حوالہ جنرل (ر) کے ایم عارف "Working with Zia"

[9] جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی غیر مطبوعہ تحقیقی پیپر "Role of Judiciary in Constitutional Crisis" جو مصنف کو دیا گیا

لاہور ہائی کورٹ نے بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک، وفاق اور پنجاب کی محاذ آرائی، اسمبلیوں میں قانون سازی کے عمل کا فقدان، سندھ میں بدامنی، کونسل آف کامن انٹریسٹ تشکیل نہ دینا، این ایف سی ایوارڈ میں غیر معمولی تاخیر اور دیگر وجوہات کی بناء پر صدر کے اقدام کو آئین کے مطابق قرار دیا۔

سپریم کورٹ بنچ کے اکثریتی ججوں نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھا اور قرار دیا کہ صدر نے درست شواہد کی بناء پر فیصلہ کیا اور اگست 1990ء میں حالات اس قدر خراب اور کشیدہ ہو چکے تھے کہ آئین کے مطابق حکومت چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اسمبلی چونکہ حکومت کا اہم ادارہ ہے لہٰذا حکومت کے خاتمے کے ساتھ اسمبلی کا ٹوٹنا لازم ہوتا ہے۔ بے نظیر بھٹو اور پی پی پی نے چونکہ نئے انتخابات میں حصہ لیا لہٰذا پرانی اسمبلی کو بحال کرنا درست نہیں ہے۔ جسٹس عبدالشکور سلام نے اختلافی نوٹ میں تحریر کیا کہ ضیاء کی وفات کے بعد آئین کا آرٹیکل (b)(2)58 مؤثر نہیں رہا لہٰذا صدر کو حکومت اور اسمبلی کے خاتمے کا اختیار نہیں تھا۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے بھی اختلافی نوٹ تحریر کیا اور کہا کہ صدر کا اقدام بدنیتی پر مبنی تھا جس کا مقصد نہ صرف بے نظیر حکومت کا خاتمہ بلکہ پی پی پی کو عوام کی نظروں میں گرانا تھا۔

حاجی سیف اللہ خان کیس (جونیجو) (1989)

ضیاء نے (b)(2)58 کے تحت آئینی اختیارات استعمال کر کے اپنے نامزد کردہ وزیر اعظم جونیجو کی حکومت ختم کر کے قومی اسمبلی توڑ دی۔ سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے قرار دیا کہ صدر ضیاء کا اقدام جوڈیشل ریویو کا متقاضی تھا۔ جب ضیاء نے جونیجو حکومت کو ختم کیا اور اسمبلی کو توڑا اس وقت حالات اس نوعیت کے نہیں تھے کہ (b)(2)58 کو استعمال کیا جاتا۔ ضیاء نے یہ اختیار سیاسی عزائم کے لیے کیا۔ سپریم کورٹ نے ضیاء کے اقدام کو غیر آئینی قرار دیا، عدلیہ کا فیصلہ ضیاء کی وفات کے بعد آیا۔

پاکستان میں چونکہ 1988ء کے انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا لہٰذا سپریم کورٹ نے کابینہ اور اسمبلی بحال کرنے کا ریلیف دینے سے انکار کر دیا۔ سابق آرمی چیف مرزا اسلم بیگ نے اقرار کیا کہ انہوں نے چیف جسٹس کو اسمبلیاں بحال نہ کرنے کا پیغام بھیجا تھا تا کہ نئے انتخابات کا انعقاد ممکن ہو سکے۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ جونیجو کے بعد وزیر اعظم نامزد نہ کرنا بھی غیر آئینی اقدام تھا جس سے پارلیمانی نظام صدارتی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ اس آئین کا بنیادی اساسی ڈھانچہ ہی تبدیل کر دیا گیا۔

نواز شریف کیس (1993)

نواز شریف نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے صدر اسحٰق کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ صدر اسحٰق نے نواز شریف حکومت کو ختم کر کے قومی اسمبلی توڑ دی۔ اسحٰق نے نواز پر کرپشن اور ریاست کے سربراہ کے

وقار کو مجروح کرنے کے الزامات عائد کیئے اور کہا کہ ملک کو آئینی، سیاسی اور معاشی بحران سے نکالنے کے لیے آئین کے آرٹیکل (b)(2)58 کو بروئے کار لانا لازمی ہو گیا تھا۔ نواز شریف نے صدر کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کر دی۔ سپریم کورٹ کے گیارہ ججوں نے چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں اس پٹیشن کی سماعت کی۔ دس ججوں نے فیصلہ دیا کہ صدر کا اقدام آئین کے مطابق نہیں لہٰذا اسے کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ اس فیصلے کے مطابق نواز حکومت کو فوری طور پر بحال کر دیا گیا البتہ عدلیہ نے نگران حکومت کے فیصلوں کو جائز قرار دے دیا۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور صدر کے اقدام کو جائز قرار دیا جبکہ وہ بے نظیر کیس میں صدر کے اقدام کو غیر آئینی قرار دے چکے تھے۔ سپریم کورٹ کی نظر میں صدر اسحٰق کا اقدام منصفانہ نہیں تھا اور ایسی صورتحال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ حکومت کے خاتمے کا اقدام ملکی مفاد میں ضروری ہو گیا تھا۔ عدالتی تاریخ کا یہ پہلا فیصلہ تھا جو فوری طور پر سویلین صدر کی موجودگی میں سنایا گیا۔

یوسف رضا گیلانی کیس (بے نظیر) (1996)

1996 میں صدر لغاری نے بے نظیر کی حکومت کو کرپشن، بدامنی اور معاشی بدحالی کے الزامات لگا کر ختم کر دیا اور اسمبلیاں توڑ دیں۔ قومی اسمبلی کے سپیکر یوسف رضا گیلانی نے صدر کے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور مؤقف اختیار کیا کہ صدر نے آرٹیکل (b)(2)58 کے تحت جو اختیارات استعمال کیئے وہ بلا جواز تھے حکومت آئین کے مطابق کام کر رہی تھی۔ صدر نے اپنے آرڈر میں حکومت پر الزامات عائد کیے مگر قومی اسمبلی کو توڑنے کا کوئی جواز پیش نہ کیا۔ بے نظیر بھٹو نے بھی سپریم کورٹ میں صدر کے فیصلے کے خلاف پٹیشن دائر کی اور اپنے خلاف الزامات کا تفصیلی جواب دیا۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا رویہ بے نظیر کے بارے میں معاندانہ تھا۔ انہوں نے دو بار معمولی اعتراضات لگا کر بے نظیر کی پٹیشن واپس کر دی۔ ان کا مقصد تاخیری حربے اختیار کر کے پٹیشن کو غیر مؤثر بنانا تھا۔ [10] سپریم کورٹ کے سات میں سے چھ ججوں نے صدر کے اقدام کو جائز اور آئین کے مطابق قرار دیا۔ سپریم کورٹ کے مطابق ایسے معروضی حالات پیدا ہو گئے تھے کہ حکومت کا آئین کے مطابق چلنا ممکن نہیں رہا تھا اور صدر کے لیے آرٹیکل (b)(2)58 کے مطابق آئینی اختیار استعمال کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ جسٹس ضیاء محمود مرزا نے اختلافی نوٹ میں کہا کہ صدر کے پاس ایسا ٹھوس مواد اور دستاویزی شہادتیں موجود نہیں تھیں جن کی بناء پر ان کا اقدام جائز قرار دیا جا سکے۔

[10] حامد خان "Constitutional History of Pakistan" صفحہ 809

ظفر علی شاہ کیس (2000)

آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو مخصوص حالات میں اقتدار پر قبضہ کر کے نواز حکومت کو برطرف اور اسمبلیوں کو توڑ دیا۔ نواز شریف کے رفقاء نے سپریم کورٹ میں مختلف اپیلیں دائر کر کے جنرل مشرف کے اقدام کو غیر آئینی قرار دینے اور عدلیہ سے استدعا کی کہ مشرف کے اقدام کو کالعدم قرار دے کر نواز حکومت کو بحال کیا جائے۔ ان اپیلوں کے بعد افواہیں پھیلیں کہ سپریم کورٹ نواز حکومت کو بحال کر دے گی۔ مشرف حکومت نے بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ججوں سے نیا حلف لینے کے لیے آرڈر جاری کر دیا۔ نیا حلف اس لیے لیا گیا تاکہ ججوں پر آئین میں دیئے گئے حلف کی پاسداری لازمی نہ رہے۔ چیف ایگزیکٹو کے آرڈر میں درج تھا کہ جو جج نیا حلف نہیں اُٹھائے گا وہ ریٹائر تصور کیا جائے گا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی، جسٹس خلیل الرحمٰن، جسٹس ناصر اسلم زاہد، جسٹس مامون قاضی، جسٹس وجیہہ الدین احمد اور جسٹس کمال منصور عالم نے نیا حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا۔

سپریم کورٹ کے بارہ ججوں نے چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں اپیلوں کی سماعت کی اور جنرل مشرف کے اقتدار سنبھالنے کو جائز قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق 12 اکتوبر 1999 کو ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ ان کا کوئی آئینی حل موجود نہیں تھا لہٰذا افواجِ پاکستان کے لئے ماورائے آئین اقدام کر کے مداخلت کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ سپریم کورٹ نے ریاستی نظریہ ضرورت کے تحت مشرف کے اقدام کو قانونی اور جائز قرار دیا۔ مشرف حکومت کو تین سال کے اندر انتخابات کرانے کا پابند بنایا گیا اور فیصلہ دیا کہ چیف ایگزیکٹو آئین کے بنیادی ڈھانچے کو تبدیل نہیں کریں گے البتہ حکومت کو چلانے کے لیے آئین میں ترامیم کرنے کے مجاز ہوں گے۔ وفاقی حکومت نے آئین میں تبدیلی کا اختیار حاصل کرنے کے لیے استدعا نہیں کی تھی اور سپریم کورٹ نے از خود یہ اختیار چیف ایگزیکٹو کو دے دیا حالانکہ آئین میں ترمیم کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ سپریم کورٹ بھی آئین میں ترمیم نہیں کر سکتی لہٰذا وہ کسی فردِ واحد کو آئین میں ترمیم کا اختیار تفویض نہیں کر سکتی۔

قاضی حسین احمد کیس (2002)

جنرل پرویز مشرف نے صدر منتخب ہونے کے لیے ملک میں ریفرنڈم کرایا۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے ریفرنڈم کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں چیف ایگزیکٹو مشرف کے ریفرنڈم آرڈر کو درست قرار دیتے ہوئے کہا کہ ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کی روشنی میں چیف ایگزیکٹو کو ریفرنڈم آرڈر کو درست قرار دیتے ہوئے کہا کہ ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کی روشنی میں چیف ایگزیکٹو کو ریفرنڈم آرڈر جاری کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ سپریم کورٹ نے قاضی حسین احمد کی ایک اور

آئینی درخواست کو مسترد کر دیا اور فیصلہ دیا کہ جنرل پرویز مشرف کا صدر رفیق تارڑ کو صدارت کے منصب سے برطرف کرنے کا اقدام درست تھا۔

لیگل فریم ورک آرڈر کیس (2002)

وطن پارٹی کی جانب سے ایل ایف او کے خلاف ایک آئینی درخواست سپریم کورٹ میں دائر کی گئی۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ ریاض کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے بینچ نے فیصلہ دیا کہ کسی بڑی سیاسی جماعت نے ایل ایف او کے ذریعے آئین میں ترامیم کو چیلنج نہیں کیا۔ منتخب پارلیمنٹ ہی آئینی ترامیم پر غور کرنے کا مناسب فورم ہے اور پارلیمنٹ کی موجودگی میں عدلیہ کا ایل ایف او پر رائے دینا مناسب نہیں۔

سترھویں ترمیم کیس (2005)

چیف جسٹس ناظم حسین صدیقی کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے فل بینچ نے پاکستان لائرز فورم اور دوسری اپیلوں کو مسترد کر دیا جن میں سترھویں آئینی ترمیم کو چیلنج کیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کا مینڈیٹ حاصل ہے۔ کورٹ آئین اور قانون کی تشریح کرتی ہے اور حکومتی فیصلوں کا آئین کی روشنی میں جائزہ لیتی ہے مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ کوئی اقدام اچھا ہے یا برا یہ پارلیمنٹ کا کام ہے۔

عدلیہ کے تاریخی آئینی فیصلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدلیہ کے فیصلے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہے اور عدلیہ نے آمر کی موجودگی میں کبھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں سنایا جس میں آمر کے کسی اقدام کو غیر آئینی قرار دیا گیا ہو۔ سپریم کورٹ نے جنرل یحییٰ خان کو اس وقت غاصب قرار دیا جب وہ سقوط ڈھاکہ کے بعد اقتدار سے محروم ہوگئے اور ضیاء الحق کی وفات کے بعد ان کے جونیجو حکومت کے خاتمے کے اقدام کو غیر آئینی قرار دیا۔ جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی عدلیہ کے آئینی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "It will be demonstrated that most of the confusion that has arisen in the country as a result of which the institution of democracy has suffered almost irreparably, stemmed from the fact that by and large the judiciary in Pakistan tried in times of crisis to avoid confrontation with the executive and went out of its way to take to the path of least resistance. It upheld the de facto situation rather than declare the de jure position"[11]

ترجمہ: ’’یہ ثابت ہوگا کہ ملک میں جو کنفیوژن پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں جمہوری ادارے کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس کے ڈانڈے اس حقیقت سے جڑتے ہیں کہ پاکستان کی عدلیہ

نے اکثر اوقات بحران کے وقت میں انتظامیہ سے محاذ آرائی کرنے سے گریز کیا۔ عدلیہ اپنے راستے سے دور نکل گئی اور اس نے کم سے کم مزاحمت بھی نہ کی۔ اس نے قانونی پوزیشن کا برملا اظہار کرنے کی بجائے غیر قانونی صورتِ حال کو برقرار رکھنے کا فیصلہ دیا۔'' [11]

ماہرین قانون کی نظر میں عدلیہ دو وجوہات کی بناء پر انتظامیہ کی تابع فرمان بنی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں منتخب یا غیر منتخب حکومتیں غیر جمہوری انداز اور رویے اختیار کرتی رہیں۔ حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے عدلیہ کی آزادی سلب کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عدلیہ کے جج بھی اپنی کمزوریوں اور ذاتی خواہشات کی بناء پر سیاسی گیم میں کٹھ پتلی بنتے رہے۔

جج جب ایک بار آئین کے تحفظ کا حلف اُٹھالے تو پھر اسے آئین سے ماورا حلف اُٹھانے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ جنوری 2000 میں جب جنرل پرویز مشرف نے ججوں کو پی سی او کے تحت حلف اُٹھانے کا آرڈر جاری کیا تو 102 ججوں میں سے 89 ججوں نے نیا حلف اُٹھالیا۔ اگر جج حلف اُٹھانے سے انکار کر دیتے تو سیاسی اور آئینی صورت حال مختلف ہوتی۔ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی کہتے ہیں کہ ''اُنہوں نے پی سی او کے تحت حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا کیونکہ جنرل مشرف نے اکتوبر 1999 میں اقتدار سنبھالنے کے بعد میری رہائش گاہ پر ملاقات کی تھی اور یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ عدلیہ میں مداخلت نہیں کریں گے اور جج آئین کے مطابق فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اس ملاقات کے دوران میں نے انہیں بتادیا کہ عدلیہ انہیں آئین میں ترمیم کا اختیار نہیں دے گی کیونکہ یہ اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے اور فردِ واحد کو آئین میں ترمیم کا اختیار نہیں دیا جاسکتا۔'' [12]

ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کے بعد سپریم کورٹ بار نے بے مثال قرار داد منظور کر کے فیصلہ کیا کہ وکلا کوئی آئینی اپیل عدلیہ میں دائر نہیں کریں گے۔ یہ قرار داد ایک لحاظ سے وکلا برادری کا بینچ پر عدم اعتماد کا اظہار تھا۔ عدلیہ میں خرابی اس وقت شروع ہوئی جب 1954 میں چیف جسٹس پاکستان سر عبدالرشید ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ سینئر ترین جسٹس اکرم (ڈھاکہ) کو تعینات کرنے کی بجائے چیف کورٹ لاہور کے جسٹس منیر کو چیف جسٹس پاکستان بنایا گیا عدلیہ کے ججوں نے اس ناانصافی کو خاموشی سے قبول کر لیا۔ بھارت میں ایسی ہی صورت حال میں جب نہرو نے ممبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس چاگلہ کو بھارت کا چیف جسٹس نامزد کرنے کی کوشش کی تو دوسرے ججوں نے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی۔

[11] جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی غیر مطبوعہ تحقیقی پیپر "Role of Judiciary in Constitutional Crisis" جو مصنف کو دیا گیا

[12] انٹرویو جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی ہیرالڈ جولائی 2006

باب 13

دفاعی بجٹ 2005-1947

قیام پاکستان کے بعد سیاست دان اور سول ملٹری بیوروکریٹس متفق تھے کہ پاکستان کی آزادی اور سلامتی بھارت کی جانب سے خطرے میں رہے گی۔ لہٰذا پاکستان کے دفاع کو مضبوط اور مستحکم بنانا حکومت کی پہلی ترجیح ہونی چاہیئے۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں دفاعی بجٹ پر خصوصی توجہ دی گئی۔ افغانستان کا رویہ بھی معاندانہ تھا اور کشمیر کے تنازعے نے دفاعی اہمیت کو مزید اجاگر کیا۔ 1953 میں قومی اسمبلی میں افواج میں کمی کی تجاویز پیش ہوئیں تو حکومت کو زبردست تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ حکومت نے اپنی تجاویز واپس لے لیں اور افواج میں کمی کا خیال ترک کر دیا۔ [1] پاکستان کے عوام اور منتخب نمائندے دفاع کے بارے میں بڑے حساس تھے۔ لہٰذا ہر سال دفاعی بجٹ میں اضافہ ہوتا رہا۔ 58-1947 تک پاکستان نے دفاعی بجٹ پر کل قومی بجٹ کا تقریباً 60 فیصد خرچ کیا۔ غیر معمولی دفاعی اخراجات کی وجہ سے تعلیم، صحت اور افرادی قوت کے شعبے متاثر ہوئے۔ البتہ پاکستان کے دفاعی اخراجات بھارت کے دفاعی اخراجات کی نسبت کم رہے۔ ابتدائی سالوں میں منظم اور تربیت یافتہ بری، بحری اور فضائی افواج کی تشکیل اہم مسئلہ تھا جس کے لیے قابل ذکر دفاعی بجٹ کی ضرورت تھی۔ رفتہ رفتہ اسلامی جذبہ کے پیشِ نظر مذہبی جماعتیں اور گروپ فوج کے قریب ہوگئے اور یہ نعرہ سامنے آیا ''پاکستان کا دفاع اسلام کا دفاع ہے۔'' پڑھے لکھے لبرل طبقے اس تشویش کا اظہار کرتے رہے کہ فوج کے اخراجات پاکستان کے وسائل سے زیادہ ہیں۔

جنرل ایوب کے دور میں (68-1958) میں دفاعی اخراجات میں اضافہ ہوا۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ کی وجہ سے دفاعی بجٹ میں دوگنا سے زیادہ اضافہ ہوا اور جنگ کے بعد بھی دفاعی بجٹ 65-1964 کی سطح پر واپس نہ آسکا۔ [2] جنرل یحیٰی کے دور میں بھی دفاعی بجٹ میں ہر سال اضافہ جاری رہا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے دفاع پر زیادہ اخراجات کرنا پڑے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھی دفاعی اخراجات کم نہ ہوئے۔ آدھا ملک گنوالیا اور دفاعی بجٹ بھی کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا۔ [3]

[1] وزیراعظم بوگرہ کا بیان ڈان 2 ستمبر 1953

[2] دیکھئے دفاعی بجٹ کا ٹیبل 1964-65، 1965-66 اور 1966-67

[3] دیکھئے دفاعی بجٹ کا ٹیبل 1971-72 اور 1972-73

ذوالفقار علی بھٹو کے دور (77-1971) کے دوران دفاعی بجٹ میں مجموعی طور پر 218 فیصد اضافہ ہوا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد فوج شکست خوردہ تھی اور اس کی پیشہ وارانہ کمزوریاں بھی منظر عام پر آئی تھیں۔ فوج کو جدید اسلحہ اور ساز و سامان سے لیس کر کے اس کے اعتماد کو بحال کرنا ضروری تھا۔ بھٹو بھارت کی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انہوں نے فوج کے دفاع پر خصوصی توجہ دی اور مناسب وقت پر ایٹمی ٹیکنالوجی کا پروگرام بھی شروع کیا۔ بھٹو دور میں فوج کی تنخواہوں اور مراعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور (88-1977) میں دفاعی بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ضیاء نے سابق فوجیوں کی فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دی اور ملازمتوں میں ان کے لیے 10 فیصد کوٹہ مقرر کیا۔ فوجی فاؤنڈیشن، بحریہ فاؤنڈیشن اور شاہین فاؤنڈیشن نے اپنی تجارتی سرگرمیوں کو وسیع کیا۔ [4] جنرل ضیاء نے کور کمانڈرز کو خصوصی فنڈز دیئے جو وہ اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کر سکتے تھے۔ [5]

1998-99 میں فوج کے دفاعی بجٹ کا 30 فیصد غیر ضروری اسلحہ کی پیداوار، ضرورت سے زیادہ ملازمین، سینئر فوجی افسروں کی کاروں اور دیگر لگژری سامان کی درآمد اور کرپشن کی نذر ہو گیا۔ [6]

افواج پاکستان قومی سلامتی کا حساس ادارہ ہے لہٰذا دفاعی بجٹ کو زیر بحث لانا قومی مفاد میں نہیں ہے۔ فوج کے اندر آڈٹ کا اپنا نظام موجود ہے۔ دفاع کے بجٹ کا استعمال کس حد تک شفاف ہوتا ہے، پاکستان کے عوام اس سے بے خبر ہیں۔ دفاع کی پارلیمانی کمیٹی کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ خفیہ فنڈز کے علاوہ دفاعی اخراجات کا جائزہ لے سکے تاکہ دفاعی بجٹ پر بھی منتخب عوامی نمائندوں کا چیک موجود ہو اور فوج کے اندر ممکنہ بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کو کنٹرول کیا جا سکے۔

دفاعی اخراجات کا ٹیبل

(1947-2005)

1947-48	153.8 ملین روپے
1948-49	461.5 ملین روپے
1949-50	625.4 ملین روپے
1950-51	649.9 ملین روپے
1951-52	779.1 ملین روپے
1952-53	783.4 ملین روپے

[4] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 244
[5] عائشہ صدیقہ آغا "Pakistan's Military Build-up 1979-99" صفحہ 82
[6] عائشہ صدیقہ آغا "Pakistan's Military Build-up 1979-99 " صفحہ 82

1953-54	653.2 ملین روپے
1954-55	635.1 ملین روپے
1955-56	917.7 ملین روپے
1956-57	800.9 ملین روپے
1957-58	854.2 ملین روپے
1958-59	996.6 ملین روپے
1959-60	1043.5 ملین روپے
1960-61	1112.4 ملین روپے
1961-62	1108.6 ملین روپے
1962-63	954.3 ملین روپے
1963-64	1156.5 ملین روپے
1964-65	1262.3 ملین روپے
1965-66	2855.0 ملین روپے
1966-67	2293.5 ملین روپے
1967-68	2186.5 ملین روپے
1968-69	2426.8 ملین روپے
1969-70	2749.2 ملین روپے
1970-71	3200.0 ملین روپے
1971-72	3725.0 ملین روپے [7]
1972-73	4439.6 ملین روپے
1973-74	4948.6 ملین روپے
1974-75	6914.2 ملین روپے
1975-76	8103.4 ملین روپے
1976-77	8120.6 ملین روپے
1977-78	9674.5 ملین روپے
1978-79	10167.6 ملین روپے
1979-80	12654.8 ملین روپے
1980-81	15300.0 ملین روپے

[7] فیڈرل بیورو آف سٹیٹکس گورنمنٹ آف پاکستان 72-1947 صفحہ 181

1981-82	18630.0 ملین روپے
1982-83	24565.0 ملین روپے
1983-84	26750.0 ملین روپے
1984-85	29191.0 ملین روپے
1985-86	33063.0 ملین روپے [8]
1986-87	41335.0 ملین روپے
1987-88	47015.0 ملین روپے
1988-89	51053.0 ملین روپے
1989-90	58708.0 ملین روپے
1990-91	64623.0 ملین روپے
1991-92	75751.0 ملین روپے
1992-93	84461.0 ملین روپے
1993-94	91776.0 ملین روپے
1994-95	100221.0 ملین روپے
1995-96	119658.0 ملین روپے
1996-97	127400.0 ملین روپے
1997-98	133800.0 ملین روپے
1998-99	145000.0 ملین روپے [9]
1999-2000	150400.0 ملین روپے
2000-2001	131200.0 ملین روپے
2001-2002	149254.0 ملین روپے
2002-2003	160139.0 ملین روپے
2003-2004	180537.0 ملین روپے
2004-2005	216258.0 ملین روپے

نوٹ: ان دفاعی اخراجات میں ریٹائرڈ فوجی ملازمین کی پنشن پر خرچ ہونے والے اربوں روپے شامل نہیں ہیں جو سول اخراجات میں سے ادا کیے جاتے ہیں۔

[8] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "The Military and Politics in Pakistan" صفحہ 244

[9] عائشہ صدیقہ آغا "Pakistan Military Build-up 1979-99" صفحہ 80

باب 14

فوج کی تجارتی و صنعتی سرگرمیاں

فوج براہِ راست طویل عرصہ اقتدار میں رہی لہٰذا اسے پرائیویٹ اور پبلک اداروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع ملتا رہا۔ فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر سویلین حکومتوں میں بھی اپنا حصہ بقدر جثہ وصول کرتی رہی۔ سیاسی جمہوری حکمران اپنی حکومتوں کی بقا اور سلامتی کے لیے بھی فوج کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ نجی اداروں نے ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجیوں کو اچھی تنخواہوں پر ملازمتیں دیں تاکہ ان کے اثر و رسوخ کو اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے استعمال کر سکیں۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ فوج کے ریٹائرڈ اور حاضر سروس افسر صنعت، تجارت، زراعت، تعلیم، صحت، ٹرانسپورٹ، پراپرٹی، مواصلات، سائنس اور ٹیکنالوجی، میڈیسن، انجینئرنگ اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں موجود ہیں۔ عسکری پس منظر رکھنے والے افراد ملکی معیشت پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فوج کے کنٹرول میں ایسے ادارے موجود ہیں جو سویلین حکومت کے تعاون کے بغیر حاضر اور ریٹائرڈ فوجیوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ صوبائی اور وفاقی حکومتیں سویلین اُمور کے لیے فوج کی معاونت حاصل کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ غیر عسکری سرگرمیوں میں شریک ہونے سے بھی فوجیوں کی سماجی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جنرل ایوب نے اپنے دور میں سینئر ریٹائرڈ فوجی افسروں کو حکومتی اداروں اور کارپوریشنوں میں کلیدی عہدوں پر فائز کیا اور انہیں بھاری تنخواہوں اور مراعات سے نوازا۔ ایوب نے 14 فوجی افسروں (بری اور بحریہ) کو پاکستان کی سی ایس پی ایلیٹ سروس میں شامل کیا۔ جنرل یحییٰ نے اس روایت کو قائم رکھا۔ جنرل ضیاء الحق کو عوام کی جانب سے قابلِ ذکر حمایت حاصل نہ ہو سکی لہٰذا اس نے فوج کو خوش کرنے کے لیے فوجی افسروں کی غیر معمولی طور پر سرپرستی کی اور حکومت کے تمام شعبوں میں مستقل بنیاد پر فوجیوں کی ملازمت کا دس فیصد کوٹہ مقرر کر دیا۔ فائنر کے مطابق ضیاء نے ریاست کے تمام اداروں کو فوج کی کالونی بنا دیا۔ حساس نوعیت کے کلیدی عہدوں پر فوجی افسر تعینات ہوتے رہے۔ [1] واپڈا، ریلوے، پی آئی اے، نیشنل شپنگ کارپوریشن اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے چیئرمین اور ایم ڈی اکثر اوقات فوجی افسر ہی تعینات ہوتے رہے۔ ملٹری سلیکشن بورڈ کی سفارش پر فوجی افسروں کو سی ایس پی ایلیٹ فورس میں ملازمتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ جن

[1] فائنر ایس ای "The Military and Politics in Third World" صفحہ 84

میں فارن سروس، ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ اور پولیس سروس شامل ہیں۔ بعض اوقات سیاست دان بھی اس روایت سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ نواز شریف کے داماد کیپٹن صفدر کو ڈی ایم جی گروپ میں شامل کیا گیا۔ [2] 1982 میں پاکستان کے 42 سفیروں میں سے 18 کا تعلق فوج سے تھا۔ 93-1992 میں پبلک سروس کمیشن کے نصف ممبران ریٹائرڈ فوجی تھے۔ 96-1995 میں چار میں سے تین صوبائی گورنر عسکری پس منظر کے حامل تھے۔ چار یونیورسٹیوں میں ریٹائرڈ فوجی افسر وائس چانسلر کے طور پر تعینات رہے۔ [3] چند بریگیڈیرز کو رولز تبدیل کر کے قائداعظم یونیورسٹی میں ملازمتیں دی گئیں۔ 97-1996 میں ریٹائرڈ فوجی افسروں کو خفیہ ایجنسیوں کا سربراہ نامزد کیا گیا۔ 1997ء میں کیپٹن اور کرنل رینک کے افسروں کو پولیس، ایف آئی اے اور آئی بی میں کھپانے کے لیے منصوبہ تیار کیا گیا۔ [4]

ریٹائر اور حاضر سروس فوجی افسروں کے زیر انتظام چلنے والے تجارتی اور صنعتی اداروں کے اثاثے اربوں روپے کے ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کا ادارہ پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ سیاست دانوں اور بیوروکریٹس نے سماجی، سیاسی اور معاشی سرگرمیوں میں جو خلا چھوڑا اسے افواج پاکستان نے پُر کیا۔

فوجی فاؤنڈیشن

یہ ادارہ 1953 میں قائم کیا جس کا مقصد ریٹائر فوجی افسروں اور ان کے خاندانوں کے لیے معاشی وسائل مہیا کرنا تھا۔ انگریز بھی اپنے دور میں فوجیوں کی فلاح و بہبود کے ادارے قائم کرتے رہے۔ فوجی فاؤنڈیشن کے ضمن میں بھی اسی روایت پر عمل کیا گیا۔ بھارت میں بھی فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ فوج کے ملازمین چونکہ کم عمر میں ریٹائر ہوجاتے ہیں لہٰذا ان کے روزگار اور ملازمت کے لیے ایسے ادارے کی ضرورت تھی۔ جنرل محمد ایوب خان نے فوجی فاؤنڈیشن جیسے اہم ادارے کی بنیاد رکھی۔ جسے 18 ملین روپے کے ابتدائی فنڈ سے The Charitable Endowments Act 1889 کے تحت رجسٹر کرایا گیا۔ فوجی فاؤنڈیشن نے سیمنٹ، سیریلز، اور فرٹیلائزر کے پلانٹ لگائے۔ 1970ء میں اس فاؤنڈیشن کے اثاثے 152 ملین روپے تھے جو 1982 تک 2060 ملین روپے ہوگئے۔ فاؤنڈیشن کے زیرانتظام 29 صنعتی ادارے چل رہے تھے۔ [5] فوجی فاؤنڈیشن کے گیارہ بڑے یونٹوں کے اثاثے دس بلین روپے سے بڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے چھ یونٹ شیئر ہولڈنگ والے پراجیکٹ ہیں۔ مارچ 2005 تک 91 لاکھ افراد فوجی فاؤنڈیشن سے مستفید ہوئے۔ [6]

---

[2] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 235

[3] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی "Military, State and Society in Pakistan" صفحہ 235

[4] ڈان 20 مئی 1997

[5] سعید شفقت "Civil and Military Relations" صفحہ 37

[6] فوجی فاؤنڈیشن خصوصی ایڈیشن ڈان 16 مارچ 2005

1- فوجی شوگر ملز (4)
2- فوجی سیریلز
3- فوجی کارن کمپلیکس
4- فون گیس
5- فوجی پولی پراپری لین پروڈکٹس
6- فوجی فرٹیلائزر کمپنی
7- فوجی جارڈن کمپنی
8- مری گیس کمپنی
9- فوجی سیمنٹ
10- فوجی آئیل ٹرمینل کمپنی
11- فوجی کبیر والا پاور کمپنی

فوجی فاؤنڈیشن آرمی، بحریہ اور فضائیہ کے ملازمین کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس لیے اس کا کنٹرول منسٹری آف ڈیفنس کو دیا گیا۔

فاؤنڈیشن کے سول اور فوجی ملازمین کی تعداد 45000 سے زیادہ ہے۔ اس کے زیر انتظام تعلیم، صحت اور ٹریننگ کے ویلفیئر پراجیکٹس بھی چل رہے ہیں۔ فاؤنڈیشن پرائیویٹ سیکٹر میں چل رہی ہے۔ یہ چونکہ فلاحی اور سماجی ادارہ ہے لہٰذا اس انکم ٹیکس لاگو نہیں ہوتا۔

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ (AWT)

فوج نے 1971ء میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے نام سے ایک اور ادارہ قائم کیا۔ جسے سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹر کرایا گیا۔ یہ ادارہ 26 یونٹس چلا رہا ہے ن کا کل سرمایہ 17 بلین روپے ہے۔ [7] اے ڈبلیو ٹی جی ایچ کیو کی نگرانی میں چلتا ہے۔ پانچ ہزار ریٹائر فوجیوں کو روزگار مہیا کیا گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کا بنیادی مقصد بھارت میں قید ہونے والے جنگی قیدیوں کو ریلیف اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ بھٹو حکومت نے فوج کے معاشی مفادات کی خاطر اس ٹرسٹ کی منظوری دی۔ فوجی فاؤنڈیشن چونکہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ریٹائر ہونے فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ناکافی اس لیے ایک نئے ادارے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ضرورت محسوس کی گئی۔

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے زیرانتظام 26 یونٹ چل رہے ہیں۔

1- عسکری سٹڈ فارمز (2)
2- عسکری فارمز (2)
3- عسکری ویلفیئر رائس ملز
4- عسکری ویلفیئر شوگر ملز
5- عسکری فش فارمز
6- عسکری سیمنٹ (2)
7- عسکری فارماسوٹیکل
8- میگنا سائٹ ریفائنیز لمٹیڈ
9- آرمی ویلفیئر شو پراجیکٹ
10- آرمی ہوزری یونٹ

---

[7] عائشہ صدیقہ آغا "Military As An Economic Actor" صفحہ 6
یہ پیپر انٹرنیشنل کانفرنس جکارتہ بتاریخ 19-17 اکتوبر 2000 میں پڑھا گیا۔

11- ٹریول ایجنسیز (3)
12- آرمی ویلفیئر وولن ملز
13- اے ڈبلیوٹی کمرشل پلازہ (3)
14- آرمی ویلفیئر شاپس (4)
15- آرمی ویلفیئر کمرشل پراجیکٹس
16- عسکری کمرشل بینک
17- عسکری لیزنگ لمیٹڈ
18- عسکری جنرل انشورنس کمپنی
19- عسکری سیونگ سکیم
20- عسکری ایسوسی ایٹ لمیٹڈ
21- عسکری انفرمیشن سروس
22- عسکری گارڈز لمیٹڈ
23- عسکری پاور لمیٹڈ
24- عسکری کمرشل انٹرپرائز
25- عسکری ایوی ایشن
26- عسکری ہاؤسنگ سکیم (6)

شاہین فاؤنڈیشن

بحریہ اور فضائیہ نے آرمی کے پروجیکٹس سے متاثر ہو کر اپنی سروسز کے لیے الگ ادارے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل ضیاء الحق 1977ء میں بحریہ اور فضائیہ کی فاؤنڈیشن قائم کرنے کی منظوری دے دی۔ شاہین فاؤنڈیشن 5 ملین روپے کے سرمایے کے ساتھ رجسٹر ہوئی۔ شاہین فاؤنڈیشن کی سالانہ ٹرن اوور 600 ملین روپے ہے، آمدنی کا 20 فیصد ویلفیئر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شاہین فاؤنڈیشن کے زیر انتظام دس یونٹ چل رہے ہیں۔ ملازمین کی تعداد 1500 ہے۔

1- شاہین ایئر انٹرنیشنل
2- شاہین ایئر کارگو
3- شاہین ایئرپورٹ سروسز
4- شاہین ایئرو ٹریڈرز
5- شاہین انشورنس
6- شاہین کمپلیکس
7- شاہین پے ٹی وی
8- ایف ایم 100 (ریڈیو چینل)
9- شاہین سسٹم (انفرمیشن ٹیکنالوجی)
10- شاہین نٹ ویئر

بحریہ فاؤنڈیشن

یہ ادارہ 1981ء میں قائم ہوا۔ اسے ابتدائی طور پر تیس لاکھ روپے کی گرانٹ دی گئی۔ بحریہ فاؤنڈیشن کے منصوبے فوج اور فضائیہ کے منصوبوں سے چھوٹے ہیں۔ جو زیادہ تر نجی سرمایہ کاروں کے تعاون سے چل رہے ہیں۔ بحریہ فاؤنڈیشن کے 19 پراجیکٹس ہیں۔

1- فلاح ٹریڈنگ ایجنسی
2- بحریہ کنسٹرکشن
3- بحریہ ٹریول اینڈ ریکروٹنگ ایجنسی
4- بحریہ پینٹس
5- بحریہ ڈیپ سی فشنگ
6- بحریہ کمپلیکس
7- بحریہ ٹاؤن ہاؤسنگ سکیم (3)
8- بحریہ ڈریجنگ
9- بحریہ شپ بریکنگ
10- بحریہ سالویج انٹرنیشنل
11- بحریہ یونیورسٹی
12- بحریہ شپنگ
13- بحریہ کوسٹل سروسز
14- بحریہ سکیورٹی اینڈ سسٹم سروسز
15- بحریہ کیٹرنگ اینڈ ڈیکوریشن سروسز
16- بحریہ فارمنگ
17- بحریہ ہولڈنگ
18- بحریہ ہاربر سروسز
19- بحریہ بیکری

نیشنل لاجسٹک سیل (NLC)

یہ ادارہ 1978ء میں قائم ہوا جس کا مقصد ٹرانسپورٹ کا معیاری نظام فراہم کرنا تھا۔ اسے جی ایچ کیو سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ملازمین کی تعداد 6578 ہے جس میں 2442 حاضر سروس آرمی آفیسر شامل ہیں جبکہ 4136 ریٹائرڈ آفیسر ہیں۔ این ایل سی پاکستان میں ٹرانسپورٹ کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (FWO)

ایف ڈبلیو او تعمیرات کا عسکری ادارہ ہے جو آرمی چیف کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ اس ادارے نے قراقرم ہائی وے اور شمالی علاقہ جات نیز بلوچستان کی اہم شاہرائیں تعمیر کر کے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

فوجی فاؤنڈیشن، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن کے زیر انتظام چلنے والے درجنوں منصوبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کے معاشی مفادات پورے پاکستان اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے عوام کو فوج کی اہمیت اور دفاع کے پیش نظر فوج کی تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے ان اداروں کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا اور اپنے وفادار فوجی جرنیلوں کو فاؤنڈیشن کے اہم عہدوں پر فائز کیا۔ فوج کے سینئر جرنیلوں کے مطابق فوج کے ملازمین ریٹائر ہونے کے بعد پنشن کی رقوم سے معیاری زندگی نہیں گزار سکتے لہٰذا ان کے لیے فاؤنڈیشن کی تجارتی اور صنعتی سرگرمیاں ضروری ہیں۔ بحریہ، فضائیہ کے علاوہ صرف فوج کے سات لاکھ سابق ملازمین

سرکاری پینشن وصول کرتے ہیں۔ فوج کے اثر ورسوخ کی وجہ سے فاؤنڈیشن کے زیرانتظام چلنے والے کئی تجارتی اور صنعتی اداروں نے بالادستی حاصل کرلی ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن بحریہ فاؤنڈیشن اور شاہین فاؤنڈیشن کو عسکری اور سرکاری سرپرستی تو حاصل ہے مگر یہ ادارے پرائیویٹ اداروں سے آڈٹ کراتے ہیں جنہیں شائع نہیں کیا جاتا۔ گورنمنٹ آف پاکستان کے آڈیٹر جنرل کو ان اداروں کا آڈٹ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ جس طرح فوج کے بجٹ کو خفیہ رکھا جاتا اسی طرح فوج کے تجارتی اور صنعتی ادارے بھی عوام کی رسائی سے باہر ہیں۔ فوج نے قومی ترقی اور سابق فوجیوں کے ریلیف، فلاح اور بحالی کے نام پر اپنے کارپوریٹ مفاد کو بہت وسیع کرلیا ہے۔

عائشہ صدیقہ آغا لکھتی ہیں:۔

In fact, the pay and emolunents of military personnel are higher than their counterparts in the civil sector. The military service, which is a pensionable job, provides better security to its employees than most of the general public. A specific directorate in all of the three service headquarters ensures that ex-servicemen interested in finding a job get an opportunity. The search is conducted in both the public and private sectors. These foundations, therefore, are an additional job seeking channels for the ex-servicemen. These opportunities are much more than what a common citizen in Pakistan could imagine. This apparent exploitation of resources and opportunities for a selected segment of the population is made possible mainly due to the political clout of the armed forces. The top management of the armed forces jealously guards their interests. Over the years the interests have narrowed down from the greater benefit of the institution to the personal welfare of the generals.[8]

ترجمہ: درحقیقت عسکری ملازمین کی تنخواہیں اور مراعات اپنے مدمقابل سول ملازمین کی نسبت زیادہ ہیں۔ فوج کی سروس جو کہ پنشن والی ملازمت ہے اپنے ملازمین کو پاکستان کے عام لوگوں سے بہتر تحفظ فراہم کرتی ہے۔ فوج کی تینوں سروسز کے صدر دفتر میں قائم خصوصی ڈائریکٹوایٹ اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ سابق فوجیوں کو خواہش کے مطابق روزگار مل جائے۔ روزگار کے مواقع پرائیویٹ اور پبلک اداروں میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ فاؤنڈیشن سابق فوجیوں کے روزگار کے اضافی ادارے ہیں۔ پاکستان کا عام آدمی ایسی سہولتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آبادی کے مخصوص افراد کے لیے روزگار اور

مواقع کا حصول فوج کے سیاسی اثر ورسوخ کی بناء پر ہی ممکن ہوسکا ہے۔ افواج پاکستان کی اعلیٰ انتظامیہ پورے انہاک سے اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جرنیلوں کا ذاتی مفاد فوج کے ادارے کے مفاد پر حاوی ہوگیا ہے۔[8]

رئیل اسٹیٹ (پراپرٹی)

گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران فوج نے رئیل اسٹیٹ (پراپرٹی) میں بھی گہری دلچسپی لی۔ ریٹائرڈ آرمی افسروں کے لیے ہاؤسنگ سکیمیں تیار کی گئیں جن میں مارکیٹ سے بہت کم قیمت پر سابق فوجیوں کو پلاٹ الاٹ کئے گئے۔ رفتہ رفتہ فلیٹ اور گھر تعمیر کیۓ گئے اور انہیں مناسب قیمت پر افسروں کو الاٹ کیا جانے لگا۔ ہاؤسنگ سکیمیں عام طور پر سرکاری اراضی پر تعمیر کی جاتی ہیں اس طرح قومی خزانے پر بوجھ پڑتا ہے۔ عسکری ہاؤسنگ سکیمیں اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ہاؤسنگ سکیمیں عموی طور پر سرکاری زمینوں پر بنائی گئیں۔ ملٹری لینڈز کو کنٹرول کرنے کے لیے ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹ ڈائریکٹوریٹ قائم کیا گیا ہے جو ڈیفنس منسٹری کے ماتحت ہے مگر عملی طور پر فوج کے زیراثر ہے۔ ملٹری لینڈز کا ڈائریکٹر جنرل سول سروس سے لیا جاتا تھا مگر اب حاضر سروس میجر جنرل کو ڈی جی تعینات کیا جاتا ہے۔ پاکستان بھر میں 44 کنٹونمنٹ ایریاز ملٹری لینڈز ڈائریکٹوریٹ کی تحویل میں ہیں۔ پاکستان بھر میں سرکاری اراضی پر بنائی گئیں 27 ہاؤسنگ سکیمیں صرف فوجی آفیسر کیڈر کے لیے مختص ہیں ان میں فوج کے جوان پلاٹ حاصل نہیں کرسکتے۔

انگریز اپنے دور میں فوجیوں کو زرعی اراضی الاٹ کیا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ روایت جاری رہی اور مختلف ادوار میں سابق فوجیوں کو پاکستان کے مختلف علاقوں میں زرعی اراضی الاٹ کی گئی۔ پنجاب اور سندھ کے بیراجوں میں غلام محمد، گدو، تونسہ اور اٹک، جہلم، کوہاٹ، راولپنڈی، ہزارہ کے اضلاع سابق فوجیوں کو سرکاری زمینیں الاٹ کی گئیں جنہیں فوج کی مدد سے سیراب کیا گیا۔[9] جنرل ایوب خان نے (247 ایکڑ) جنرل موسیٰ نے (250 ایکڑ) جنرل امراؤ خان نے (246 ایکڑ) اراضی گدو بیراج میں آلاٹ کرائی۔ جس کو غیرملکی امداد سے ڈیویلپ کیا گیا۔ ستارہ جرأت، ہلال جرأت اور تمغہ جرأت حاصل کرنے والے فوجیوں کو 12.5 ایکڑ سے 150 ایکڑ تک اراضی الاٹ کی جاتی رہی۔

سیاست دانوں کی طرح فوجی افسروں کو بھی مختلف سرکاری اور نجی ہاؤسنگ سکیموں میں رہائشی اور کمرشل پلاٹ الاٹ کیۓ گئے جن کی قیمت مارکیٹ سے بہت کم وصول کی جاتی ہے۔ جنرل مشرف سمیت سینکڑوں فوجی افسروں کو بہاولپور میں "سرحدوں کے دفاع" کے نام پر کوڑیوں کے مول اراضی الاٹ ہوئی۔ فوج نے اوکاڑہ کی انتہائی زرخیز زمین، پرانے مزارعین سے لے کر اپنی تحویل میں لے لی۔ یہ زرعی

---

[8] عائشہ صدیقہ آغا "Military As An Economic Actor"
یہ پیپر انٹرنیشنل کانفرنس جکارتہ بتاریخ 17-19 اکتوبر 2000 میں پڑھا گیا۔

[9] جنرل فضل مقیم خان "The Story of Pakistan Army" صفحہ 232

اراضی ہزاروں ایکڑ پر مشتمل ہے۔ اوکاڑہ فارمز ملٹری فارمز کا حصہ ہیں اوکاڑہ اور رینالہ فارمز 16627 ایکڑ اراضی پر مشتمل ہیں جن میں 2 ڈیری فارمز 7 ملٹری فارمز اور 22 دیہات شامل ہیں۔ اوکاڑہ فارمز کی لیز 1947ء میں ختم ہو چکی تھی جس کی تجدید نہ کرائی گئی۔ رینجرز نے اس اراضی کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے دو بار پورے علاقے کو محاصرے میں لے کر کرفیو نافذ کر دیا اور دوائیوں سمیت کھانے کی اشیاء کی سپلائی بند کر دی۔ آئی ایس پی آر کے ڈی جی جنرل شوکت سلطان نے کہا کہ"فوج اپنی ضروریات کا تعین خود کرے گی۔ کسی کو یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ فوج 5000 ایکڑ یا 17000 ایکڑ اراضی کا کیا کرے گی"۔ [9] سینکڑوں سینئر فوجی افسروں کو کسٹم ڈیوٹی ادا کیے بغیر لگژری کاریں درآمد کرنے کی اجازت دی گئی۔ 1977-97 تک 13 جرنیلوں، 10 لیفٹیننٹ جرنیلوں، 2 میجر جرنیلوں، 2 بریگیڈیئرز، بحریہ کے 7 ایڈمرل، 3 وائس ایڈمرل، فضائیہ کے 4 ایئر چیف مارشل اور 2 ایئر مارشل نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا۔ [10]

فوج کے معاشی مفادات پاکستان کی صنعت اور تجارت تک پھیل چکے ہیں۔ فوج اہم شراکت دار کی حیثیت سے صنعتی، تجارتی اور معاشی پالیسیوں کو متاثر کرتی ہے۔ فوج کے تجارتی اور صنعتی یونٹوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ادارے براہ راست آرمی چیف کے انتظامی کنٹرول میں ہیں۔ کچھ ڈیفنس منسٹری کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اور کچھ سابق فوجیوں کی ویلفیئر کے ادارے پرائیویٹ سیکٹر میں کام کر رہے ہیں اور خود مختار ہیں۔ [11]

کراچی اور لاہور میں اہم پوش ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیاں فوج کے کنٹرول میں ہیں۔ اب اسلام آباد میں بھی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی گئی ہے۔ پنجاب حکومت نے ڈی ایچ اے اسلام آباد کے لیے 9996 کنال اراضی منتقل کی اور زمین کی قیمت صرف 25 ہزار روپے سے 50 ہزار روپے فی کنال وصول کی گئی۔ [12] ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے اثاثے اربوں روپے کے ہیں۔ گورنر سٹیٹ بینک ڈاکٹر عشرت حسین کے مطابق افواج پاکستان کا ادارہ سٹاک ایکسچینج میں شامل کمپنیوں کے کل اثاثہ جات میں سے 3.5 فیصد کا مالک ہے۔ [13] فوج کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کی وسعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج دفاع کے علاوہ ایک بہت بڑی تجارتی اور صنعتی سلطنت بن چکی ہے۔ پاک سرزمین کے ساتھ اب اس کے معاشی مفادات بھی وابستہ ہیں۔ لہٰذا فوج کا دفاعی جذبہ اب مثالی ہونا چاہیے۔ کیا فوج کی تجارتی، صنعتی اور معاشی سرگرمیوں اور سول امور میں مداخلت سے اس کی پیشہ وارانہ صلاحیتیں متاثر ہوئی ہیں، اس پر فوج کے اندر سنجیدہ اور معروضی تحقیق کی ضرورت ہے۔ البتہ پاکستان کی سیاسی تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ

---

[9] عائشہ صدیقہ — نیوز لائن جولائی 2006
[10] ڈاکٹر حسن عسکری رضوی — "Military State and Society in Pakistan" صفحہ 236
[11] ایم اے نیازی — "Pakistan's Military Industrial Power" نیشن 22 جون 1991
[12] ڈیلی نیوز — 24 نومبر 2005
[13] بزنس ریکارڈ — 13 اگست 2005

پاکستان کے جمہوری ادارے ایک انتہائی طاقت ور اور فعال فوج کے دباؤ کی وجہ سے پنپ نہ سکے۔ عوام کا تاثر یہ ہے کہ پاکستان فوج کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ جنرل مشرف نے اسلام آباد میں 2438 ایکڑ اراضی پر نیا جی ایچ کیو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اراضی اسلام آباد کے تین سیکٹرز E-10,E-9 اور D-11 میں سی ڈی اے سے معمولی قیمت پر حاصل کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق سی ڈی اے کو 500 ارب روپے کا نقصان ہوا جی ایچ کیو کے مطابق حمود الرحمٰن کمیشن نے تینوں سروس ہیڈکوارٹرز کو ایک جگہ قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کمیشن کی باقی سفارشات پر عمل کیوں نہ کیا گیا۔ نئے جی ایچ کیو میں بری، بحری اور فضائی افواج کے ہیڈکوارٹرز کے علاوہ ڈیفنس منسٹری اور چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے دفاتر بھی تعمیر کیے جائیں گے۔ 17000 فوجیوں کے لیے 14000 لگژری ہاؤسز، سکولز، ہسپتال اور جھیلوں کی تعمیر بھی نئے جی ایچ کیو کا حصہ ہوگی۔ بعض تجزیہ نگار اسے دنیا کا ''آٹھواں عجوبہ'' قرار دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان جیسا غریب اور پس ماندہ ملک اتنے بڑے جی ایچ کیو کا متحمل نہیں ہو سکتا جبکہ پرانا جی ایچ کیو (راولپنڈی) اسلام آباد کے قریب ہے اور عسکری ضروریات کے لیے کافی ہے۔

جنرل مشرف نے اکتوبر 1999ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے اثاثے ڈیکلیئر کر کے ایک اچھی روایت قائم کی۔ انہوں نے جو اثاثے ظاہر کیے ان کی تفصیل یہ ہے:۔

1- زیر تعمیر گھر آرمی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
2- 2000 گز کا پلاٹ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی
3- 2 کنال پلاٹ مورگاہ ہاؤسنگ سکیم راولپنڈی
4- ڈیڑھ کنال پلاٹ آرمی ہاؤسنگ سکیم پشاور
5- 8 مرلہ کمرشل پلاٹ ایل سی ایچ ایس لاہور
6- 2 مربع زرعی اراضی بہاولپور ہاؤس۔
7- والدین کا گھر F-7/3 اسلام آباد
8- بیٹی کا گھر ڈی ایچ اے کراچی
9- 1 کنال پلاٹ ایسٹریج سکیم
10- 2 کنال سنگھار ہاؤسنگ سکیم گوادر۔

تمام پراپرٹی پر انکم ٹیکس، زرعی ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس ادا کیا گیا۔ [14]

نیول چیف عبدالعزیز مرزا نے اپنے جو اثاثے ڈیکلیئر کیے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔

1- 500 مربع گز پلاٹ بحریہ ٹاؤن راولپنڈی
2- 1000 مربع گز پلاٹ سہالہ نیول آفیسرز، ہاؤسنگ سوسائٹی راولپنڈی

---

[14] ڈیلی نیوز — 2 نومبر 1999

-3 600 مربع گز پلاٹ نیوی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

-4 سیونگ سرٹیفکیٹ، شیئرز، کیش 1,50,000 روپے

-5 14 ایکڑ آبائی اراضی ضلع راولپنڈی۔

-6 بیوی کے نام 2 مربع اراضی بہاولپور

-7 1650 مربع فٹ فلیٹ سیکٹر جی 5 اسلام آباد

-8 16 ایکڑ موروثی اراضی ملتان

ان اثاثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کے جرنیل بھی سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کی طرح کروڑوں روپے کی جائیداد کے مالک بن جاتے ہیں۔ سینٹ میں پیش کیۓ گئے ریکارڈ کے مطابق 15 اپریل 1994 کو F-11/2 اسلام آباد میں پانچ پلاٹ ڈی جی آئی ایس آئی کو الاٹ کیۓ گئے۔ 16 نومبر 1994 کو ڈی جی آئی ایس آئی کو F-7/2 اور F-7/4 میں 1600 مربع گز کے دو پلاٹ الاٹ کیۓ گئے۔ جبکہ 26 اکتوبر 1994 کو ڈی جی آئی ایس آئی کو F-7/1 میں 1244 مربع گز کا پلاٹ الاٹ کیا گیا۔

جنرل (ر) شمیم عالم خان کو 1066 مربع گز کا قیمتی پلاٹ F/7 سیکٹر میں 11 جون 1994 میں الاٹ ہوا۔ جنرل عبدالوحید کاکڑ نے 1200 مربع گز کا پلاٹ 7 ستمبر 1996 میں G-6/4 اسلام آباد میں حاصل کیا۔ ایئرچیف مارشل فاروق، فیروز خان نے 1033 مربع گز کا پلاٹ سیکٹر F-7/2 میں 29 جنوری 1995ء کو حاصل کیا۔ نیول چیف ایڈمرل سعید محمد خان نے 1066 مربع گز کا پلاٹ F-7 اسلام آباد میں 11 جون 1994 کو حاصل کیا۔ سابق نیول چیف یستورالحق کو 800 مربع گز کا پلاٹ F-10/2 اسلام آباد میں 4 نومبر 1991 کو الاٹ کیا گیا۔ الاٹمنٹ کی یہ تفصیل سینٹ کے اجلاس میں پیش کی گئی۔

پاکستان کے وزیر دفاع نے سینٹ میں بیان دیتے ہوئے بتایا کہ افواج پاکستان کے ویلفیئر ادارے 351 صنعتی اور تجارتی پروجیکٹس چلا رہے ہیں جو سیریلز، چینی، گیس، سیمنٹ، تیل، میڈیسن، جوتے، ٹیکسٹائل، پراپرٹی، ٹریول، ایوی ایشن، زراعت، بینکنگ اور لیزنگ کے شعبوں سے متعلق ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق مشرف دور میں 111 فوجی افسروں نے بہاولپور اور رحیم یار خان میں ہزاروں کنال اراضی حاصل کی جن کی قیمت 47.56 روپے فی کنال وصول کی گئی جب کہ مارکیٹ میں قیمت پندرہ ہزار روپے سے بیس ہزار روپے فی کنال تھی۔ جنرل پرویز مشرف کو موضع نوآباد (یزمان) میں 400 کنال الاٹ ہوئے جنرل (ر) معین الدین حیدر نے 400 کنال، جنرل (ر) عزیز احمد نے 400 کنال لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے 400 کنال، لیفٹیننٹ جنرل (ر) عثمانی نے 400 کنال اور لیفٹیننٹ جنرل محمد افضل جنجوعہ نے 400 کنال اراضی حاصل کی۔ رپورٹ کے مطابق 10 جرنیلوں، 4

- ڈیلی نیوز 4 نومبر 1999
- ڈان 28 اکتوبر 2004
- دی نیشن اسلام آباد 27 اپریل 2005

لیفٹیننٹ جنرلز، ایڈمرل، ایئر چیف، 18 بریگیڈیئرز، 3 کرنل، 5 لیفٹیننٹ کرنل نے 400 کنال فی کس اراضی حاصل کی۔ نیب کے سابق چیئرمین جنرل امجد کو سرور روڈ کینٹ لاہور میں دو کنال کا پلاٹ الاٹ ہوا۔ جس کی قیمت صرف 8 لاکھ روپے وصول کی گئی۔ جنرل پرویز مشرف نے لاہور ڈیفنس سوسائٹی میں کمرشل پلاٹ صرف ایک لاکھ روپے میں حاصل کیا۔

عائشہ صدیقہ آغا کے مطابق لاہور کینٹ کی 568 ایکڑ پرائم لینڈ ہاؤسنگ پراجیکٹ کے لیے استعمال کی گئی حالانکہ کنٹونمنٹ کی اراضی دفاعی مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ لاہور کینٹ میں سینکڑوں ریٹائرڈ فوجی افسروں کو رہائشی مقاصد کے لیے قیمتی پلاٹ انتہائی کم قیمت پر الاٹ کیے گئے۔ فوج کی سینٹرل ملٹری اکاؤنٹس برانچ کو بھی ملٹری ہاؤسنگ پراجیکٹس کا آڈٹ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ لاہور کنٹونمنٹ کی اراضی 1980 تک آرمی ٹریننگ گراؤنڈز اور فائرنگ رینج کے لیے استعمال ہوتی تھی جسے رہائشی علاقے میں تبدیل کر دیا گیا۔

کنٹونمنٹ ایریا کی فالتو اراضی کی نیلامی سے وصول ہونے والی رقم جی ایچ کیو کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی جاتی ہے حالانکہ پاکستان کی تمام اراضی حکومت پاکستان کی ملکیت ہوتی ہے لہٰذا یہ رقم حکومت پاکستان کے اکاؤنٹ میں جمع ہونی چاہیۓ۔

ایک اندازے کے مطابق تقریباً 12 ملین ایکڑ اراضی فوج کی تحویل میں ہے جو کل سٹیٹ لینڈ کا 12 فیصد ہے اس میں س 62 فیصد پنجاب 27 فیصد سندھ 11 فیصد سرحد اور بلوچستان میں ہے۔ تقریباً 7 فیصد زرعی اراضی ہے جس کی مالیت کا اندازہ 700 ارب روپے ہے۔ کراچی نیشنل سٹیڈیم کی اراضی کا ایک حصہ کراچی کنٹونمنٹ بورڈ کو منتقل کیا گیا جو سرکاری زمینوں پر قبضے کی لاجواب مثال ہے۔ اس اراضی پر نوے روز کے اندر 6 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کر کے 15 ملین روپے منافع حاصل کیا گیا۔

وفاقی وزیر ریلوے شیخ رشید احمد نے قومی اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران بتایا کہ ریلوے کی 66 کنال زمین جو راولپنڈی ملٹری فارم سے ملحقہ ہے ہاؤسنگ ڈائریکٹوریٹ (ایڈجوٹنٹ جنرل برانچ) جی ایچ کیو کی تحویل میں ہے۔ اکاؤنٹینٹ جنرل پاکستان کی آڈٹ رپورٹ کے مطابق ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اے ون کیٹیگری کی 130 ایکڑ اراضی آرمی کو گالف کورس کے لیے آلاٹ کی جس کی قیمت 72 ملین روپے ہے۔

فوج کے تجارتی، صنعتی مفادات چونکہ وسیع ہو چکے ہیں اس لیے فوج بار بار اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کیا فوج کو تجارتی سرگرمیوں کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے اور ان سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے فوج کی دفاعی صلاحیتیں متاثر نہیں ہوتیں۔

- ڈیلی نیوز 17 اکتوبر 2002
- عائشہ صدیقہ آغا "AWT - Pak Army's White Elephant" فرائیڈے ٹائمز 25 جنوری 2002
- عائشہ صدیقہ نیوز لائن جولائی 2006
- ڈیلی ٹائمز 5 اگست 2006
- ڈیلی نیوز 6 اگست 2006

باب 15

فوج کی سماجی و فلاحی خدمات

پاک فوج نے ہر دور میں سماجی اور تعمیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شاہراہِ قراقرم پاک فوج کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ 832 کلومیٹر طویل یہ شاہراہِ ریشم دس سال (78-1969) میں تعمیر ہوئی۔ تعمیر کے دوران آرمی انجینئر کور کے ستر سے زائد جوان شہید ہوئے۔ یہ شاہراہ چین کے ساتھ واحد زمینی رابطہ ہے۔ 76-1975 میں پاک فوج کے جوانوں نے چترال اور پشاور کے درمیان لواری سرنگ تعمیر کر کے دونوں شہروں کے درمیان زمینی رابطہ بحال کیا۔

فوج نے سندھ کے دُور دراز علاقوں میں آرمی پبلک سکول قائم کیے۔ ڈہرکی (گھوٹکی) میں پاک سعودی فرٹیلائزرز کا کارخانہ قائم کیا جس سے مقامی لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے۔ سندھ کے جنگلات اور کچے کے علاقے میں ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں کو ختم کر کے لوگوں کی جان و مال کا تحفظ کیا۔ فوج نے شجر کاری کی مہم میں پرجوش حصہ لیا اور لاکھوں درخت اُگائے۔ مردم شماری کا کام بھی فوج کے بھرپور تعاون سے مکمل ہوتا رہا۔ سمگلنگ کی روک تھام کے لیے فوج نے اہم کردار ادا کیا۔

قدرتی آفات کا مقابلہ فوج کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ پاکستان میں جب بھی زلزلہ سے تباہی آئی یا سیلاب آئے پاک فوج کے جوانوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر عوام کی جانیں بچائیں۔ آزاد کشمیر اور ہزارہ ڈویژن میں 8 اکتوبر 2005 میں آنے والا زلزلہ قیامت خیز تھا جس میں ایک لاکھ افراد موت کی وادی میں چلے گئے، لاکھوں زخمی ہوئے اور چالیس لاکھ افراد بے گھر ہوگئے۔ زلزلہ کے متاثرین کی امداد کے لیے خیبر سے کیماڑی تک عوام نے بے مثال تاریخی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ پاک فوج کے جوان پورے متاثرہ علاقے میں پھیل گئے، انہوں نے لوگوں کو ملبے کے ڈھیروں سے نکال کر ان کی جانیں بچائیں۔ زخمیوں کو فیلڈ ہسپتالوں میں پہنچایا اور متاثرین کو راشن، کمبل، ٹینٹ اور دوائیاں فراہم کیں۔ اس المناک سانحہ کے بعد پاک فوج کا کردار شاندار رہا۔ فوج کے تعاون کے بغیر آزاد کشمیر کے پہاڑی علاقوں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا وہاں پر صرف ہیلی کاپٹر ہی جا سکتے تھے، زمینی راستے مسدود ہو چکے تھے۔

فوج کے جوان نہروں کی بھل صفائی کی مہم میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جب فوج کو 1998ء میں واپڈا میں کردار ادا کرنے کے لیے بلایا گیا اس وقت واپڈا سنگین معاشی بحران کا شکار تھا۔ فوج کے جوانوں

اور افسروں نے پورے ملک کے میٹر چیک کیے اور کافی حد تک بجلی چوری پر قابو پایا۔ واپڈا میں بد انتظامی اور بے ضابطگی کو ختم کیا۔ برقی پیداوار میں اضافہ کیا اور واجبات وصول کر کے واپڈا کو دیوالیہ ہونے سے بچایا۔ 35,000 ہزار جونیئر فوجی افسروں نے اس مہم میں حصہ لیا۔ 8 حاضر سروس بریگیڈیئرز بجلی کی ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کے انچارج مقرر ہوئے۔ فوج نے کراچی واٹر سپلائی سکیم کا کام بھی مکمل کیا۔ نواز دور میں بھی تعلیم کے شعبے میں معاونت کے لیے پاک فوج کو طلب کیا گیا۔ فوج نے کامیاب سروے کر کے ہزاروں بھوت سکولوں کا کھوج لگایا اور ہزاروں ایسے بے نامی اساتذہ کو بے نقاب کیا جن کی تنخواہیں وصول کی جا رہی تھیں مگر ان سکولوں اور اساتذہ کا وجود نہیں تھا۔ تنخواہیں اور دیگر اخراجات صرف کاغذوں میں وصول کیے جا رہے تھے۔

بلوچستان میں میگا پراجیکٹس کی تعمیر میں بھی فوج تاریخی کردار ادا کر رہی ہے۔ گوادر پورٹ، مکران ساحلی ہائی وے اور دوسری بڑی شاہراہیں اور ڈیم بڑے قومی منصوبے ہیں جن کی تعمیر فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن کے جوان کر رہے ہیں۔ ایف ڈبلیو او (تعمیرات کا فوجی ادارہ) نے پاکستان بھر میں سڑکیں تعمیر کرنے اور پل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فوج فرقہ وارانہ فسادات کو کنٹرول کرنے اور امن و امان قائم کرنے کے لیے بھی مثبت کام کرتی رہی۔ انتخابات کے دوران امن قائم رکھنے اور انتخابی بے ضابطگیوں کو روکنے کے لیے پاک فوج کے جوان اور افسر فرائض ادا کرتے رہے۔

فلاحی، سماجی اور تعمیراتی کاموں کی وجہ سے عوام اور فوج کے درمیان محبت اور اعتماد کے رشتے قائم ہوئے۔ عوام کو یقین ہے کہ آفت اور مصیبت کے وقت پاک فوج کے جوان ان کی مدد کو پہنچیں گے۔ پاکستان کے عوام فوج کے فلاحی کردار سے مطمئن ہیں۔ فوج تعلیم کی شرح میں اضافہ کرنے کے لیے بھی انقلابی کردار ادا کر سکتی ہے۔ مگر فوج کو تعلیم و تدریس کی مہم میں آج تک شریک نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عرشی طبقے نہیں چاہتے کہ پاکستان کے عوام تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر باشعور ہو جائیں اور عرشی طبقہ کے لیے ان پر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرنا ممکن نہ رہے۔

باب 16

پاک بھارت عسکری و جمہوری موازنہ

آبادی کے لحاظ سے بھارت کا شمار دنیا کے بڑے ملکوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان دنیا کا دوسرا بڑا مسلمان ملک ہے۔ بھارت اور پاکستان دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ انگریز دور میں بھارت کے اہم فیصلے لندن میں کیے جاتے تھے۔ بھارت کی فوج برطانوی سیکریٹری آف سٹیٹ کے ماتحت تھی۔ سول سرونٹ اور فوج کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہوتا تو اس کا فیصلہ لندن کا ہوم ڈیپارٹمنٹ کرتا۔ گورنر لارڈ کرزن اور جنرل کچنر میں تنازعہ ہوا تو لندن نے جنرل کچنر کے حق میں فیصلہ دیا اور لارڈ کرزن مستعفی ہو گئے۔ برطانیہ نے بھارتی افواج کو سول اُمور اور سیاست سے الگ تھلگ رکھا۔

1895ء میں ممبئی، کولکتہ اور مدراس پریذیڈینسی کی افواج کو متحد کر کے ایک کمانڈر انچیف کے ماتحت کر دیا گیا۔ فوج امن و امان کو قائم رکھنے اور آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے پولیس فورس سے تعاون کرتی۔ متحدہ ہندوستان کے تمام اہم فیصلے فوج کے جرنیلوں کی مشاورت سے ہوتے۔ انڈین آرمی ایکٹ کے تحت فوج کے افسر کو کسی بھی شخص کو گرفتار کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

آزادی کے بعد بھارت کے سیاسی لیڈروں نے سول سرونٹس کے اشتراک سے ایڈمنسٹریشن اور تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلیاں کر کے فیصلہ سازی میں فوج کے کردار کو کم کر دیا۔ [1] بھارت کے سیاست دان قوم پرست اور آزادی کے ہیرو تھے۔ عوام کی طاقت ان کے ساتھ تھی لہٰذا فوج نے اپنے اختیارات میں کمی پر کوئی مزاحمت نہ کی۔ 15 اگست 1947ء کو بھارتی افواج میں کمانڈر انچیف کا منصب ختم کر دیا گیا۔ نیوی اور ایئر فورس کمانڈر انچیف کے ماتحت تھے۔ انقلابی نوعیت کے اس فیصلے کے بعد بری، بحری اور فضائی افواج وزیر دفاع کے ماتحت ہو گئیں۔ تینوں سروس چیفس پیشہ وارانہ اُمور کے بارے میں اجتماعی طور پر انڈین گورنمنٹ کے مشیر کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ [2] سویلین حکومت کے لیے فوج واحد خطرہ تھی۔ بھارت کے لیڈروں نے اولین ترجیح کے طور پر کمانڈر انچیف کی اتھارٹی ختم کر کے اس خطرے کو ٹال دیا۔ پاکستان میں 1972ء میں بھٹو نے فوج کے سٹرکچر میں تبدیلی کی مگر اس وقت تک بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے

[1] سٹیفن کوہن "The Indian Army" صفحہ 171

[2] سٹیفن کوہن "The Indian Army" صفحہ 171

بہہ چکا تھا۔ برائی کو جڑ سے ختم کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان کے بانی لیڈر فوج کو سول حکومت کے تابع نہ کر سکے۔ بھارت کی دفاعی طاقت پاکستان کے مقابلے میں زیادہ تھی لہٰذا بھارت کو اپنی آزادی اور سلامتی کے بارے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ پاکستان ایک کمزور ملک تھا اس کے پاس کوئی ریاستی ڈھانچہ نہیں تھا۔ ہجرت کے دوران فسادات اور کشمیر کی جنگ کی بناء پر سول حکومت کو فوج پر غیر معمولی انحصار کرنا پڑا۔ پاکستان کو بھارت سے مسلسل خطرہ تھا لہٰذا سکیورٹی کا مسئلہ پاکستان کی پہلی ترجیح بن گیا۔ فوج اور سول بیورو کریسی پاکستان کے اقتدار پر حادی ہوگئیں۔ عائشہ جلال کے مطابق:

"India inherited the colonial state's central government apparatus and an industrial infrastructure which for all its weaknesses, was better d eveloped than in areas constituting Pakistan".[3]

ترجمہ: ''بھارت کو نوآبادیاتی ریاست کا مرکزی حکومتی ڈھانچہ اور صنعتی انفراسٹرکچر ورثے میں ملا جو اس کی تمام خامیوں کے باوجود ان علاقوں سے ترقی یافتہ تھا جو پاکستان کے حصے میں آئے۔''[3]

شمال مغربی ہندوستان کے علاقے جو پاکستان میں شامل ہوئے ان میں سیاسی و جمہوری سرگرمیاں اور عوام کی اقتدار میں شراکت بہت کم تھی۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں امن وامان کو قائم رکھنے کے لیے ایمرجنسی کے قوانین نافذ کیے اور پولیس کو بااختیار بنایا۔ افغانستان اور سینٹرل ایشیا کے ممالک کے خوف کی وجہ سے ان علاقوں کو آمرانہ کنٹرول میں رکھا گیا۔ سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد ہندوستان پر انگریز حکومت قائم ہونے کے سو سال بعد برطانوی سلطنت میں شامل ہوئے لہٰذا بھارتی علاقوں کی طرح پاکستانی علاقوں میں ایڈمنسٹریشن کا نظام مستحکم نہ ہوسکا۔[4]

سٹیفن کوہن بھارت اور پاکستان کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"Yet there were factors that led the two in different directions. Jawaharlal Nehru had been the brain and voice of the Congress Party in foreign affairs, and when independence came he was able to translate his ideas of non-alignment, socialist orientation, and 'Asianness' into policy. The Muslim League, on the other hand, had had little foreign policy beyond support for Islam, and even after independence, 'politically aware Pakistanis did have certain attitudes, of course, but these were vague and hardly constituted a basis for a foreign policy'."[5]

---

[3] عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 5

[4] آئن ٹالبوٹ "Pakistan A Modern History" صفحہ 55

ترجمہ: ''کچھ ایسے عوامل تھے جنہوں نے دونوں (بھارت، پاکستان) کا رخ مختلف سمتوں کی جانب موڑ دیا۔ نہرو خارجہ اُمور میں کانگریس پارٹی کا دماغ اور اس کی آواز رہے تھے اور جب آزادی ملی تو وہ اپنے غیر جانبداری، سوشلزم اور ایشین ازم کے تصورات کو پالیسی شکل دینے میں کامیاب ہوگئے۔ دوسری جانب مسلم لیگ کی کوئی خارجہ پالیسی نہیں تھی اور وہ صرف اسلام کا نام لیتی تھی۔ آزادی کے بعد بھی سیاسی طور پر باشعور پاکستانی افراد کے کچھ رجحانات تھے مگر وہ مبہم تھے اور ان کی بنیاد پر خارجہ پالیسی تشکیل دینا مشکل تھا۔''[5]

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم اور لیاقت علی خان کو ریاستی ادارے تشکیل دینے کا مناسب موقع نہ ملا۔ نہرو طویل عرصہ تک بھارت کے غیر متنازعہ لیڈر کی حیثیت سے اقتدار میں رہے اور انہوں نے بھارت کو ایک مضبوط جمہوری سیاسی نظام دیا۔ کانگریس پرانی جماعت تھی جو ہندو اکثریتی علاقوں میں منظم اور فعال تھی۔ جبکہ مسلم لیگ کی مسلم اکثریتی علاقوں میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔ بھارت نے انگریز کا وائسرائیگل نظام ترک کر دیا، پاکستان نے اس نظام کو جاری رکھا اور سول سرونٹس کو وسیع اختیارات دیئے۔ قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے سول سرونٹس سے براہِ راست رابطہ رکھتے اور وزیروں کو نظر انداز کر دیتے حالانکہ وہ وزارتوں کے انچارج تھے۔[6] یہ رائے مکمل طور پر درست نہیں ہے قائداعظم صوبائی گورنروں سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے جو ان کی آئینی ذمہ داری تھی۔

بھارت میں مرکزی اور قومی سیاسی قائدین (گاندھی، اندرا، راجیو) کے قتل، پاک بھارت دو بڑی جنگوں (1965، 1971)، ایمرجنسی کے نفاذ کے باوجود جمہوری سسٹم چلتا رہا اور ٹرانسفر آف پاور پُرامن طریقے سے ہوتا رہا۔ پاکستان میں ابھی تک جمہوری نظام جڑ نہیں پکڑ سکا۔ پاکستان میں 1950 میں پہلی بار صوبوں کو ترقیاتی کاموں کے لیے ایک کروڑ روپے سالانہ کی وفاقی گرانٹ دی گئی جبکہ بھارت میں آزادی کے بعد سے صوبوں کو 25 سے 30 کروڑ روپے سالانہ گرانٹ ان ایڈ (grant-in-aid) کے طور پر دیئے جاتے رہے۔[7] بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کے دوران بھارتی افواج کے آرمی چیف کو اقتدار سنبھالنے کی پیش کش کی تو اس نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور سیاست میں مداخلت سے انکار کر دیا۔[8]

بھارت کے کم وبیش سب لیڈروں نے بھارت میں مرکزیت کو ایک عقیدے اور نظریے کے طور پر اہمیت دی اور بھارت کو ایک ماڈرن صنعتی مستحکم ریاست بنانے پر توجہ دی تا کہ بھارت کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوسکے۔ بھارت میں قانون سازی پارلیمنٹ میں بحث مباحثہ کی بجائے آرڈی نینس جاری

---

[5] سٹیفن کوہن "The Indian Army" صفحہ 170

[6] سلیگ ایس ہیریسن "India And Pakistan Fifty Years"

[7] عائشہ جلال "Democracy and Authoritarianism in South Asia" صفحہ 22

[8] عائشہ صدیقہ آغا روزنامہ ڈان 8 جون 2006

کر کے کی گئی اور بعد میں ان کی پارلیمنٹ سے توثیق کرائی گئی۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے مگر ابھی تک زراعت میں خودکفیل نہیں ہوسکا۔ ایوب خان نے صنعتی ترقی پر توجہ دی مگر پاکستان کے حکمران پاکستان کو ترقی یافتہ صنعتی اور زرعی ملک بنانے میں ناکام رہے۔

بھارت کے لیڈروں نے ابتدائی دور میں جاگیرداری اور ریاستوں میں راجوں، مہاراجوں اور شہزادوں کو ختم کر دیا۔ کانگریس ایک سوشلسٹ جماعت تھی، اس کے لیڈروں کو پورا ادراک تھا کہ جاگیردار اور ریاستوں کے نواب اور شہزادے اُن کی سیاسی حیثیت کے لیے چیلنج بن سکتے ہیں اور جمہوری کلچر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ نہرو نے جاگیرداری ختم کر کے زمینیں مزارعوں اور چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیں۔ کسان انتخابات میں ان کے ووٹ بینک میں اضافے کا سبب بنے۔ پال۔آر۔ براس (Paul R . Brass) ایک آرٹیکل میں جاگیرداری کے خاتمے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"This was done for a number of Reasons. First, landlords and princes had been the principal collaborators with the British in ruling India and could, therefore, be attacked fairly and revengefully as enemies of both the nation and the people." [8]

ترجمہ: ''ایسا کئی وجوہات کی بناء پر کیا گیا۔ پہلی یہ کہ جاگیردار اور شہزادے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے برطانیہ کے بڑے اتحادی رہے تھے لہٰذا عوام اور قوم کے دونوں دشمنوں کی حیثیت سے ان پر مناسب اور منتقمانہ حملہ ہوسکتا تھا۔'' [8]

پاکستان میں انگریز کے اتحادیوں عوام دشمن جاگیرداروں کو ختم کرنے کی بجائے انہیں سیاسی طور پر مضبوط کیا گیا۔ جاگیردار پہلے انگریز کے اتحادی رہے تھے، انگریز کے جانے کے بعد وہ فوج اور بیوروکریسی کے اتحادی بن گئے۔ پاکستان کی اسمبلیوں میں جاگیردارانہ پس منظر کے حامل افراد ہی منتخب ہو کر بالادستی اختیار کر لیتے ہیں۔ جاگیرداری نظام کی موجودگی میں جمہوری کلچر فروغ نہیں پا سکتا۔

بھارت میں کبھی کسی جرنیل نے وفاقی کابینہ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ بھارتی افواج کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بھارت کے سیاست دان خامیوں اور خرابیوں کے باوجود عوام کو سڑکوں پر لا سکتے ہیں۔ لہٰذا بھارت کی فوج اقتدار پر قبضہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کر سکتی۔ اس کو علم ہے کہ بھارت کے عوام سیاست میں فوج کی مداخلت کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ پاکستان میں آرمی چیف جنرل ایوب 1954ء میں وزیر دفاع کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے۔ سیاست دان اور سیاسی جماعتیں کمزور ہیں، عوام کو باہر نکالنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ عوام بھی فوجی مداخلت کو قبول کر لیتے ہیں۔ عائشہ جلال اور حمزہ علوی کا خیال ہے کہ پاکستان میں غیر معمولی طور پر طاقتور اور ترقی یافتہ ملٹری اور بیوروکریسی کے اداروں نے انگریز کے

---

[8] سلیگ ایس ہیریسن "India And Pakistan Fifty Years" صفحہ 36

سسٹم کو جاری رکھا اور عوامی نمائندگی اور شراکت کی بجائے امن و امان پر زیادہ توجہ دی۔ [9]

بھارت ایک سیکولر ریاست ہے وہاں پر مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا بھارت میں حکمرانوں کو ایک جمہوری سیاسی نظام وضع کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پاکستان میں مذہب نمبر ون مسئلہ رہا اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ لہٰذا ان کوششوں کی وجہ سے مختلف نوعیت کے تضادات پیدا ہو گئے اور صحیح معنوں میں ایک فنکشنل ریاست قائم نہ ہو سکی۔ پاکستان کا جمہوری ریاستی نظام تضادات کا شکار ہو گیا۔

بھارت نے اپنا آئین 1949ء میں تشکیل دے دیا اور بھارت کے تمام ادارے آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے کامیابی سے چلتے رہے۔ پاکستان کا پہلا آئین 1956 میں بنا جسے ایوب خان نے 1958ء میں توڑ دیا اور 1962 میں اپنا آئین نافذ کر دیا جو 1968ء میں جنرل یحییٰ نے ختم کر دیا۔ 1973ء میں پاکستان کا پہلا متفقہ آئین تشکیل پایا جو کئی بار فوجی بوٹوں تلے روندا گیا۔ ابتداء میں آئین کے فقدان اور بعد میں آئین کی پامالی کی بناء پر جمہوری ادارے مستحکم نہ ہو سکے۔

بھارت کا معاشرہ گوناں گوں تضادات کا شکار ہے۔ وہاں پر علاقائی، لسانی، نسلی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی تضادات موجود ہیں۔ کرپشن بھی عام ہے۔ ہندو مسلم فسادات بھی ہوتے رہتے ہیں مگر ان تضادات کے باوجود جمہوری نظام نے بھارت کے اتحاد، یک جہتی اور قومی سلامتی کو محفوظ بنا رکھا ہے۔ بھارت میں انتخابی عمل کا ایک صاف اور شفاف نظام موجود ہے۔ انتخابات ایک آزاد، با اختیار الیکشن کمیشن کی نگرانی میں ہوتے ہیں لہٰذا بھارت کے عوام کا انتخابات اور جمہوریت پر اعتماد بڑھا ہے۔ بھارت کے پہلے عام انتخابات (1951) میں ووٹ کی شرح 45.7 تھی جو بڑھ کر 55 فیصد ہو گئی ہے۔ پاکستان میں صاف اور شفاف انتخابی نظام وضع نہیں کیا جا سکا۔ پاکستان کے پہلے عام انتخابات (1970) میں ووٹوں کی شرح 63 فیصد تھی جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور (1997) 25 فیصد رہ گئی۔ انتخابات اور جمہوریت پر عوام کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ فوج کی خفیہ ایجنسیاں ''مثبت نتائج'' حاصل کرنے کے لیے انتخابات میں مداخلت کرتی رہیں۔

بھارت کی عدلیہ مشکلات کے باوجود اپنا آئینی کردار ادا کرنے میں کامیاب رہی۔ عدلیہ نے بھارت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ اور وزیراعلیٰ لالو پرشاد کو کرپشن کے الزام میں سزائیں سنائیں، پاکستان میں اس نوعیت کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ بھارت کی سپریم کورٹ نے پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت سے منظور کی گئی 40 آئینی ترامیم کو آئین سے متصادم قرار دے کر ختم کر دیا۔ حکومتوں نے عدلیہ کے فیصلوں کو تسلیم کیا اور کبھی عدلیہ سے محاذ آرائی نہیں کی البتہ عدلیہ کے اختیارات کم کرنے کی کوششیں ضرور ہوتی رہیں۔ پاکستان کی عدلیہ اپنی آزادی کا تحفظ نہ کر سکی اور اپنی کمزوریوں کی بناء پر اکثر اوقات حکمرانوں کی تابع

---

[9] عائشہ جلال، حمزہ علوی Class and State

حوالہ گردیزی اینڈ رشید "Pakistan the roots of dictatorship" صفحہ 93-40

فرمان رہی۔

بھارت میں ہندوؤں کی واضح اکثریت ہے اس لیے اسے ہندو انڈیا اور ہندوستان بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی بالادستی کے باوجود 1946 میں نہرو کی موجودگی میں مولانا ابوالکلام آزاد آل انڈیا کانگریس کے صدر بنے اسے کانگریس کا سیکولر جمہوری انداز ہی کہا جائے گا۔ 2005 میں بھارت کے صدر مسلمان، وزیراعظم سکھ، آرمی چیف سکھ، کانگریس کی صدر سونیا کیتھولک کرسچین ہیں جو جمہوری سیکولر نظام کا حسن اور معجزہ ہے۔ پاکستان کے آئین کے مطابق کوئی غیر مسلم صدر اور وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ یہ تصور جاگیردارانہ، غلامانہ اور غیر جمہوری معاشرے کی علامت ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کو بلا امتیاز یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی اہلیت اور صلاحیت کی بناء پر اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکے۔

بھارت کے جنرل اروڑہ نے 1971 کی پاک بھارت جنگ کے دوران شاندار پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس جنگ میں بھارت کا بہت کم جانی و مالی نقصان ہوا اور جنرل اروڑہ نے پاکستان کے نوے ہزار فوجی جوانوں کو جنگی قیدی بنا لیا اور ڈھاکہ فتح کر لیا۔ اس عظیم فتح کے باوجود جنرل اروڑہ نے اپنی ملازمت میں توسیع نہ مانگی اور نہ ہی حکومت نے انہیں توسیع دینے کے بارے میں سوچا۔ اروڑہ ملازمت ختم ہونے پر خاموشی سے ریٹائر ہو کر گھر چلے گئے۔ پاکستان کے جرنیل جنگیں ہارنے کے باوجود ستارۂ جرأت اور ستارۂ امتیاز بھی حاصل کرتے رہے اور ان کی ملازمت میں توسیع بھی ہوتی رہی۔ جرنیل ریٹائر ہونے کے بعد صوبوں کے گورنر اور کارپوریشنوں کے چیئرمین بھی فائز ہوتے رہے۔

آزادی سے پہلے 1947 تک انڈین گورنمنٹ کا سیکریٹری لیفٹیننٹ جنرل سے لوئر رینک میں ہوتا تھا۔ 1947 کے بعد اس کو فل جنرل کے برابر رینک (rank) دیا گیا۔ ریاست کا چیف سیکرٹری بریگیڈیئر کے برابر ہوتا تھا اسے 1948 میں میجر جنرل کا رینک دیا گیا۔ آرمی چیف کا رینک سپریم کورٹ کے ججوں کے برابر ہوتا تھا اور اسے ہوم سٹیٹ کے علاوہ دوسری ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے سینئر سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اس کا عہدہ وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل سے بھی سینئر ہوتا تھا۔ 1951ء میں آرمی چیف کا رینک سپریم کورٹ کے ججوں سے جونیئر کر دیا گیا اور 1963ء میں وہ تمام ریاستوں کے چیف منسٹرز سے بھی جونیئر رینک میں آ گیا۔ اسی طرح آرمی چیف کو سیکریٹری جنرل اور کیبنٹ سیکریٹری سے بھی جونیئر قرار دیا گیا۔ فوج مکمل طور پر سویلین بالادستی میں آ گئی۔ (11)

آزادی کے بعد پاکستان میں کمانڈر انچیف کا رینک پروٹوکول کے مطابق سیکرٹری ڈیفنس کے بعد آتا تھا۔ 1973 کے آئین میں فوج کے سٹرکچر میں تبدیلیاں کی گئیں اور پروٹوکول کے مطابق آرمی چیف کا رینک صدر، وزیراعظم، وفاقی وزراء، صوبائی گورنر اور صوبائی وزرائے اعلیٰ کے بعد رکھا گیا۔

بھارت خطے میں فوجی بالادستی ضرور قائم رکھنا چاہتا ہے مگر عالمی سطح پر ممتاز مقام حاصل کرنے کے لیے

(11) سٹیفن کوہن "The Indian Army" صفحہ 172

وہ ورلڈ پاور بننے کا خواہش مند بھی ہے لہٰذا چین اور پاکستان سے جنگ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ پاک فوج کے جرنیل نیشنل سیکیورٹی کو نمبرون ترجیح قرار دیتے ہیں تا کہ پاکستان پر ان کی بالادستی قائم رہے۔

بھارت کے آرمی چیف جنرل وِج نے بی بی سی ٹیلی ویژن کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے پاک فوج کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

سوال: کیا بھارت کی سلامتی کی خاطر آپ اپنے ہمسایہ ملک پاکستان کے جرنیلوں کے ذہنی رجحانات پر نظر رکھتے ہیں؟

جواب: ہم نے پاکستان کے جرنیلوں کے ذہنی رجحانات کا دھیان رکھنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ان دنوں ان کے ذہن میں رئیل اسٹیٹ (پراپرٹی) کے کاروبار کے سوا اور کچھ نہیں۔

بھارت اور پاکستان میں ایک قدر مشترک ہے دونوں ملکوں کے عوام کی اکثریت غریب اور بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ بھارت میں بڑے سیاست دان اور بیورو کریٹس خوشحال ہیں جبکہ پاکستان میں جاگیردار، تاجر، صنعت کار، سینئر فوجی افسر، بیورو کریٹس اور بڑے سیاست دان عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بھارت میں سیاست دان اور بیورو کریٹس اقتدار پر قابض ہیں۔ پاکستان میں جرنیلوں اور بیورو کریٹس کی حکومت اور ریاستی وسائل پر بالادستی ہے۔

آزادی کے بعد پاکستان میں شرح تعلیم 16.4 فیصد اور بھارت میں تعلیم کی شرح 18.3 فیصد تھی۔ بھارت کی آبادی پاکستان کی نسبت زیادہ تھی۔ 2003 تک بھارت کی تعلیمی شرح 65.3 تک پہنچ گئی مگر پاکستان ابھی تک 40 فیصد پر کھڑا ہے۔

بھارت میں 1947ء سے 2005 تک اٹھاون سالوں کے دوران 15 وزیراعظم اور 19 آرمی چیف بنے جو بھارت کے جمہوری اور عسکری اداروں کے تسلسل اور استحکام کا مظہر ہے۔ پاکستان میں 34 سالوں کے دوران 21 وزیراعظم اور 58 سالوں میں 13 آرمی چیف بنے۔ صدر ایوب، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے اقتدار کے 24 سالوں میں کوئی وزیراعظم نامزد نہ کیا گیا اور پاکستان صدارتی نظام کے تحت چلتا رہا۔ اگر پاکستان کی فوج کے آرمی چیف ریٹائرمنٹ کی عمر کے مطابق مستعفی ہوتے رہتے تو ان کی تعداد 20 کے قریب ہوتی۔ اسی طرح اگر وزرائے اعظم اپنی آئینی مدت پوری کرتے تو ان کی تعداد 58 سالوں کے بعد 12 ہوتی۔

اعتزاز احسن لکھتے ہیں:۔

"Pakistan had retained the structure of the colonial state from its inception. Lacking an indigenous bourgeoisie, dominated by a feudal elite totally dependent upon the colonial bureaucracy, deprived of well structured programme-oriented and duly encadred political parties and without a judiciary

which would jealously protect civil authority and the citizen rights, Pakistan saw a gradual choking of the democratic spirit from its early days."[11]

ترجمہ: ''پاکستان نے وجود میں آنے کے بعد نو آبادیاتی ریاستی کلچر کو اپنا لیا۔ مقامی متوسط طبقے کا فقدان تھا، جاگیردار طبقہ حاوی تھا جو نو آبادیاتی بیوروکریسی پر انحصار کر رہے تھے۔ سیاسی جماعتیں منظم نہیں تھیں ان کے پاس کوئی پارٹی کاڈر اور پروگرام نہیں تھا ایسی عدلیہ بھی موجود نہ تھی جو گرم جوشی کے ساتھ سول اتھارٹی اور شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرتی۔ پاکستان کو ابتدا سے ہی جمہوری روح کو پابند دیکھنا پڑا۔''[11]

اعتزاز احسن کے شریک مصنف میگند ڈیسائی ہندوستانی تجربے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"The key to its (Indian democracy's) survival has been its inclusiveness. The revolutionary decision of the Constituent Assembly to adopt the universal adult franchise has beeped Indian society to unleash the demands for inclusion from lower and backward castes and Dalits, and from marginalised groups everywhere in the country."[12]

ترجمہ: ''بھارتی جمہوریت کی بقا کا راز شراکت داری میں پوشیدہ ہے۔ دستور ساز اسمبلی نے ابتداء میں ہی بالغ رائے دہی کے عالمی اصول کو تسلیم کر کے انقلابی فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے بھارتی سماج کے نچلے پسماندہ اور محروم ذاتوں، گروپوں اور طبقوں کو سیاست اور حکومت میں شراکت کا موقع ملا۔''[12]

بھارتی بحریہ کے چیف ایڈمرل بھگوت (Bhagwat) نے بھارتی روایات کے برعکس اپنا وائس چیف ڈیفنس منسٹری کے مشورے کے بغیر نامزد کرنے کی کوشش کی تو بی جے پی کی حکومت نے اسے برطرف کر دیا اور فوج کے اندر بونا پارٹ ازم کو پروان نہ چڑھنے دیا۔[13]

اگر ہم تعصب کی عینک اُتار دیں تو اپنے ہمسائے بھارت کے عسکری و جمہوری تجربات سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

---

[11] اعتزاز احسن "Divided by Democracy" صفحہ 141

[12] Meghnad Desai "Divided by Democracy" صفحہ 26

[13] عائشہ صدیقہ آغا روزنامہ ڈان 8 جون 2006

باب 17

تاریخ کی عدالت کا فیصلہ

مؤرخ متفق ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے 1946ء کے انتخابات میں اپنا ووٹ مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں استعمال کیا اور پاکستان عوامی رائے کی طاقت سے معرضِ وجود میں آیا۔ قائداعظم عوامی مینڈیٹ کی بناء پر ہی مسلمانوں کے لیے الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ عوام اور سیاست دانوں نے مل کر سیاسی اور جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان حاصل کیا۔ تحریک پاکستان میں فوج، سول سرونٹس اور مذہبی انتہا پسندوں کا کوئی کردار نہیں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سینئر فوجی افسر، بیوروکریٹس اور مذہبی گروپ پاکستان کے اقتدار پر قابض ہونے کے لیے متحرک اور فعال ہو گئے۔ قائداعظم نے اپنے خونِ جگر سے عوام کے دلوں میں اُمید کی جو شمع روشن کی تھی پاکستان کے حکمرانوں نے اسے مفاد پرستی کی پھونکوں سے بجھا دیا۔

؎ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے

جرنیلوں اور سیاست دانوں میں سے پاکستان کو کس نے ناکام کیا؟ ایم ایس کوریجو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"The answer is that the civilians did not fail Pakistan, the army did. The civilians made mistakes which could be corrected; the army committed blunders, which caused permanent damage. Civilians created this country, the army dismembered it. The civilians worked for peace, the generals were warmongers. Ayub fought 1965 war but failed to achieve its aims. Yahya fought 1971 war and Bhutto cleared the debris at Simla in 1972. Zia fought Afghan war and Junejo pacified it through the Geneva Accord with Russia. As a result of these wars, Pakistan stood crippled territorially, shattered politically, impoverished economically and shrank diplomatically."[1]

ترجمہ: ”جواب یہ ہے کہ سویلین نے نہیں بلکہ فوج نے پاکستان کو ناکام کیا۔ سویلین نے جو غلطیاں کیں ان کا ازالہ ہوسکتا تھا؛ آرمی نے فاش غلطیاں کیں جن سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ سویلین نے یہ ملک تخلیق کیا، آرمی نے اسے دولخت کیا۔ سویلین نے امن کے لیے کام کیا جبکہ جرنیل جنگ جو نکلے۔ ایوب نے 1965ء کی جنگ لڑی اور کوئی مقصد حاصل نہ کیا۔ یحیٰی نے 1971 کی جنگ لڑی اور بھٹو نے 1972 میں شملہ میں اس کا ملبہ صاف کیا۔ ضیاء نے افغان جنگ لڑی اور جونیجو نے روس کے ساتھ جنیوا معاہدہ کر کے امن بحال کیا۔ ان جنگوں کے نتیجے میں پاکستان علاقائی طور پر اپاہج، سیاسی طور پر پاش پاش، معاشی طور پر پسماندہ ہوگیا اور سفارتی سطح پر محدود ہوگیا۔“[1]

مشرف نے کارگل کی جنگ لڑی، نواز شریف نے اسے سفارت کاری سے سنبھالا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوامی نمائندوں نے مخصوص حالات کے پیشِ نظر سول ملٹری اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے سیاسی بلوغت کا مظاہرہ کیا اور اختلافات کے باوجود 1956 کے آئین پر متفق ہوگئے۔ 1950 کی دہائی کے معروضی حالات میں 1956ء کا آئین سیاسی معجزے سے کم نہیں تھا اور پاکستان کے اتحاد اور یک جہتی کی علامت تھا جس کے تحت فروری 1959 میں انتخابات ہونے والے تھے۔ مگر اکتوبر 1958 میں جنرل ایوب نے 1956ء کے آئین کو ختم کر کے اور مارشل لاء نافذ کر کے پاکستان کی بنیادوں کو ہی ہلا کر رکھ دیا اور پھر اس کے بعد پاکستان کبھی پٹڑی پر نہ چڑھ سکا۔ ایوب نے آرمی چیف (1951) بننے کے بعد جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا اور 1958ء میں جمہوریت کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ بھارت کی ممتاز مصنفہ ارن دتی رائے (Arundhati Roy) کہتی ہیں:۔

> "I would say, yes (a bad democracy is better than a good dictatorship). Democarcy is not a given thing. It's something that needs to be nourished, improved, and made more sophisticated. I don't believe in absolutes, and maybe theoretically, it is possible for a dictatorship to be better than a bad democracy. But dictatorship is very fragile thing. It is not possible for one mind to understand millions of minds. No matter how inefficient, short-sighted and blundering, an elected government is always better than dictatorship."[2]

ترجمہ: ”میں کہوں گی ہاں (بڑی جمہوریت اچھی آمریت سے بہتر ہے)۔ جمہوریت کوئی متعین شے نہیں ہے۔ (جمہوریت) ایک ایسی چیز ہے جس کی نشوونما کرنے اور اسے بہتر بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اسے تراشا اور نکھارا جاتا ہے۔ میں قطعیت میں یقین نہیں رکھتی اور نظری طور پر ممکن

[1] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 212

ہوسکتا ہے کہ آمریت بڑی جمہوریت سے بہتر ہو۔ مگر آمریت ایک کمزور چیز ہے۔ ایک ذہن کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ لاکھوں ذہنوں کا ادراک کر سکے۔ ایک منتخب حکومت کتنی ہی نااہل، کوتاہ اندیش اور غلطیاں کرنے والی ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ڈکٹیٹرشپ سے بہتر ہوتی ہے۔“[2]

بھارت نے پاکستان پر اس وقت جنگ مسلط کی جب پاکستان پر جرنیل حکومت کر رہے تھے۔ ایوب (1965) اور یحیٰی (1971) میں اقتدار پر قابض تھے۔ فوج کی خفیہ ایجنسیاں پروپیگنڈہ کے زور پر عوام کو باور کرانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ پاکستان کے لیے جرنیلوں کے دورِ حکومت بہتر رہے اور جرنیل حکمرانوں کو عوام کا اعتماد حاصل رہا۔ یہ ایک افسانہ ہے اور حقیقت کے ساتھ اس تاثر کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاک فوج ایک اہم ترین قومی دفاعی ادارہ ہے۔ پاکستان کے عوام دفاعی ادارے سے جنگ نہیں کر سکتے۔ خفیہ ایجنسیوں کی حکمتِ عملی ناقص ہے لہٰذا ان کی رپورٹیں زمینی حقائق کی عکاسی نہیں کرتیں۔ ایوب ایجنسیوں کی رپورٹوں کی روشنی میں آپریشن جبرالٹر (کشمیر) اور آپریشن گرینڈ سلام میں اُلجھ پڑے اور پلان کے مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ یحیٰی نے ایجنسیوں کی رپورٹوں پر انحصار کیا جن میں تجزیہ پیش کیا گیا تھا کہ 1970 کے انتخابات میں کوئی سیاسی جماعت اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی اور یحیٰی طاقت کا محور رہیں گے۔ 1977 کے انتخابات میں بھی انتخابی نتائج ایجنسیوں کی رپورٹوں کے برعکس نکلے۔ ضیاء کا ریفرنڈم رپورٹوں کے مطابق عوامی تائید حاصل نہ کر سکا۔ 1988 میں غلام اسحاق خان خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں سے گمراہ ہوئے اور بے نظیر کا راستہ نہ روک سکے۔ 1989ء میں بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک (جو خفیہ ایجنسیوں کی ایماء) پر پیش کی گئی، کامیاب نہ ہوسکی۔ مگر منتخب جمہوری حکومت کمزور ہوئی۔ مشرف کا ریفرنڈم (2000) رپورٹوں کے مطابق عوام کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔ سابقہ تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں اور تجزیوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کوریجو کا تجزیہ قابلِ غور ہے۔

> "The survival of this country is closely linked with the revival of democracy, which flourishes best, with all its imperfections, when left to tend and grow by itself, uninterrupted, over a long period of time. The generals must leave it alone go back to the barracks. But how can the army leave the politics when:

- Its manpower had grown in size beyond the carrying capacity of the country.
- Its industrial empire has grown beyond limits to provide employment opportunities and welfare services to the vast

[2] ارن دتی رائے (Arun Dhati Roy) انٹرویو ڈان Books and Authors 8 ستمبر 2002

numbers of retired, unemployed, disabled services-men and their family members.

- Its extensive real estate, which provides lands and sources of wealth to the serving and retired defence personnel is constantly expanding.
- Its enormous budget consumes a major chunk of the revenues.
- Its appetite for war has grown in proportion to its size."[3]

ترجمہ: پاکستان کی سلامتی جمہوریت کی بحالی سے وابستہ ہے جو تمام خامیوں کے باوجود پروان چڑھتی رہتی ہے۔ جب کسی مداخلت کے بغیر طویل عرصہ تک جمہوریت کو فروغ پانے کا موقع دیا جائے۔ جرنیلوں کو چاہیے کہ وہ جمہوریت کو آزاد چھوڑ دیں اور بیرکوں میں چلیں جائیں۔ مگر فوج سیاست کو کیسے چھوڑ سکتی ہے جبکہ:۔

- اس کی افرادی قوت میں ملکی استطاعت سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
- اس کی صنعتی سلطنت بے حد پھیل چکی ہے جو لاکھوں ریٹائرڈ، بے روزگار اور معذور فوجیوں اور ان کے خاندانوں کو روزگار کے مواقع اور فلاح و بہبود کی سروسز مہیا کرتی ہے۔
- اس کی رئیل اسٹیٹ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جو حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو اراضی اور دولت کے ذرائع فراہم کرتی ہے۔
- ریونیو کا بڑا حصہ فوج کے بجٹ پر صرف ہوتا ہے۔
- اس کے بڑے سائز کی وجہ سے اس کی جنگی ہوس بھی بڑھتی جا رہی ہے"۔ [3]

فوج کے افسروں کی یہ رائے درست ہے کہ سیاست دان ہی انہیں سیاست میں ملوث ہونے کی دعوت دیتے ہیں مگر تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ آمروں کا ساتھ ہمیشہ ان سیاست دانوں نے دیا جن کو عوام نے انتخابات میں مسترد کر دیا یا جو صاف اور شفاف انتخابات میں منتخب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ 1977 میں شکست خوردہ عناصر ضیاء الحق سے مل گئے اور 2002 کے انتخابات میں سیاسی یتیم مشرف کے اتحادی بن گئے۔ عوام کے مقبول لیڈروں نے کبھی فوج کی سیاست میں مداخلت کو تسلیم نہیں کیا۔

جب جمہوری عمل ایک بار تعطل کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ضیاء نے 1977 میں جمہوری عمل کو روک دیا اور جب 1988 میں جمہوری عمل دوبارہ شروع ہوا تو 1999 تک مستحکم نہ ہو سکا۔ اس دوران پانچ اسمبلیاں اور حکومتیں ختم کی گئیں۔ عوام کا جمہوریت پر اعتماد ہی متزلزل ہوتا جا رہا ہے جو ایک بار پھر ملک کی سلامتی اور یک جہتی کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن

[3] ایم ایس کوریجو "Soldiers of Misfortune" صفحہ 222

سکتا ہے۔ جب فوج جنگ ہارتی ہے تو اسے ختم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اسے سویلین فوج میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ جب جمہوریت ناکام ہو جائے تو اسے مستحکم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جمہوریت کو ہی ختم کر دیا جائے تو ملک افراتفری، نفسانفسی اور مختلف نوعیت کے تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جرنیل پاکستان کو فلاحی (welfare) ریاست بنانے کی بجائے نیشنل سکیورٹی سٹیٹ بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

عائشہ جلال پاکستان کے جمہوری سیاسی مسائل کی ذمہ داری وائسرائیگل نظام پر ڈالتی ہیں جو قیامِ پاکستان کے فوری بعد نومولود ریاست پر نافذ کیا گیا۔

"This is almost universal belief among the political scientists, that perpetuation of so-called "Viceregal System" by the founding father is at the root of the subsequent ills in the Pakistan's political system."[4]

ترجمہ: سیاست کے ماہرین کا یونیورسل اعتقاد ہے کہ پاکستان کے بانی بزرگوں نے نام نہاد وائسرائیگل نظام کو مستحکم کیا جو مستقبل میں پاکستان کے سیاسی نظام میں در آنے والی خرابیوں کا سبب بنا۔"[4]

ایک میجر جنرل جو عسکری ٹریننگ کے انچارج رہے کہتے ہیں:۔

"ہم میرٹ پر ملازمت اور پروموشن حاصل کرتے ہیں۔ ہم معیاری سکولوں میں سخت قسم کے امتحانات پاس کرتے ہیں اور ہم میں سے بہترین افراد ہی اعلیٰ رینک حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔" جبکہ سویلین کے لیے پبلک آفس حاصل کرنے کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہوتی۔ [5]

فوجی افسر نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ قومی مفاد کا بہتر تحفظ کر سکتے ہیں اور عالمی تعلقات کی آگہی اور داخلہ حکمت عملی میں بھی سویلین سے بہتر ادراک رکھتے ہیں۔ [6]

سابق آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کہتے ہیں۔

"The only Pakistan army chief ever to voluntarily resign from his position, Jehangir Karamat, acknowledges that the army has been assertive and 'interventionist' but attributes this tendency to historical circumstances. Defending his service, he has argued that the army has a better understanding of its role than do civilians: 'Since 1988. . . every army chief has tried to make the system work and to somehow keep democracy afloat and to encourage the governments to

[4] عائشہ جلال "State of Martial Rule" صفحہ 62
حوالہ خالد بن سعید "Pakistan Formative Phase"
[5] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 126
[6] سٹیفن کوہن "The Idea of Pakistan" صفحہ 127

complete their tenures.' With the exception of Benazir, Karamat attests, all recent politicians failed to 'work' the institutional system effectively because they lacked expertise and self-confidence and had a 'fear of being dominated by the military.' (7)

ترجمہ: ''جنرل جہانگیر کرامت، واحد پاکستانی آرمی چیف ہیں جو اپنے منصب سے از خود مستعفی ہوئے، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ آرمی طاقت استعمال کرتی ہے اور مداخلت کرتی ہے مگر حالات اس کو مجبور کرتے ہیں۔ فوج کا دفاع کرتے ہوئے جہانگیر نے کہا کہ فوج کو سویلین کی نسبت اپنے کردار کا بہتر ادراک ہوتا ہے۔ 1988 سے ہر آرمی چیف نے کوشش کی کہ سسٹم چلتا رہے اور کسی طرح جمہوری عمل جاری رہے اور حکومتوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی کہ وہ اپنی مدت پوری کریں۔ کرامت کا یقین ہے کہ بے نظیر کے سوا تمام ماڈرن سیاست دان 'کام' چلانے اور اس سسٹم کو مؤثر طور پر جاری رکھنے میں ناکام رہے کیونکہ ان میں خود اعتمادی اور مہارت کی کمی تھی اور انہیں فوج کی بالادستی کا خوف تھا''۔ (7)

جنرل کے ایم عارف فوج کی مثبت خدمات کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ عارف کے مطابق 1947ء میں ناتجربہ کار فوجیوں نے پرموشن حاصل کر لی جس سے عدم ڈسپلن کے مسائل پیدا ہوئے اور 1951 میں راولپنڈی سازش کیس کے نام سے فوجی بغاوت ہوئی۔ جنرل ایوب کا کابینہ میں وزیر بننا فوج کی سیاست میں مداخلت کا سبب بنا۔ سٹاف افسروں کی مدت ملازمت میں توسیع سے محروم فوجی افسروں کے ذہنوں میں منفی اثرات پیدا ہوئے۔ سیاست دانوں نے سینئر فوجی افسروں سے تعلقات استوار کیے اور ان میں مہم جوئی کے خصائل پیدا ہوئے۔ عدلیہ نے فوجی حکومتوں کا ساتھ دیا اور فوجی حکومتوں کی وجہ سے جمہوریت پروان نہ چڑھ سکی۔ آئینی بحران پیدا ہوئے اور ادارے مستحکم نہ ہو سکے۔ (8)

فوجی اُمور کے ممتاز ماہر کلازوٹز (Clausewitz) کی رائے میں جنگ میں سویلین کنٹرول اور سیاسی غور و خوض انتہائی اہم ہوتا ہے اور محض فوجی نکتہ نظر کافی نہیں ہوتا۔ لہٰذا فوج کو یہ باور کرانا چاہیے کہ سویلین کنٹرول رائج عالمی اُصول ہے۔ اسی طرح سیاست دانوں کو بھی اپنی بصیرت اور عمل کا اظہار کرنا ہوگا۔ اے ایف کے اورنگ سکی لکھتے ہیں:۔

"It may take longer in underdeveloped countries than elsewhere for military leaders to realise that modernization of the army is possible only if the society modernizes as well, but when this realisation comes the army often tries to topple the old system and impose a new one more to its liking." (9)

(7) جہانگیر کرامت انٹرویو ہیرالڈ مارچ 2001 صفحہ 77

(8) حفیظ ملک "Pakistan Founders Aspirations and Today Realities" صفحہ 20

ترجمہ: ''پس ماندہ ملکوں میں کافی عرصہ درکار ہوگا کہ فوجی لیڈرز یہ احساس کر لیں کہ فوج کو جدید بنانے کے لیے لازمی شرط ہے کہ سوسائٹی بھی جدید بنے۔ جب تک یہ احساس پیدا نہیں ہوتا فوج پرانے سسٹم کو ختم کرتی رہے گی اور اپنی پسند کے مطابق نیا سسٹم نافذ کرتی رہے گی۔'' (9)

سٹیفن کوہن نے پاک فوج کے بارے میں دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔

"There are armies that guard their nation's borders, there are those concerned with protecting their own position in society, and there are those that defend a cause or an idea, but the Pakistan Army does all three." (10)

ترجمہ: کچھ فوجیں اپنی قومی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں جو سوسائٹی میں اپنی پوزیشن کے تحفظ کے بارے میں فکرمند ہوتی ہیں اور کچھ فوجیں کسی مقصد اور نظریے کا دفاع کرتی ہیں، لیکن پاکستان کی فوج یہ تینوں کام کرتی ہے۔'' (10)

پاکستان کے ابتدائی چند سالوں میں جب تک فوج کی کمان انگریز آرمی چیف کے ہاتھ میں رہی فوج سیاست سے الگ رہی اور سول بیوروکریٹس سیاست اور حکومت پر حاوی رہے۔ جنرل ایوب کے آرمی چیف (1951) بننے کے بعد فوج کا اثر و رسوخ سول اُمور میں بڑھا اور 1954 تک فوج اُمور مملکت پر حاوی ہوگئی۔ فوج اور بیوروکریسی ایک دوسرے کے اتحادی رہے ہیں اور سیاست دانوں کے بارے میں دونوں کا رویہ معاندانہ ہی رہا ہے۔ تسنیم صدیقی لکھتے ہیں:۔

"Howsoever they may decry Bonapartism, or dislike abrasiveness of military officers, the fact of the matter is that the erstwhile CSPs (now DMGs) have always found it comfortable to work with the men on the horseback including such variety as Yahya Khan and Zia ul Haq. Both groups belong to disciplined officer corps, both go to the same colleges, universities and training institutes, and both have similar social habits. And most importantly, both share utter contempt for the politicians who, according to them, are rabble-rousers, inept and corrupt. If they have any disagreement, it is about the piece of the pie, not about democracy or dictatorship." (11)

ترجمہ: ''وہ بے شک فوجی افسروں کے بوناپارٹ ازم کی مذمت کر سکتے ہیں یا ان کے کھردرے پن

(9) A.F.K. Orangski "The Stages of Political Development" صفحہ 52

(10) پرویز اقبال چیمہ "The Armed Forces of Pakistan" صفحہ 135

کو ناپسند کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے سی ایس پی اور اب ڈی ایم جی گروپ نے ہمیشہ گھوڑے پر سوار شخص کے ساتھ کام کرنے میں اطمینان محسوس کیا ہے بشمول یحیٰی اور ضیاء الحق (ملٹری اور بیوروکریسی) دونوں گروپ منظم افسر کور سے تعلق رکھتے ہیں، دونوں ایک ہی کالج، یونیورسٹی اور تربیتی ادارے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور دونوں کی سماجی عادات ایک جیسی ہیں۔ اور دونوں بہت موثر طور پر سیاست دانوں کی توہین کرتے ہیں جو ان کے نزدیک بازاری قائد، نکمے اور کرپٹ ہیں۔ ان دونوں گروپوں میں اختلاف اقتدار میں شیئر (حصہ) پر ہوتا ہے اور جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ پر ان کا اختلاف نہیں ہوتا۔ [11]

جاگیردار، قبائلی سردار اور سیاسی پیر جمہوریت کے دشمن ہیں اور فوجی حکومتوں کے فطری اتحادی رہے ہیں۔ جمہوریت آزادی کا نام ہے اور غلامی کو ختم کرتی ہے۔ اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے جاگیرداروں، قبائلی سرداروں کو فوج کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا یہ لوگ ہمیشہ سٹیٹس کو (status quo) کے حامی رہے ہیں۔ جاگیردار اور قبائلی سردار جمہوریت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہیں۔

صنعت کار، تاجر اور بزنس مین جمہوری حکومتوں کو پسند نہیں کرتے اور آمروں کا ساتھ بہ رضا و رغبت دیتے ہیں۔ سیاست دانوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ فوجی حکمران سیاست دانوں کی نسبت ان کے مسائل کا بہتر ادراک رکھتے ہیں۔ صنعت کار اور تاجر سیاست دانوں کو نااہل اور کرپٹ سمجھتے ہیں لہٰذا جمہوریت کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں آمریت معاشی پالیسیوں میں استحکام اور تسلسل پیدا کرتی ہے جبکہ جمہوری حکومت میں بدنظمی اور بدامنی ہوتی ہے۔

علماء، مشائخ اور پیر انگریز کے وفادار رہے۔ ان کی اکثریت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور بعد میں اسلامی آئین کا مطالبہ کرنے لگے۔ جنرل ایوب نے ان کو اہمیت نہ دی۔ یحیٰی نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ علماء، مشائخ اور پیر آمروں کی جانب سے بلائی گئی کانفرنس میں بڑی رغبت سے شامل ہوتے رہے ہیں۔ 1970 میں نظریہ پاکستان کا نعرہ پہلی بار سامنے آیا۔ یحیٰی کے دور میں جماعتِ اسلامی کو بھاری فنڈ دیئے گئے تاکہ وہ اسلامی ریاست اور نظریہ پاکستان کا پرچار کر کے لبرل اور سیکولر سیاسی جماعتوں کا راستہ روک سکے اور خطے میں سوشلزم کی لہر کا مقابلہ کر سکے۔ علماء اور مشائخ جمہوریت کے خلاف ہیں اور اسے مغربی تصور خیال کرتے ہیں۔

وکیل، ڈاکٹر، ٹیچر، پروفیسر، دانشور، ٹریڈ یونینسٹ جمہوریت کا ہراول دستہ ہوتے ہیں مگر تاریخ میں ان کا کردار سرد مہری کا شکار رہا ہے۔ پروفیشنل افراد انفرادی طور پر جمہوری تحریکوں میں ضرور شامل رہے مگر بحیثیت طبقہ یہ لوگ صرف ڈرائنگ روموں کے اندر چائے کے کپ پر جمہوری سیاست کی باتیں کرتے ہیں۔ احتجاج کرنے اور عملی سیاست میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دولت کی تلاش میں رہتے ہیں

[11] تسنیم صدیقی "The Drama of Democracy" ڈان میگزین 26 جون 2005

اور حال مست ہوتے ہیں۔ متوسط طبقہ اگر جمہوریت کے استحکام کے لیے فعال کردار ادا کرتا تو آج پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ متوسط طبقے کا سیاست سے الگ تھلگ رہنا افسوسناک اور سنگ دلانہ رویہ ہے۔

جمہوریت کی تاریخ میں سیاست دانوں کا کردار قابل رشک نہیں رہا۔ ان کا مقابلہ ایک منظم فوج اور بیوروکریسی سے تھا مگر انہوں نے اپنی سیاسی جماعتوں کو منظم اور فعال بنانے کی کوشش نہ کی۔ سیاست دان شارٹ ٹرم حکمت عملی کا شکار رہے، ان کی نظریں صرف عوام کے ووٹوں پر رہیں تاکہ وہ منتخب ہو کر اقتدار حاصل کر سکیں۔ مسلم لیگ پاکستان کی خالق جماعت تھی مگر وہ ایک تحریک ہی رہی اور منظم جماعت نہ بن سکی۔ کے۔ کے۔ عزیز لکھتے ہیں کہ قائداعظم نے مسلم لیگ میں نامزدگیاں کیں اور اسے بنیادی سطح پر منظم کرنے کی بجائے سر سکندر حیات جیسے نان مسلم لیگی سیاسی رہنماؤں کو اپنا ہمنوا بنانے پر زیادہ توجہ دی۔ پی پی پی ذوالفقار علی بھٹو کی مضبوط قیادت میں 76-1967 تک ایک منظم جماعت رہی جبکہ تاریخ کے ہر دور میں قومی سیاسی جماعتیں غیر منظم اور غیر فعال رہیں۔ [12]

سیاست دانوں نے اپنی جماعتوں کے اندر جمہوری کلچر کو فروغ نہ دیا لہٰذا جمہوریت کے بارے میں ان کے دعووں میں وزن اور اثر پیدا نہ ہو سکا۔ پاکستان میں اگر حقیقی معنوں میں ایک منظم اور فعال نظریاتی سیاسی جماعت موجود ہوتی تو فوج کبھی بار بار مداخلت کی جرأت نہ کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ فوج نے سیاسی جماعتوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے فائدہ اُٹھایا۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں جمہوریت کے لیے کبھی خلوصِ نیت سے متحد نہ ہو سکیں۔ سیاست دان ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر اُصولوں کا سودا کرتے رہے اور فوج کے جرنیلوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے۔ سیاسی جماعتیں غیر منظم اور غیر فعال ہیں، فوج کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فوج کی خفیہ ایجنسیاں مقبول سیاسی جماعتوں کو تقسیم کرنے اور کمزور کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ تسنیم صدیقی لکھتے ہیں:-

"What about the political leaders themselves? Generally speaking, they should stand firmly for democratic ideals and be ready to sacrifice everything for them. There should not be any meeting point between the politicians and military power. But what do we see in Pakistan? Is it not strange that at any given time a large number of political activists and their leaders remain ready to ride the bandwagon of dictatorship?

Things may have changed recently, but the history of Pakistan is replete with examples where even the leaders of mainstream political parties showed little faith in democratic principles. They simply used the slogan of democracy to have

[12] کے۔ کے۔ عزیز "Pakistan's Political Culture" صفحہ 70-78

access to power, and have seldom felt ashamed in accepting the military's terms for short-term gains."[13]

ترجمہ: ''سیاسی لیڈروں کے بارے میں کیا کہا جائے؟ ان کو جمہوری اُصولوں کے لیے مضبوطی کھڑے رہنا چاہیئے اور ان کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ سیا دانوں اور فوجی پاور کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر ہم پاکستان میں مشاہدہ کرتے ہیں؟ کیا یہ حیران کن نہیں کہ سیاسی جماعتوں کے متحرک کارکنوں کی کثیر تعدا اوراُن کے لیڈر ڈکٹیٹر شپ کی گاڑی پر سوار ہونے کے لیے ہروقت تیار رہتے ہیں؟ موجودہ دور میں کچھ تبدیلی آئی ہو مگر پاکستان کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ تو جماعتوں کے لیڈروں نے جمہوری اُصولوں کے ساتھ بہت کم وفاداری دکھائی۔ انہوں اقتدار تک پہنچنے کے لیے جمہوریت کو نعرے کے طور پر استعمال کیا اور اپنے قلیل المد مفادات کے لیے فوج کی شرائط کو تسلیم کرنے میں بہت کم عار محسوس کی۔'' [13]

پاکستان کے غریب عوام نے ہمیشہ جمہوریت کے لیے سیاست دانوں کا ساتھ دیا۔ پاکستان کی تاریخ جمہوریت کے لیے عوام کی بے مثال قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے جیلوں، شاہی قلعوں، کوڑوں، پھانسیوں اور جلا وطنی کی صعوبتیں برداشت کیں مگر ان کا مقدر نہ بدل سکا۔ عوام تھک ہار چکے ہیں ان سے اگر دھوکہ اور فریب نہ کیا جاتا اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا جاتا تو وہ جمہوریت کا دفاع کرتے۔ تسنیم صدیقی کہتے ہیں:۔

"The real Pakistan is its poor people who form the bulk of its population. Crushed by poverty, unemployment, inflation, injustice and poor civic services they find survival very difficult. They suffer frustration, disenchantment and alienation. But they have not lost hope. They keep on striving to improve their lives. They, however, realise that their country is being run by an oligarchy of feudals, industrialists, traders, mullahs and the civil-military bureaucracy, in which their interests are not taken into account. They can't expect anything better from this unholy alliance. Therefore, there is no option for them but to support the political process. Call it their commitment to democratic ideals, or give it whatever name, but the fact of the matter is that for them it is the only alternative, which can help them solve their problems. It also gives them hope for a better future. It is true that the current

---

[13] تسنیم صدیقی "The Drama of Democracy" ڈان میگزین 26 جون 2005

structure and leadership of most political parties do not reflect their aspirations either, but at least the process provides them some space."[14]

ترجمہ: ''اصل پاکستان اس کے عوام ہیں جنہوں نے پاکستان کو آباد کیا ہوا ہے۔ عوام غربت، بے روزگاری، افراطِ زر، ناانصافی کا شکار ہیں۔ انہیں بنیادی شہری سہولتیں حاصل نہیں ہیں اور ان کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔ وہ مایوسی، ناامیدی، لاوارثی کا شکار ہیں۔ مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ تاہم ان کو احساس ہے ان کے ملک پر جاگیردار، صنعت کار، تاجر، ملاء، اور سول ملٹری بیوروکریسی کی اُمرا شاہی قابض ہے اس سسٹم میں ان کے مفادات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ان کو اس ناپاک اتحاد سے کسی بہتری کی توقع نہیں ہے۔ مگر ان کے پاس سیاسی عمل میں شرکت کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کو جمہوریت سے عوام کی وابستگی کہیے یا کوئی اور نام دیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے جمہوریت ہی ان کے مسائل کا واحد حل ہے۔ جمہوری راستہ ہی ان میں اچھے مستقبل کی امید پیدا کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ موجودہ سیاسی ڈھانچہ اور اکثر سیاسی جماعتوں کی قیادت کوئی ایک بھی عوام کے احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کرتی مگر جمہوری عمل عوام کو ایک موقع فراہم کرتا ہے۔'' [14]

حسن عسکری رضوی کا کہنا درست ہے۔

''اگر سول ادارے فوج پر اپنی اہمیت جتانے کے اہل نہ ہوں تو اپنی خصوصیات کی بناء پر فوج سول اداروں پر غالب آجاتی ہے۔ لہٰذا یہی بیماری کی جڑ ہے جس کا علاج ہونا چاہیئے۔ جتنی جلدی ہمیں اس کا احساس ہو جائے اتنا ہی اُچھا ہوگا۔'' [15]

عدلیہ کا کردار (جس کی تفصیل الگ باب میں درج ہے) جمہوریت، جمہوری اداروں اور جمہوری حکومتوں کے بارے میں افسوسناک بلکہ شرمناک رہا ہے۔ عدلیہ نے ہمیشہ آمروں کا ساتھ دیا اور جمہوری حکومتوں کے خلاف فیصلے دیئے۔ اگر عدلیہ آئین کا دفاع کرتی اور منتخب حکومت کو سپورٹ کرتی تو فوج کے لیے سیاست اور حکومت پر قبضہ کرنا آسان نہ ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ عدلیہ نے ہر آمر کو آئینی اور اخلاقی جواز عطا کیا۔ عدلیہ کی تاریخ میں ایسے ججوں کی تعداد بہت کم رہی جنہوں نے اپنے حلف کی پاسداری کرتے ہوئے بلاخوف آئین اور قانون کے مطابق فیصلے دیئے۔ عدلیہ کے جج اگر آئین اور قانون کا تحفظ کرتے تو پاکستان کا قبلہ درست ہو جاتا اور ججوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی ملازمتوں کی قربانی دینا پڑتی۔ ملک اور قوم کے لیے یہ کوئی بڑی قیمت نہ تھی۔

---

[14] تسنیم صدیقی "The Drama of Democracy" ڈان میگزین 26 جون 2005

[15] سٹیفن کوہن ''پاکستان آرمی'' صفحہ 119

پاکستان کے بانی قائداعظم اپنے نظریۂ سیاست و جمہوریت کے مطابق ریاست کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد سول ملٹری بیوروکریٹس نے قائداعظم کے جمہوری وژن کے برعکس عسکری وژن کو ریاست کی بنیاد بنا دیا۔ قائد اور اقبال کو سول ملٹری مفادات کی روشنی میں پورٹریٹ کیا گیا تا کہ دونوں قائدین کے اصل نظریات عوام کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور عوام کنفیوژن کا شکار ہو جائیں۔ اس بنیادی تضاد کو حل کرنا ضروری ہے۔

حسین حقانی کا خیال ہے کہ فوج کے جرنیلوں نے منتخب حکومتوں کو آزادی سے اُمورِ مملکت چلانے کا موقع نہ دیا۔

"Even during periods of civilian governments, the generals have exercised political influence through the intelligence apparatus – the ISI – which plays a behind the scenes role in exaggerating political divisions to justify military intervention"⑯

ترجمہ: ''سویلین حکومتوں کے دور میں بھی جرنیل خفیہ ایجنسیوں (آئی ایس آئی) کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے ہیں۔ (آئی ایس آئی) پردے کے پیچھے کردار ادا کرتی ہے اور سیاسی اختلافات کو مبالغہ آرائی سے بڑھا چڑھا کر پیش کر کے فوجی مداخلت کا جواز پیدا کرتی ہے۔''⑯

امریکہ نے پاکستان میں ڈکٹیٹرشپ کو سپورٹ کیا اور قوم پرست لیڈروں کے خلاف سازشیں کیں۔ امریکہ کے خیال میں فوجی ڈکٹیٹر اس کے مفادات کا بہتر تحفظ کر سکتے ہیں۔ 1954 سے 2002 تک امریکہ نے پاکستان کو 12.6 بلین ڈالر کی معاشی اور فوجی امداد دی۔ ان میں سے 9.19 بلین ڈالر فوجی آمروں کو 24 سالہ اقتدار کے دوران دیئے گئے جبکہ جمہوری حکومتوں کے 19 سال کے دور میں صرف 3.4 بلین ڈالر کی امداد دی گئی۔ امریکی امداد کی اوسط شرح آمریت کے دور میں 382.9 ملین ڈالر سالانہ اور جمہوری دور میں 178.9 ملین ڈالر سالانہ رہی۔ امریکہ نے پاکستان میں آمریت کو مضبوط اور جمہوریت کو کمزور کیا۔⑰ امریکہ اور فوج کے روابط بڑے پرانے، گہرے اور مضبوط ہیں۔

1956 اور 1962 کے دساتیر کی معطلی، بنیادی جمہوریتوں کا ایکٹ، پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ، 1973 کے آئین کو طویل عرصہ زیرِ التوا رکھنا، آر سی او، پی سی او، صدارتی ریفرنڈم، غیر جماعتی انتخابات، ایل ایف او، آٹھویں اور سترہویں ترامیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ آمر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لیے انسانی حقوق اور جمہوری آزادیوں کو پامال کرتے رہے۔ جب بھی کوئی آمر رخصت ہوا تو اس کا دیا ہوا سیاسی نظام بھی اس

⑯ حسین حقانی * "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 314

⑰ حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 324

کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ کوئی آمر طویل عرصہ اقتدار میں رہنے کے باوجود قوم کو مستقل اور پائیدار سیاسی اور جمہوری نظام نہ دے سکا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آمریت قوم کے مسائل حل نہیں کر سکتی بلکہ ان کو مزید سنگین اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ آمریت ایک ایسا پُل ہے، جس پر چل کر عالمی طاقتیں دوسرے ملکوں کے اندر داخل ہوتی ہیں اور ان کی آزادی اور خودمختاری کو سلب کر لیتی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے ادوار میں امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان میں اس قدر غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر لیا کہ وہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھی کھلی مداخلت کرنے لگے۔ بھٹو اپنی آخری کتاب میں لکھتے ہیں:-

"The Third World has to guard against hegemony but the best way to guard against hegemony is to prevent 'coupgemony'. The biggest link of external colonialism is internal colonialism. Military coups d'etat are the worst enemies of national unity. Coupgemony is the bridge over which hegemony walks to stalk our lands."⑱

ترجمہ: ''تیسری دنیا کو بالادستی کا مقابلہ کرنا ہوگا لیکن بالادستی کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فوجی بغاوتوں کو روکا جائے۔ بیرونی استعمار پسندی کا سب سے بڑا رابطہ اندرونی استعمار پسندی کے ذریعے ہوتا ہے۔ فوجی بغاوتیں قومی اتحاد کی بدترین دشمن ہوتی ہیں۔ فوجی بغاوت (Coupgemony*) ایک ایسا پل ہے جس پر چل کر بالادستی ہماری زمینوں کو برباد کرتی ہے۔''⑱

پاکستان کے نامور صحافی ارشاد احمد حقانی جمہوری کلچر کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

[''فوجی قیادت جس قدر جلد اپنے ہوسِ اقتدار پر مبنی (Bonapartist) رجحانات سے نجات حاصل کرے گی جمہوریت کا سفر اتنا ہی آسان اور پرامن ہو جائے گا۔'' مشہور انگریز ادیب اور دوسری جنگِ عظیم کے نامور صحافی الڈس ہکسلے (Huxley) اپنی کتاب "Ends and Means" میں اسی قسم کی بات کرتے ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:

"So long as we worship Caesars and Napoleons, Caesars and Napoleons will duly arrive and make us miserable"

ترجمہ: ''جب تک ہم سیزروں اور نپولینوں کی پوجا یا تکریم کرتے رہیں گے وہ منصۂ شہود پر نمودار ہوتے رہیں گے۔ اور ہمیں مشکلات کا شکار کرتے رہیں گے۔''

اور اب جبکہ جنرل پرویز مشرف پاکستان کے صدر ہیں ان کے پاس یہ سنہری موقع ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک مدبر (statesman) ثابت کریں اور پاکستان میں ایسا جمہوری نظام وضع کریں کہ آئندہ نہ تو

⑱ زیڈ اے بھٹو "If I am Assassinated"

* بھٹو نے یہ لفظ تخلیق کیا

سولین آمریت قائم ہوسکے اور نہ ہی ملک فوجی اقتدار (Bonapartism) کا شکار ہوسکے۔ الڈس ہکسلے سیاسی نظام میں مرکزیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"Centralisation is great evil which is imposed on a society. Absolute power is intoxicatingly delightful. Centralisation leads to tyrany and enslavement."

ترجمہ: ''اختیارات کی مرکزیت ایک بہت بڑی برائی ہے جو کسی معاشرے پر مسلط کی جاسکتی ہے۔ کلی اختیار اور اقتدار اس کے حامل کے لیے ایک مدہوش اور سرمست کرنے والی کیفیت ہے۔ اختیارات کی مرکزیت ظلم اور غلامی پر منتج ہوتی ہے''۔

اسی کتاب میں مزید لکھتے ہیں:

"In feudal community the state is the instrument by means of which the landed nobility keeps itself in power. Under caplitalism the state is the instrument by means of which the bourgeoisie retains its right to rule and be rich.

The political road to better society is the road of decentralisation and responsible self government. Dictatorial shortcuts cannot conceivably take us to our destination."

مسٹر ہکسلے لکھتے ہیں:

''جاگیردارانہ معاشرے میں ریاست وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے زرعی اشرافیہ اپنے آپ کو اقتدار پر فائز رکھتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ریاست ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے مالدار طبقہ حکومت کرنے کا حق برقرار رکھتا ہے اور خود مالدار بھی بنا رہتا ہے۔

ایک اچھے معاشرے تک پہنچنے کا سیاسی راستہ یہ ہے کہ اختیارات کی مرکزیت توڑ دی جائے اور ذمہ دار حکومت خود اختیاری کا نظام قائم کیا جائے۔ آمریت کے اختیار کردہ مختصر راستے کسی بھی طرح ہمیں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے''۔[19]

ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود پاکستان میں مذہب اور ریاست کے تعلق کو ٹھوس اور عملی بنیادوں پر حل نہیں کیا جاسکا۔ اس ضمن میں پاکستان کا سماج اور حکومتیں منافقت اور تضادات کا شکار رہی ہیں۔ پاکستان نام کی اسلامی ریاست ہے، اسلامی شریعت کا نظام نافذ نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی شاید کبھی نافذ ہوسکے گا۔ آج کا پاکستان حقیقی معنوں میں اسلامی ہے اور نہ ہی جمہوری ہے۔ مذہب کی بحث نے جمہوریت اور جمہوری جماعتوں کو کمزور کیا۔ آمر مذہب کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے اور مذہبی جماعتیں آمروں کی آلۂ کار بنتی رہیں۔ برطانیہ میں بھی کیتھولک چرچ کی حکومت اور ریاست سے علیحدگی کے بعد ہی جمہوری نظام

[19] ارشاد احمد حقانی ''جمہوری کلچر کا فروغ پاکستان کے لیے بہترین لائحہ عمل'' روزنامہ جنگ 3 مارچ 2005

مستحکم ہوسکا۔ پاکستان میں جب تک اجتہاد کے ذریعے مذہب اور ریاست کے تعلق کا مسئلہ حل نہیں کیا جاتا، پاکستان ایک ماڈرن روشن خیال جمہوری ملک نہیں بن سکتا۔ حسین حقانی کے خیال میں پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست بنانے کی بجائے اسے ایک فنکشنل ریاست بنانے کی ضرورت ہے۔[20] سوال یہ ہے کیا نظریاتی ریاست فنکشنل ریاست نہیں بن سکتی۔

معروف امریکی سکالر کریگ بیکسٹر (Craig Baxter) کے خیال میں پاکستان ان پانچ شعبوں میں ناکام ہوا ہے جو ایک کامیاب ریاست کے لیے انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔

1- ریاست کی تشکیل — 1- State Building
2- قوم کی تعمیر — 2- Nation Building
3- معاشی نظام کی تعمیر — 3- Economy Building
4- عوام کی شراکت — 4- Participation
5- تقسیم کا نظام[21] — 5- Distribution

کریگ کا تجزیہ درست ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان ابھی ایک مکمل اور فنکشنل ریاست نہیں بن سکا۔ پاکستانی قوم کا وجود نظر نہیں آتا۔ معاشی استحکام کی بجائے پاکستانی معیشت قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ عوام کی اقتدار میں شرکت کا قابل عمل اور شفاف نظام وضع نہیں کیا جاسکا اور قومی وسائل کی تقسیم کا نظام منصفانہ نہیں ہے جس کی وجہ سے امیر اور غریب میں فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ 1986 میں شاہد جاوید برکی نے اپنی کتاب کا نام "A Nation in Making" رکھا تھا جو آج بھی درست معلوم ہوتا ہے اور پاکستان کی قوم اور ریاست ابھی تک تشکیل کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ پاکستان کے بیوروکریٹس اہم سیاسی عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ منتخب سیاسی حکمرانوں نے بھی کلیدی عہدوں کے لیے سیاست دانوں کی بجائے بیوروکریٹس کا انتخاب کیا لہٰذا تجربہ کار سیاسی کلاس تیار نہ ہوسکی۔ پاکستان کی تاریخ میں جو بیوروکریٹس اہم سیاسی مناصب پر فائز رہے ان میں سے یہ نام قابل ذکر ہیں۔

غلام محمد، چوہدری محمد علی، سکندر مرزا، عزیز احمد، غلام اسحٰق خان، الطاف گوہر، سعید احمد خان، آغا شاہی، مسعود محمود، وقار احمد، اے جی این قاضی، راؤ رشید، روئیداد خان، اجلال حیدر زیدی، سرتاج عزیز، خدا بخش بچہ، ڈاکٹر محبوب الحق، وی اے جعفری، سلمان فاروقی، احمد صادق، ایس کے محمود، خالد احمد کھرل، فاروق خان لغاری، انور زاہد، سعید مہدی، محمد حیات ٹمن۔

چار بیوروکریٹس غلام محمد، سکندر مرزا، غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری پاکستان کے صدر بن گئے۔ پاکستان کے 14 سربراہان ریاست میں سے 7 فوجی اور بیوروکریٹ تھے۔ انہوں نے 39 سالہ اقتدار کے

[20] حسین حقانی "Pakistan between Mosque and Military" صفحہ 329
[21] کریگ بکسٹر بحوالہ حفیظ ملک "Pakistan Founders Aspirations" صفحہ 20

دوران 15 میں سے 9 وزیرِاعظم برطرف کیے اور 11 اسمبلیوں میں سے 9 اسمبلیوں کو معطل کیا۔ صرف 1970 کی اسمبلی اپنی ٹرم پوری کر سکی۔

ایس ای فائنر (S. E. Finer) اپنی معروف کتاب "The Man on the Horseback" میں فوجی مداخلتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مسلح افواج کو سول تنظیموں پر تین قسم کی برتری حاصل ہے۔ پہلی اعلیٰ تنظیم، دوسری ولولہ انگیز جذبہ، تیسری اسلحہ کی فراوانی۔ جنگ و جدل ان کا پیشہ ہے اور وہ اپنی طاقت کے نشے میں سرمست رہتے ہیں اس لیے حیرت اس بات پر نہیں کہ وہ اپنے سول آقاؤں کے خلاف بغاوت کیوں کرتے ہیں بلکہ حیرت یہ ہے کہ وہ سرے سے سول آقاؤں کو تسلیم ہی کیوں کرتے ہیں۔ (شاید اس لیے کہ) فوج کی سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی، فوجی مداخلت کا اخلاقی فقدان اور پھر سب سے اہم عوام کی قوتِ مدافعت یا کم از کم مدافعت کا جذبہ۔ پاکستان کے تجربے کے مطابق عوام میں مدافعت کی کمی یا کمزوری ہی فوج کو بار بار مارشل لا نافذ کرنے پر اُکساتی ہے۔" [52]

سٹیفن کوہن لکھتے ہیں:۔

"It is also questionable that the army will conceive and implement a strategy of incremental change that would reform Pakistan's ailing civilian institutions. Overwhelming evidence suggests that the armed forces are quite comfortable — personally and professionally — with their central position in the management of state affairs, yet this is no substitute for strong civilian institutions and the rule of law, Pakistan's army is strong enough to prevent state failure, but not imaginative enough to impose the change that might transform the state." [53]

ترجمہ: "یہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ فوج کمزور سویلین اداروں کی بتدریج اصلاح کے لیے کوئی حکمت عملی وضع اور نافذ کرے گی۔ غالب شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ افواجِ پاکستان ــــ ذاتی اور پیشہ وارانہ طور پر ــــ ریاستی انتظامی اُمور میں اپنے مرکزی کردار سے مطمئن ہیں، حالانکہ یہ مضبوط سویلین اداروں اور قانون کی بالادستی کا نعم البدل نہیں ہے۔ پاکستان کی فوج اس قدر مضبوط ضرور ہے کہ ریاست کو ناکام ہونے سے بچا سکے مگر یہ اس قدر پر تخیل نہیں ہے کہ ریاست کی کایا پلٹ کرنے کے لیے انقلابی تبدیلیاں نافذ کرے۔" [53]

[52] ایم اے کے چوہدری "مارشل لاء کا سیاسی انداز" صفحہ 17

[53] Stephen Cohen "The Idea of Pakistan" صفحہ 274

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں منظر عام پر آنے والی شہادتوں، جرنیلوں، بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کے انکشافات اور اعترافات مؤرخین کے تجزیئے اور دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ فوج کے طالع آزما جرنیل اپنی فوجی قوت کے بل پر پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کرتے رہے۔ انہوں نے پاکستان کے سیاسی اور جمہوری اداروں کو کمزور کیا۔ جمہوریت کو کنٹرول کرنے کے لیے سیاسی انجینئرنگ کی تاکہ جمہوریت مستحکم نہ ہو سکے اور ریاستی اُمور پر فوج کی بالادستی قائم رہے۔ جمہوری حکومتوں کو ایک منظم حکمت عملی کے تحت عدم استحکام کا شکار کیا۔ جمہوری سیاسی رہنماؤں کی کردار کشی کے لیے پروپیگنڈہ مہم چلائی تاکہ انہیں عوام کی نظروں میں نفرت کی علامت بنایا جا سکے۔ مقبول عوامی لیڈروں کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے انہیں پھانسی دینے اور جلا وطن کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ سیاسی جماعتوں کو کمزور اور تقسیم کرنے کے لیے خفیہ ایجنسیوں کو استعمال کیا۔ پاکستان کے 58 سالوں میں سے 36 سال غیر جمہوری حکمران اقتدار پر قابض رہے جو مختار کل تھے۔ لہٰذا تاریخ کی عدالت جرنیلوں اور بیوروکریٹس پر بڑی ذمہ داری ڈالتی ہے جن کی وجہ سے پاکستان مختلف نوعیت کے مسائل کا شکار ہوا اور جمہوری ادارے پنپ نہ سکے۔ سینئر بیوروکریٹس کا مؤقف یہ ہے کہ وہ صرف فوجی حاکموں کے آلہ کار تھے جس طرح وہ سیاسی حاکموں کے مہرے تھے۔ حکومتیں بدلنے اور انقلاب لانے میں بیوروکریٹس کا حصہ نہیں تھا۔ فوج کے جرنیل مختار کل تھے۔ جب تک فوج عوام کی حاکمیت اور آئین کی بالادستی کو صدق دل سے تسلیم نہیں کرتی پاکستان ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتا اور جمہوری ادارے مستحکم نہیں ہو سکتے تاریخ سیاست دانوں کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیتی۔ سیاست دانوں نے اقتدار کی خاطر جمہوری اُصولوں کو پامال کیا۔ جب بھی آمریت کے خلاف مزاحمت کا وقت آیا سیاست دانوں نے اکثر و بیشتر مزاحمت سے گریز کیا اور مصالحت کا راستہ اپنایا۔ سیاست دانوں کی اکثریت جاگیردار پس منظر کی حامل تھی۔ اگر متوسط طبقے کے افراد سیاست میں اہم کردار کے حامل ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ سیاسی لیڈروں نے سیاسی جماعتوں کو منظم کرنے اور جماعتوں کے اندر جمہوری کلچر کو پروان چڑھانے سے گریز کیا جس سے یہ تاثر پھیلا کہ سیاست دانوں کی جمہوریت سے وابستگی (commitment) بہت کمزور ہے۔ جب سیاست دانوں کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا تو انہوں نے اکثر اوقات عوام کے مفادات اور مسائل کو نظر انداز کیا اور عوام کو ایک اچھی حکومت (good governance) دینے سے قاصر رہے۔

تاریخ کی نظر میں پاکستان کی عدلیہ کا کردار بھی افسوسناک رہا۔ عدلیہ نے آئین کا تحفظ اور پاسداری کرنے کی بجائے غیر آئینی حکمرانوں کو قانونی اور اخلاقی جواز بخشا۔ اگر اعلیٰ عدلیہ کے جج جمہوری حکومتوں کا دفاع کرتے تو پاکستان میں فوج کے جرنیل ریاستی اداروں پر بالادستی حاصل کرنے میں آسانی سے کامیاب نہ ہوتے اور جمہوری اداروں کو آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع ملتا۔ جج کو یہ سوچ کر فیصلہ نہیں کرنا

چاہیئے کہ اگر فیصلہ حکومت کے خلاف ہوا تو وہ اس کے فیصلے پر عمل نہیں کرے گی۔ جج کا فرض ہے کہ وہ اپنے ضمیر اور آئین کے مطابق فیصلہ کرے اور عملدرآمد کا کام حکومت پر چھوڑ دے۔ پاکستان کی تاریخ میں اقتدار کے مرکز و محور اور اقتدار کے اخلاقی جواز کا تضاد مسلسل جاری رہا۔

بقول غالب :۔

ؔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پاکستان کے عوام ہر دور میں تاریخ کی بزم سے پریشان ہی نکلے۔ ہمایوں خان اور روئیداد خان پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"In the midst of this sad and extended drama, one central factor has been constantly overlooked by elected and non-elected governments alike and that is the wishes of the people of Pakistan. If there is still reason of hope, it lies in the vigorous, hardworking, simple yet imaginative men and women who are the backbone of this country. Surely, some day, their will in the true sense shall prevail." ●

ترجمہ: اس افسوسناک اور وسیع ڈرامے کے بیچ میں منتخب اور غیر منتخب حکومتوں دونوں سے ایک مرکزی نکتہ نظر انداز ہوا ہے اور وہ ہے پاکستان کے عوام کی خواہشات۔ اگر اب بھی اُمید کی کوئی وجہ باقی ہے تو اس کا انحصار پرجوش، محنتی سادہ مگر تخلیقی مرد و زن پر ہے جو اس ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ یقینی طور پر ایک دن ان (عوام) کی خواہش غلبہ حاصل کرے گی۔ ●

● روئیداد خان "The British Papers" صفحہ xxvii

باب 18

مسائل کا ممکنہ حل

پاکستان کو درپیش بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ فیصلوں کا مرکز کس کو ہونا چاہیئے۔ پارلیمنٹ یا سول ملٹری بیوروکریسی کو۔ یہ دراصل اختیارات اور اقتدار کی جنگ ہے جس میں ایک طرف سول سوسائٹی ہے اور دوسری طرف سول اور ملٹری بیوروکریسی، جس نے عدلیہ کے کچھ لوگوں کو ساتھ ملایا ہوا ہے۔ نیز انہیں دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں کی تائید اور حمایت بھی حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ عوام کی منتخب پارلیمنٹ کو فیصلوں کا مرکز کیسے بنایا جائے۔

پاکستان کے عوام کی اکثریت تعلیم سے بے بہرہ اور معاشی لحاظ سے بے حد کمزور ہے۔ ان کے لیے عزت سے جینا مشکل ہو چکا ہے۔ وہ علاقائی، نسلی، لسانی، مذہبی اور برادری کی بنیاد پر منقسم ہیں۔ حکمران طبقے جاگیردار، فوج کے افسر، بیوروکریٹس، تاجر، صنعت کار بڑے سیاست دان مالی طور پر بڑے مضبوط ہیں اور ریاست کے وسائل اور مشینری پر ان کا مکمل قبضہ ہے۔ فوج، پولیس، پیراملٹری فورسز اور عدلیہ کی طاقت ان کے ساتھ ہے۔ ان طبقات کو عالمی طاقتوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ان حالات میں کسی انقلابی اور جوہری تبدیلی کا کوئی آسان حل ممکن نہیں ہے۔

ہم مسلمان ہیں، خدا پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ خدا قادرِ مطلق ہے اور دلوں کو پھیر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ خدا اپنی مخلوق کی فریاد سن لے اور سول ملٹری بیوروکریٹس کے دل پھیر دے اور انہیں ہدایت دے اور یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ تاریخ سے سبق سیکھ کر حاکمیت کا حق عوام کو واپس کر کے خود اپنے آئینی فرائض کی جانب لوٹ جائیں اور پاکستان میں بھی آئین اور قانون کی بالادستی اور عدل و انصاف کا دور شروع ہو جائے۔ اسے خوش فہمی بھی کہا جا سکتا ہے۔

ارضِ پاک کی مٹی بڑی زرخیز ہے اور صرف نمی کی ضرورت ہے۔ پاکستانی قوم کو قائداعظم جیسا ایک اور لیڈر میسر آ جائے تو پوری قوم اس کی قیادت میں متحد ہو کر قیامِ پاکستان کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل کر سکتی ہے۔ اگر افریقہ کو نیلسن منڈیلا اور ملائشیا کو مہاتیر جیسا لیڈر میسر آ سکتا ہے تو پاکستان کے عوام کو بھی ایک مثالی قیادت عطا ہو سکتی ہے جو پاکستان کو آئینی، سیاسی، معاشی اور سماجی بحران سے باہر نکال کر ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ پاکستان میں وسائل کی کمی نہیں، ایک مسیحا اور نجات دہندہ کی ضرورت ہے جسے

حالات اور واقعات خود جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے اور نہ ہی کوئی فرد اور ادارہ حالات کو ہمیشہ کے لیے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق چلانے کا اہل ہوسکتا ہے۔ تاریخ کی اپنی منطق ہوتی ہے اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ پاکستان کے عوام کے دلوں میں ایک بار پھر تحریکِ پاکستان کا جذبہ موجزن ہوسکتا ہے اور نئی پُرعزم بے لوث قیادت پاکستان کو ایک ترقی یافتہ جمہوری ملک بنا سکتی ہے جس میں عدل و انصاف اور مساوی مواقع کا نظام رائج ہو۔

سٹیفن کوہن نے پاک بھارت ایٹمی جنگ کا امکان ظاہر کیا ہے جس کے نتیجے میں فوجی طاقت کمزور ہوسکتی ہے اور ایسی جنگ انقلابی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ ❶ خدا پاکستان کو ایٹمی جنگ سے محفوظ رکھے۔ ایسی ہولناک جنگ کے بعد دونوں ملکوں میں کیا بچے گا کہ آزاد اور خودمختار ریاستوں کی صورت میں دنیا کے نقشے پر موجود رہ سکیں۔

ایئر مارشل (ر) اصغر خان کا خیال ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کے استحکام کا حل بھارت کے پاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"Till such time as the people of Pakistan percieve the Indian threat to be real, the armed forces in Pakistan will continue to enjoy the position of authority and trust and it would be unreasonable to expect any political leadership to assume that position, paradoxical as it may sound the key to real democracy in Pakistan lies with India." ❷

ترجمہ: ''جب تک پاکستان کے عوام بھارتی خطرے کو حقیقت سمجھتے رہیں گے افواج پاکستان اتھارٹی اور اعتماد کی پوزیشن سے بہرہ ور رہیں گی اور یہ توقع عبث ہوگی کہ کوئی سیاسی قیادت اس پوزیشن کو حاصل کرلے۔ یہ رائے ظاہری طور پر متناقص ہی نظر آئے مگر پاکستان میں حقیقی جمہوریت کی کنجی بھارت کے پاس ہے۔'' ❷

ایئر مارشل اصغر خان کی رائے کسی حد تک درست ہے، اگر پاکستان اور بھارت کشمیر کا تنازعہ حل کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور مستقل بنیادوں پر خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم کرسکیں تو پاکستان میں حقیقی جمہوریت کے امکانات روشن ہوجائیں گے۔

بعض مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کے مطابق فوج کے اندر سے ایسی انقلابی قیادت منظرِ عام پر آسکتی ہے جو موجودہ سٹیٹس کو (status quo) کو تبدیل کرکے ایک نیا سوشل کنٹریکٹ تشکیل دے۔ جسے آئین اور قانون کی بالادستی اور انصاف کی بنیاد پر مرتب کیا جائے اور جو پاکستان کے تمام مسائل کا آبرومندانہ اور منصفانہ حل پیش کرے اور فوجی طاقت کو حقیقی معنوں میں عملی طور پر پاکستان اور عوام کے مفاد میں

❶ Stephen Cohen "The Idea of Pakistan" صفحہ 297

❷ اصغر خان "We Have Learnt Nothing from History" صفحہ 252

استعمال کرے۔ پاک فوج میں اب تک چار ناکام بغاوتیں ہوچکی ہیں لہٰذا کامیاب بغاوت کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کی مذہبی جماعتیں اور جہادی گروپ روز بروز طاقت ور اور منظم ہو رہے ہیں۔ فرقہ واریت ان کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر مذہبی قوتیں فلاحی ریاست کے قیام کے لیے اسلامی انقلابی ایجنڈے پر متفق ہوجائیں تو وہ حکومت پر قبضہ کرسکتی ہیں۔ کیا اسلامی انقلاب پاکستان کے مسائل حل کرسکتا ہے؟ اس سوال کا حتمی جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

پاکستان کے تمام سیاست دان اور سیاسی جماعتیں ایک نکتہ پر متفق ہوجائیں کہ وہ کسی صورت میں فوج کی سیاست میں مداخلت کو قبول نہیں کریں گی۔ اس نکتہ پر متفق ہونے کے بعد تمام سیاسی جماعتیں عوام میں یہ شعور پیدا کریں کہ فوج پاکستان کے قومی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی۔ فوج کو صرف اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ اگر سیاسی جماعتیں متفق ہوکر عوام کو فوج کے کردار کے بارے میں قائل کرلیں اور خود فوج سے الگ تھلگ رہنے کا عملی ثبوت پیش کریں تو فوج عوامی دباؤ کے پیشِ نظر سیاست سے الگ ہونے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ میثاق جمہوریت (2006) کے اجراء کے بعد اس کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

سیاست دان اپنی جماعتوں کو منظم کریں، جمہوری کلچر کو فروغ دیں تاکہ عوام کی نظروں میں سیاسی جماعتوں کی ساکھ بحال ہوسکے اور قوم کو ایک بہتر اور فعال جمہوری نظام دے سکیں۔ عدلیہ کو آزاد اور خودمختار بنایا جائے تاکہ عدلیہ اداروں کو آئین کی حدود کے اندر رکھنے کا فرض پورا کرسکے۔ پارلیمنٹ کو بالادست ادارہ بنایا جائے۔ جمہوری قوتیں اس کی بالادستی کو عملی طور پر قبول کریں۔ میڈیا آزاد ہو تاکہ حکومت کو آئین اور قانون کا پابند بنا سکے۔

ممتاز عالمی مؤرخ آئن ٹالبوٹ نے پاکستان کے مسائل کا جو حل پیش کیا ہے وہ زمینی حقائق کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ ٹالبوٹ لکھتے ہیں:۔

"This conclusion commenced by arguing that Pakistan's politics could not be summed up in terms of the three ; 'A's'. We end on the note that further polarisation and instability can only be avoided by an internalisation of the five 'Cs' of consensus, consent, commitment, conviction and compassion. In other words, Pakistan's best hope for the future lies not in taking out the begging bowl to international governments and organisations, nor in sham populist or Islamic sloganeering, nor in successive bouts of authoritarianism designed to keep the lid on popular unrest. The way forward can only lie in the genuine political participation of previously marginalised groups such as

women, the minorities and the rural and urban poor. This would not only redeem the 'failed promise' of 1947, but also provide hope that Pakistan can effectively tackle the immense economic, social and environmental challenges of the next century." [3]

ترجمہ: ’’یہ تجزیہ اس دلیل سے شروع ہوا کہ پاکستان کی سیاست کو تین ایز (تھری اے) ’اللہ، امریکہ اور آرمی‘ پرمبنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہم اپنے تجزیے کا اختتام اس نوٹ پر ختم کرتے ہیں کہ مزید تقسیم اور عدم استحکام سے صرف اسی صورت میں بچا جاسکتا ہے کہ پانچ سی ('Cs') مطابقت، رضامندی، وابستگی، یقین محکم اور رحم دلی کو اندرونی حکمتِ عملی کا حصہ بنایا جائے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان کے مستقبل کا انحصار نہ عالمی حکومتوں اور اداروں کے سامنے کشکول لے کر جانے، نہ اسلامی نعروں اور نہ ایسے آمرانہ ادوار پر ہے جن کا مقصد عوامی بے چینی کو روکنا ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کا راستہ یہ ہے کہ ماضی میں نظر انداز کیے گئے گروپوں خواتین، اقلیتوں، شہری اور دیہاتی غریب عوام کی حقیقی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ اس طرح نہ صرف 1947ء کا ناکام وعدہ پورا ہوگا بلکہ یہ اُمید بھی پیدا ہوگی کہ پاکستان اگلی صدی کے سنگین معاشی، سماجی اور ماحولیاتی چیلنجوں کا مؤثر طور پر مقابلہ کرسکتا ہے۔‘‘ [3]

پاکستان کی تعلیم یافتہ مڈل کلاس نے سیاست میں اپنا کردار ادا نہیں کیا! ور اس خلاء کو جاگیرداروں نے پُر کیا۔ جتنی جلد مڈل کلاس کردار ادا کرنے کا فیصلہ کرے گی اتنا ہی ملک اور عوام کے لیے بہتر ہوگا کیونکہ پاکستان کی سیاست پر جن طبقات کی بالادستی ہے وہ اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے کبھی حقیقی جمہوریت کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

معراج خالد پاکستان کے نامور سیاست دان تھے وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ رہے۔ وفاقی وزیر کے علاوہ دوبار قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے۔ انہوں نے نگران وزیراعظم کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیئے ان کی زندگی کے ساٹھ سال عملی سیاست میں گزرے۔ معراج خالد کے سینئر فوجی افسروں، بیوروکریٹس، قومی اور صوبائی سطح کے سیاسی لیڈروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، تاجروں، ڈاکٹروں، وکلاء، صحافیوں، دانشوروں، اساتذہ، سماجی نمائندوں اور سیاسی کارکنوں سے قربت کے تعلقات رہے۔ معراج خالد اقتدار کی مصلحتوں اور ضروریات، اقتدار میں شامل طبقوں کے رجحانات اور ذہنیت سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ غریب عوام کی مشکلات اور ان کے مسائل اور سنگین پیچیدہ قومی بحران سے بخوبی آگاہ تھے۔ معراج خالد کی وفات سے چند ماہ پہلے مصنف نے ان کا پانچ نشستوں میں تفصیلی انٹرویو کیا۔ معراج خالد کے مطابق پاکستان کے آئینی، سیاسی، جمہوری، معاشی اور سماجی مسائل اس حد تک گمبھیر صورت اختیار کر چکے ہیں اور اقتدار میں شامل طبقوں کی ذہنیت اس حد تک ظالمانہ اور سنگدلانہ ہوچکی ہے کہ انقلاب کے بغیر موجودہ

[3] آئن ٹالبوٹ "Pakistan : A Modern History" صفحہ 273-274

اقتدار میں شامل طبقوں کی ذہنیت اس حد تک ظالمانہ اور سنگدلانہ ہوچکی ہے کہ انقلاب کے بغیر موجودہ سیاسی، جمہوری اور ریاستی کلچر کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پاکستان میں کوئی ایک شعبہ اور ادارہ ایسا نہیں ہے جس سے خیر اور فلاح کی توقع کی جاسکے لہٰذا مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ عوام کی طاقت کو منظم کر کے گرم انقلاب برپا کیا جائے۔ معراج خالد کے تجزیہ کے مطابق پاکستان میں حالات انقلاب کے لیے سازگار ہیں اور عوام انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہیں۔ ایک ایسی انقلابی قیادت کی ضرورت ہے جو اہل اور بے لوث ہو اور عوام میں تحریک پاکستان کی روح کو بیدار کر سکے اور عوامی طاقت سے انقلاب برپا کر کے پرانے استحصالی کلچر اور آقائی ذہنیت کی جگہ عدل وانصاف اور مساوات پر مبنی نیا کلچر رائج کرے۔

پاکستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر مبارک علی کا خیال ہے کہ دنیا گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ عالمی طاقتوں کے مفادات پاکستان سے وابستہ ہیں۔ پاکستان کی ایلیٹ کلاس بڑی مضبوط ہے لہٰذا پاکستان میں انقلاب ممکن نہیں ہے البتہ محروم عوام تبدیلی کے خواہش مند ہیں اگر پاکستان میں ایک مثالی جمہوری سیاسی جماعت قائم ہوجائے جس کا پروگرام انقلابی اور فلاحی ہو تو اسے عوام کا اعتماد حاصل ہوسکتا ہے اور عوامی جمہوری جماعت انتخابی عمل سے پاکستان میں تبدیلی لاسکتی ہے۔ [4]

آئی ایس آئی کے سابق ڈی جی جنرل (ر) حمید گل کی رائے میں سیاسی عسکری کشمکش کا حل یہ ہے کہ پاکستان کا ایک نظریاتی ریاست کے طور پر باضابطہ اعلان کیا جائے اور اس کی مستقل خارجہ پالیسی متعین کی جائے تاکہ سامراجی طاقتوں کی پاکستان میں مداخلت ختم ہو اور فوج استعمار کی پشت پناہی حاصل نہ کر سکے۔ فوج کے سٹرکچر میں انقلابی نوعیت کی تبدیلی لائی جائے۔ آرمی چیف کے پاس لامحدود اختیارات ہیں وہ اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق فوجی افیسروں کو پروموٹ، ٹرانسفر اور ریٹائر کرسکتا ہے اور جس کو چاہے دفاع کے نام پر اراضی الاٹ کرسکتا ہے گویا آرمی چیف کے پاس ’’گاجر اور ڈنڈا‘‘ دونوں ہیں وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت پر قبضہ کرسکتا ہے۔ فوج میں فرد واحد طاقت کا مرکز ہے جو غلط فیصلہ بھی کرسکتا ہے اور کسی اندرونی اور بیرونی طاقت کے ہاتھوں استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ آرمی چیف پر چیک بہت ضروری ہے اسے وزارت دفاع کے تابع کیا جائے اور سینئر جرنیلوں کی پروموشن، ٹرانسفر اور ریٹائرمنٹ کے حتمی اختیارات وزارت دفاع کو دیئے جائیں تاکہ کور کمانڈرز کی کانفرنس میں فوجی آفیسر قومی اُمور کے بارے میں بلاخوف اپنی رائے کا اظہار کرسکیں۔ فوج کے جرنیلوں پر سفارت کاروں سے ملاقاتوں پر پابندی عائد کی جائے۔ آرمی چیف کے اختیارات اور حیثیت بھی محدود اور حکومت کے کنٹرول میں ہونی چاہیے۔ البتہ حالت جنگ میں آرمی چیف کے پاس مکمل اختیارات ہونے چاہئیں۔ آرمی چیف سے اراضی الاٹ کرنے کا اختیار واپس لیا جائے۔ زمینیں صوبائی حکومت کی ملکیت ہوتی ہیں لہٰذا زمین کی الاٹمنٹ کا اختیار بھی صوبائی حکومت کو ہونا چاہیے۔ جنرل حمید گل کی رائے سے اتفاق اور اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان تجاویز پر عمل کرنے سے فوج کا ڈسپلن متاثر نہیں ہوگا اور انقلابی نوعیت کی ان تجاویز پر عملدرآمد کیسے ممکن ہوگا۔ [5]

[4] مصنف کا ڈاکٹر مبارک علی سے انٹرویو 26 دسمبر 2005

[5] مصنف کا جنرل (ر) حمید گل سے انٹرویو 22 دسمبر 2005 لاہور

باب19

گورنر جنرلز، صدور اور وزرائے اعظم کا تعارف

قائداعظم محمد علی جناح (1876-1948)

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر، پاکستان کے بانی، پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور دستور ساز اسمبلی کے پہلے صدر (48-1947)۔ قائداعظم نے سندھ مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ Lincoln's Inn لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلائے۔ انہوں نے 1920 میں کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ ہندوؤں کے مسلمانوں کے بارے میں تعصب کی وجہ سے کانگریسی لیڈروں سے مایوس ہوگئے تھے۔ قائداعظم کچھ عرصہ کے لیے لندن چلے گئے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ 1935 میں انڈیا واپس آگئے اور مسلم لیگ کی تنظیم کا کام شروع کیا۔ 1940 کے بعد انہوں نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ قائداعظم نے پاکستان کا مقدمہ بڑی سنجیدگی، خلوص نیت اور ثابت قدمی سے لڑا اور انگریزوں اور ہندوؤں کی سخت مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے پاکستان کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ بابائے قوم ہیں ان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ قائد کی ہمشیرہ مادرِ ملت فاطمہ جناح نے تحریکِ پاکستان میں پرُجوش حصہ لیا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان (1895-1951)

لیاقت علی خان یو پی کے زمیندار تھے۔ وہ وکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل رہے۔ انہیں قائداعظم کا دستِ راست کہا جاتا ہے۔ وہ 1946 کی عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد مرکزی لیڈر بن گئے۔ وہ مضبوط مرکز کے حامی تھے اور مسلم لیگ کی مخالفت کو پاکستان کی مخالفت تصور کرتے تھے۔ لیاقت علی خان نے قراردادِ مقاصد منظور کرائی اور اسلام کو آئین کی بنیاد قرار دیا۔ ان کو 1951ء میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ قوم انہیں قائدِ ملت کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لیاقت علی خان

کی بیگم رعنا لیاقت نے عملی سیاست میں کردار ادا کیا۔

خواجہ ناظم الدین (1894-1964)

خواجہ ناظم الدین کا نواب آف ڈھاکہ فیملی سے تعلق تھا۔ وہ قائداعظم کے قابلِ اعتماد ساتھی تھے۔ مشرقی پاکستان کے پہلے وزیراعلیٰ بنے اور قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل منتخب ہوئے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔ وہ مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ غلام محمد نے 1953 میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا، وہ شریف النفس شخصیت تھے۔ انہوں نے ایوب خان کی مخالفت کی اور کونسل مسلم لیگ میں مرکزی کردار ادا کیا۔ وہ 1964 میں اس دارفانی سے رخصت ہوگئے۔

غلام محمد (1895-1956)

غلام محمد کا تعلق جالندھر سے تھا۔ ککے زئی فیملی سے تعلق رکھتے تھے، برطانوی دور میں فنانشل ایکسپرٹ کے طور پر مشہور ہوئے۔ انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کا آغاز کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی وفاقی کابینہ میں وزیرخزانہ بنے۔ خواجہ ناظم الدین کے بعد پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل بن گئے۔ غلام محمد آمرانہ ذہن کے مالک تھے اور جمہوری سرگرمیوں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے پاکستان میں جمہوریت کو زندہ درگور کیا اور خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو بلاجواز توڑ دیا۔ انہوں نے ذاتی اقتدار کی خاطر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو 1954 میں برطرف کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ شدید بیماری کے باوجود وہ اقتدار پر براجمان رہے اور 1955 میں ایوب خان کے دباؤ پر مستعفی ہوگئے۔

اسکندر مرزا (1899-1969)

اسکندر مرزا کا شیعہ خاندان سے تعلق تھا۔ ممبئی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے برطانوی راج کے دوران انڈین پولیٹیکل سروس میں ملازمت کی اور اپنی ملٹری پوزیشن کو برقرار رکھا۔ وہ سینڈھرسٹ کے پہلے انڈین کمیشنڈ افسر تھے۔ 1947 میں پاکستان کے ڈیفنس سیکریٹری بنے اور 1954 میں مشرقی پاکستان کے گورنر نامزد ہوئے۔ بوگرہ وزارت میں وزیرِداخلہ نامزد ہوگئے۔ غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے۔ 1956 کے آئین کے نفاذ کے بعد اسکندر مرزا پاکستان کے صدر بن گئے۔ انہوں نے 7 اکتوبر ۱۹۵۸ء ایوب خان کی حمایت سے اسمبلی کو برطرف کر کے ملک پر مارشل لا مسلط کر دیا اور جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نامزد کر دیا۔ جب ایوب خان کو ان سے خطرہ محسوس ہوا تو اس نے ان سے استعفیٰ لے کر انہیں لندن جلاوطن کر دیا۔

محمد ایوب خان (1907-1974)

ایوب خان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ کے ضلع ہزارہ سے تعلق تھا۔ وہ متوسط گھرانے کے فرزند تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج اور سینڈھرسٹ سے تعلیم حاصل کی اور 1928 میں کمیشن حاصل کیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں انہوں نے برما میں فوجی خدمات انجام دیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت پنجاب باؤنڈری کمیشن میں شامل ہوئے۔ میجر جنرل بننے کے بعد انہوں نے مشرقی پاکستان میں فوج کو کمانڈ کیا۔ 1951 میں پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف بنے۔ 1954 میں وزیرِ دفاع کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہوگئے۔ 1958 کے فوجی انقلاب میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور اسکندر مرزا کو رخصت کرنے کے بعد پاکستان کے صدر بن گئے۔ انہوں نے 1962ء میں قوم کو صدارتی آئین دیا۔ 1965 کی پاک بھارت جنگ کے بعد ایوب خان کی حکومت عدم استحکام کا شکار ہوگئی۔ 1968ء میں ان کے خلاف ملک گیر تحریک چلی جس کے نتیجے میں ان کو مستعفی ہونا پڑا۔ انہوں نے 1964ء میں "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" (Friends not Masters) کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی جو بڑی معروف ہوئی۔ جنرل ایوب خان کو پاکستان میں فوجی اقتدار کا بانی کہا جاتا ہے۔

محمد یحییٰ خان (1917-1980)

چکوال ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ البتہ ان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ ان کے والد پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اور انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1938 میں فوج سے کمیشن حاصل کیا اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ 1957 میں چیف آف جنرل سٹاف مقرر ہوئے اور 1966 میں کمانڈر انچیف بن گئے۔ جنرل یحییٰ خان 25 مارچ 1969ء کو جنرل ایوب خان کی جگہ پاکستان کے صدر بن گئے۔ انہوں نے 1970 کے انتخابی نتائج کے مطابق شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل کرنے میں تاخیر کی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کیا اور 1971 میں پاک بھارت جنگ میں پاکستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 16 دسمبر 1971 کو بھارتی افواج نے ڈھاکہ پر قبضہ کر لیا۔ یحییٰ خان کو عوامی اور فوجی دباؤ کے تحت مستعفی ہونا پڑا۔

ذوالفقار علی بھٹو (1928-1979)

5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سندھ کے ایک بڑے جاگیردار تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کیتھڈرل ہائی سکول ممبئی اور اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ اور برکلے کیلی فورنیا سے حاصل کی۔ بھٹو کچھ عرصہ وکالت کے پیشے سے بھی منسلک رہے اور انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر کے طور پر بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ ایوب خان کی کابینہ میں کامرس، انڈسٹریز، اطلاعات و نشریات اور خارجہ اُمور کے وزیر

رہے۔ ایوب کابینہ سے علیحدگی کے بعد انہوں نے 1967 میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1970ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر کے طور پر اُبھرے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھٹو پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ انہوں نے 1973 میں قوم کو پہلا متفقہ آئین دیا اور وزیراعظم منتخب ہوگئے۔ 1974ء میں اسلامی کانفرنس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1977ء کے انتخابات کے بعد ان کی حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلی۔ اپوزیشن نے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا۔ جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977 کو اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ بھٹو کی پھانسی کو عدالتی قتل قرار دیا گیا۔ پاکستان کے عوام کی اکثریت بھٹو کو شہید کا درجہ دیتی ہے۔ وہ ایٹمی پروگرام کے بانی تھے اور قوم پرست سیاسی رہنما تھے۔

فضل الٰہی چوہدری (1904-1982)

فضل الٰہی چوہدری 1904ء میں مرالہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ 1924ء میں زرعی کالج فیصل آباد سے بی ایس سی کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے 1927ء میں ایم اے (معاشیات) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حصول تعلیم کے بعد وکالت کے پیشہ سے وابستہ رہے قیام پاکستان سے پہلے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور تحریک پاکستان کے دوران جیل بھی کاٹی 58-1956ء میں مغربی پاکستان اسمبلی (ون یونٹ) کے سپیکر رہے۔ 1972ء میں قومی اسمبلی کے سپیکر اور 1973ء میں پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے 2 جون 1982ء کو وفات پائی۔

محمد ضیاء الحق (1922-1988)

ضیاء الحق کا جالندھر کے متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔ انہوں نے سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے تعلیم حاصل کی۔ برٹش انڈین آرمی کو 1944 میں جوائن کیا۔ کیولری میں کمیشن حاصل کرنے کے بعد برما، ملایا اور جاوا میں سروس کی۔ 1969ء میں بریگیڈیئر بننے کے بعد اُردن گئے اور پی ایل او کے خلاف جنگ میں شاہ حسین کی مدد کی۔ انہوں نے فرسٹ آرمڈ ڈویژن کو تین سال کمانڈ کیا۔ 1976 میں بھٹو نے ضیاء الحق کو پاک فوج کا آرمی چیف بنا دیا حالانکہ وہ فوج میں سات لیفٹیننٹ جرنیلوں سے جونیئر تھے۔ وہ 5 جولائی 1977 کو منتخب حکومت کا تختہ اُلٹا کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں پاکستان کے صدر بن گئے۔ 1979 میں روس کی فوجوں کے خلاف افغان جہاد کی سرپرستی کی اور امریکہ کے اتحادی بن گئے۔ انہوں نے 1985 میں غیر جماعتی انتخابات کرائے اور محمد خان جونیجو کو وزیراعظم نامزد کیا۔ مئی 1988 میں اپنے ہی نامزد کردہ وزیراعظم کی حکومت ختم کردی۔ 17 اگست 1988 کو سی ون 30 طیارہ کریش ہونے سے ہلاک ہوگئے۔

غلام اسحٰق خان (-1915)

1915 میں پیدا ہوئے ان کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے۔ آزادی سے پہلے سول سروس میں جونیئر عہدوں پر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہوم سیکریٹری بن گئے۔ 1956 میں ڈویلپمینٹ اور اری گیشن کے وفاقی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ 1961 میں واپڈا کے چیئرمین نامزد ہوئے۔ 1977 میں سیکرٹری جنرل ڈیفنس کے طور پر کام کیا۔ ضیاء الحق کے دور میں معیشت کے انچارج رہے۔ 1985 میں سینٹ کے چیئرمین منتخب ہوئے اور ضیاء الحق کی وفات کے بعد پاکستان کے صدر بن گئے۔ 1990 میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ختم کیا، 1993 میں نواز شریف کی حکومت کو ختم کیا مگر آئینی بحران پیدا ہونے کی بناء پر اسحٰق خان اور نواز شریف دونوں کو مستعفی ہونا پڑا۔

وسیم سجاد (-1941)

وسیم سجاد 30 مارچ 1941ء کو پیدا ہوئے ان کے والد جسٹس سجاد احمد جان ممتاز قانون دان تھے۔ 1961ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی آنرز کے ساتھ بی اے کیا۔ ایل ایل بی میں اوّل پوزیشن لے کر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1964ء میں ایم اے سیاسیات میں بھی گولڈ میڈل لیا۔ 1966ء میں آکسفورڈ سے اُصول قانون کی ڈگری حاصل کی اور وکالت کا آغاز کیا۔ 1985ء میں ٹیکنوکریٹ کی حیثیت سے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ وسیم سجاد تین بار سینٹ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ جونیجو حکومت میں وفاقی وزیر قانون، انصاف اور پارلیمانی اُمور رہے۔ غلام اسحاق خان کی صدارت سے علیحدگی کے بعد پاکستان کے قائمقام صدر بنے۔

سردار فاروق خان لغاری (-1940)

1940 میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ بلوچ لغاری قبیلے سے تعلق ہے۔ ایچی سن کالج لاہور اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ سول سروس میں خدمات انجام دینے کے بعد پی پی پی میں شامل ہوگئے۔ 1977 میں سینیٹر کی حیثیت سے بھٹو کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل رہے۔ بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار میں وفاقی وزیر رہے۔ 1993 میں پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ 1996 میں فاروق لغاری کے تعلقات وزیراعظم بے نظیر کے ساتھ کشیدہ ہوگئے، انہوں نے آئین کے آرٹیکل 58(2)(b) کے تحت اختیارات استعمال کرتے ہوئے بے نظیر کی حکومت توڑ دی۔ فاروق لغاری وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ بھی ورکنگ ریلیشن شپ قائم نہ رکھ سکے اور 1998 میں صدارت کے منصب سے مستعفی ہوگئے۔ انہوں نے ملت پارٹی کے نام سے الگ سیاسی جماعت قائم کی، بعد میں جنرل پرویز مشرف کی خواہش پر اسے مسلم لیگ (ق) میں ضم کردیا۔

رفیق تارڑ (-1929)

2 نومبر 1929 میں گوجرانوالہ کے ایک گاؤں پیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ سے بی اے کیا اور 1951 میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ گوجرانوالہ میں وکالت کرتے رہے۔ 1966 میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نامزد ہوئے۔ 1974 میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس کے منصب پر فائز ہوئے اور 1989 میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بن گئے۔ انہوں نے پاکستان الیکشن کمیشن کے ممبر کے طور پر بھی کام کیا۔ وہ سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد 1997ء میں مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ 31 دسمبر 1997 کو پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے چاروں صوبوں سے بھاری تعداد میں ووٹ حاصل کر کے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ وہ جون 2001 تک صدارت کے منصب پر فائز رہے۔ جنرل پرویز مشرف نے انہیں طاقت کے بل بوتے پر گھر بھجوا دیا حالانکہ انہیں پانچ سال کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

پرویز مشرف (-1943)

پرویز مشرف 11 اگست 1943 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مشرف الدین فارن سروس میں ملازمت کرتے رہے۔ مشرف نے بچپن انقرہ ترکی میں گزارا۔ ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک سکول کراچی سے حاصل کی۔ ایف سی کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔ 1961ء میں فوج میں شامل ہوئے۔ 1964ء میں آرٹلری رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کر کے نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی اور رائل کالج آف ڈیفنس برطانیہ سے مختلف تربیتی کورسز کیئے۔ انہوں نے 1965ء کی جنگ میں قابل قدر خدمات انجام دیں جنہیں بہت سراہا گیا۔ 1971 میں کمانڈو بٹالین کے کمانڈر بنے۔ فوج کے ایس ایس جی (SSG) گروپ میں ان کا انتخاب ایک بڑی کامیابی تھی۔ 1991ء میں میجر جنرل کے رینک میں پروموٹ ہوئے۔ 1995 میں لیفٹیننٹ جنرل بن گئے۔ 7 اکتوبر 1998 میں جنرل کے رینک میں چیف آف آرمی سٹاف نامزد ہوئے۔ وزیراعظم نواز شریف نے انہیں اپریل 1999 میں چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کا منصب بھی پیش کر دیا۔ مشرف 12 اکتوبر 1999 میں اقتدار پر قبضہ کر کے پاکستان کے چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ انہوں نے جون 2001 میں صدر پاکستان کا منصب بھی سنبھال لیا۔

محمد علی بوگرہ (1901-1963)

بوگرہ کا تعلق بنگال سے تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل پارلیمانی سکریٹری اور وزیر کی حیثیت

سے فرائض انجام دیئے۔ 1948 میں برما میں پاکستان کے سفیر نامزد ہوئے۔ 1949 میں ہائی کمشنر کینیڈا اور 1952-55 تک امریکہ میں سفیر رہے۔ خواجہ ناظم الدین کے بعد 1955 میں پاکستان کے وزیراعظم بنے۔ 1962 سے 1963 تک ایوب کابینہ میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

چوہدری محمد علی (1905-1980)

آزادی سے پہلے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد وفاقی حکومت کے سیکریٹری جنرل کے اہم منصب پر فائز ہوئے۔ 1951 میں وزیر خزانہ اور 1955 میں پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ ان کے دور حکومت میں 1956 کا آئین نافذ ہوا۔ ایوب دور میں نیشنل بنک کے مشیر اور پکک (PICIC) کے چیئرمین رہے۔ انہوں نے "The Emergence of Pakistan" کے نام سے تحریک پاکستان پر ایک معیاری کتاب لکھی۔

حسین شہید سہروردی (1893-1963)

کلکتہ ہائی کورٹ کے جج کے فرزند میدان پور مغربی بنگال میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1923 میں کلکتہ کے ڈپٹی میئر منتخب ہوئے۔ 1937-41 میں وزیر رہے۔ بنگال نیشنل چیمبر آف لیبر میں سرگرم حصہ لیا۔ 1946 میں بنگال کے وزیراعظم بنے۔ انہوں نے 1950 میں عوامی لیگ کی بنیاد رکھی، چند ماہ وفاقی کابینہ میں وزیر رہے۔ چوہدری محمد علی کے بعد پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ سہروردی ایوب خان کے خلاف تھے۔ 1962 میں گرفتار ہوئے۔ ایوب کے خلاف نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کی سربراہی بھی کی۔ وہ بنگال کے سرکردہ سیاسی راہنما تھے۔ 1963 میں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور اسی سال بیروت میں وفات پا گئے۔

آئی آئی چندریگر (1897-1960)

اسماعیل ابراہیم چندریگر احمد آباد کے وکیل تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم کے قریبی رفقاء میں رہے۔ 1937-46 میں ممبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن رہے۔ عبوری حکومت میں کامرس منسٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد افغانستان میں سفیر مقرر ہوئے۔ 1950-53 کے دوران پنجاب اور سرحد کے گورنر کے منصب پر فائز رہے۔ 1957 میں دو ماہ کے لیے پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ وہ اسکندر مرزا کے قریبی ساتھی تھے۔

فیروز خان نون (1893-1970)

سرگودھا کے جاگیردار سیاست دان تھے۔ 1921 میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

1927-36 کے دوران وزیر بھی رہے۔ انہوں نے لندن میں پانچ سال تک انڈین ہائی کمشنر کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ 1941 میں وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ وہ وزارت دفاع کا منصب حاصل کرنے والے پہلے انڈین تھے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ 1956 میں پاکستان کے وزیر خارجہ رہے۔ 1957 میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ ان کی اہلیہ وقار النساء نون ضیاء دور میں ٹورازم کی وزیر مملکت رہیں۔

محمد خان جونیجو (1932-1993)

سندھ کے جاگیردار سیاست دان تھے۔ پیر پگارا کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتا تھا۔ 1960 میں عملی سیاست کا آغاز کیا۔ ضیاء کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ شریف النفس اور دیانت دار شخصیت تھے۔ 1985 کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے وزیر اعظم نامزد ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ آئینی اور جمہوری اختلافات کی بناء پر ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ جونیجو نے ضیا کی خواہش کے برعکس جنیوا معاہدہ کر کے افغانستان کے بحران سے پاکستان کو باہر نکالا۔ ضیاء نے 1988 میں جونیجو کو برطرف کر دیا۔

بے نظیر بھٹو (-1953)

21 جون 1953 کو لاڑکانہ میں جنم لیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی بڑی بیٹی ہیں۔ آکسفورڈ اور ہاورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ یونین کی پہلی ایشیائی خاتون صدر منتخب ہوئیں۔ 1977 میں عملی سیاست کا آغاز کر کے بھٹو کی رہائی اور جمہوریت کی بحالی کی تحریک چلائی۔ انہوں نے ضیاء دور میں جیل کی صعوبتیں اور جلاوطنی کی اذیتیں برداشت کیں۔ 1986 میں جلاوطنی ختم کر کے لاہور آئیں تو عوام نے ان کا پرجوش اور تاریخ ساز استقبال کیا۔ بے نظیر پی پی پی کی چیئرپرسن ہیں۔ 1988 کے انتخابات کے بعد پاکستان اور عالم اسلام کی پہلی خاتون وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1993 میں دوبارہ وزیر اعظم بنیں۔ انہوں نے ''دختر مشرق'' (Daughter of the East) کتاب تحریر کی جو عوام میں مقبول ہوئی۔

غلام مصطفیٰ جتوئی (-1931)

14 اگست 1931 کو نوشہرو فیروز کے جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی گرامر سکول سے حاصل کی۔ 1954ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ نواب شاہ (سندھ) کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1956 میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں 1962، 1970، 1977، 1990، 1993، 1997 کے انتخابات میں مسلسل قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بھٹو کابینہ میں وفاقی وزیر

رہے۔ 1974 میں صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ 6 اگست 1990 کو پاکستان کے نگران وزیر اعظم نامزد ہوئے۔

میاں نواز شریف (-1949)

1949ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ صنعتی خاندان سے تعلق ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں سیاسی منظر پر آئے۔ 1981 میں پنجاب کے وزیر خزانہ بنے، 1985 میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ 1990 میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ 1997 میں دوسری بار پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ وہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے صدر اور مرکزی رہنما ہیں۔ انہوں نے محنت اور دولت کی بناء پر اپنا ووٹ بینک قائم کیا۔ 1999 میں جنرل پرویز مشرف نے انہیں ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 2000 میں نواز شریف اپنے خاندان کے ہمراہ جدہ جلاوطن کر دیئے گئے۔

معین قریشی (-1930)

معین قریشی 1930 میں پیدا ہوئے۔ انڈیانہ یونیورسٹی، امریکہ سے اکنامکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1980-87 کے دوران ورلڈ بینک کے سینئر وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی دوران انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ایسوسی ایشن کے چیئرمین رہے۔ 1993 میں پاکستان کے نگران وزیر اعظم بنے۔ ان کے دور میں پہلی بار بینکوں کے قرض نادہندگان کی لسٹ شائع ہوئی۔ معین قریشی کو امپورٹڈ وزیر اعظم (Imported Prime Minister) کا نام دیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنی ساری عمر پاکستان سے باہر گزاری۔

معراج خالد (ملک) (1916-2002)

لاہور کے ایک گاؤں ڈیرہ چاہل میں پیدا ہوئے۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق تھا۔ اسلامیہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ لاء کالج سے ایل ایل بی کیا۔ وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ ایوب دور میں کنونشن لیگ کے رکن رہے۔ 1965 کے انتخابات میں پہلی بار صوبائی اسمبلی پنجاب کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کا شمار ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی رفقاء میں ہوتا ہے۔ بھٹو دور میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور وفاقی وزیر کے منصب پر فائز رہے۔ 1977 اور 1988 میں قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے۔ نومبر 1996 میں پاکستان کے نگران وزیر اعظم نامزد ہوئے وہ پاکستان کے شریف، دیانت دار اور درویش سیاست دان تھے۔

میر ظفر اللہ جمالی (-1944)

جمالی یکم جنوری 1944 کو ڈیرہ مراد جمالی بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور

سے حاصل کی۔ 1963ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کرنے کے بعد 1965ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ہسٹری کیا۔ 1977 میں بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی کابینہ میں شامل رہے۔ 84-1981 میں وفاقی وزیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ ایک ٹرم کے لیے سینٹ کے رکن رہے۔ 21 نومبر 2002 میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پاکستان کے پہلے وزیراعظم منتخب ہوئے اور 26 جون 2004 تک اس منصب پر فائز رہے۔

چوہدری شجاعت حسین (1946-   )

چوہدری شجاعت حسین 27 جنوری 1946 کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری ظہور الٰہی پنجاب کے معروف سیاست دان تھے۔ صنعتی خاندان سے تعلق ہے۔ انہوں نے 1967ء میں ایف سی کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ 1981ء میں عملی سیاست میں آئے، جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔ 1985ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 97-1993 کے دوران سینٹ کے رکن رہے۔ 2002 کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو کر مسلم لیگ (ق) کے مرکزی صدر کے منصب پر فائز رہے۔ 88-1986 اور 99-1997 کے دوران وفاقی وزیر بھی رہے۔ 30 جون 2004 میں پاکستان کے وزیراعظم منتخب ہوئے اور 18 اگست 2004 میں مستعفی ہو گئے۔

شوکت عزیز (1949-   )

شوکت عزیز 6 مارچ 1949ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک سکول کراچی سے حاصل کی۔ 1967ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے کیا۔ 1969ء میں آئی بی اے کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سٹی بینک سے منسلک ہو گئے۔ 1975 کے بعد دنیا کے مختلف ممالک میں سروس کرتے رہے۔ 1992 میں سٹی بینک کے وائس پریذیڈنٹ کے منصب پر فائز ہوئے۔ 1999 میں پاکستان کے وفاقی وزیر خزانہ نامزد ہوئے۔ 2002 میں سینیٹر منتخب ہوئے۔ 28 اگست 2004 کو پاکستان کے 23 ویں وزیراعظم منتخب ہوئے۔

پاکستان کے سربراہان ریاست

Pakistan's Heads of State

Governor-Generals

Name	Portfolio	Tenure
Muhammad Ali Jinnah	Governor-General	Aug. 15, 1947 - Sept. 11, 1948
Khawaja Nazimuddin	Governor-General	Sept. 14, 1948 - Oct. 17, 1951
Ghulam Muhammad	Governor-General	Oct. 19, 1951 - Oct.5, 1955
Iskander Mirza	Governor-General	Oct. 6, 1955 - March 22, 1958

Presidents

Name	Portfolio	Tenure
Iskander Mirza	President	March 23, 1956 - Oct. 27, 1958
Muhammad Ayub Khan	CMLA/President	Oct. 27, 1958 - March 25, 1969
Muhammad Yahya Khan	CMLA/President	March 25, 1969 - Dec. 20, 1971
Zulfiqar Ali Bhutto	President	Dec. 20, 1971 - Aug. 13, 1973
Fazal Elahi Chaudrry	President	Aug. 14, 1973 - Sept. 16, 1978
Muhammad Zia-ul-Haq	CMLA/President	July 5, 1977 - Aug. 17, 1988
Ghulam Ishaq Khan	President	Aug. 17, 1988 - July 18, 1993

Wasim Sajjad (Acting)	President	July 18, 1993 - Nov. 13, 1993
Farooq Ahmad Leghari	President	Nov. 14, 1993 - Dec. 2, 1997
Wasim Sajjad (Acting)	President	Dec. 2, 1997 - Dec. 31, 1997
Muhammad Rafiq Tarar	President	Jan. 1, 1998 - June 20, 2001
Pervaiz Musharaf	President	June 20, 2001 -

پاکستان کے وزرائے اعظم

Pakistan Prime Ministers

Name	Tenure
Liaquat Ali Khan	Aug. 15, 1947 - Oct. 16, 1951
Khawaja Nazimuddin	Oct. 19, 1951 - April 17, 1953
Muhammad Ali Bogra	April 17, 1953 - Aug. 11, 1955
Chaudhri Muhammad Ali	Aug. 11, 1955 - Sept. 12, 1956
Hussain Shaheed Suhrawardy	Sept. 12, 1956 - Oct. 18, 1957
Ibrahim Ismail Chundrigar	Oct. 18, 1957 - Dec. 16, 1957
Firoz Khan Noon	Dec. 16, 1957 - Oct. 7, 1958
Zulfiqar Ali Bhutto	Aug. 14, 1973 - July 5, 1977
Muhammad Khan Junejo	March 23, 1985 - May 29, 1988
Benazir Bhutto	Dec. 2, 1988 - Aug. 6, 1990
Ghulam Mustafa Jatoi (caretaker)	Aug. 6, 1990 - Nov. 6, 1990
Mian Nawaz Sharif	Nov. 6, 1990 - April 18, 1993 May 26, 1993 - July 18, 1993
Balakh Sher Mazari (caretaker)	April 18, 1993 - May 26, 1993
Moin Qureshi (caretaker)	July 18, 1993 - Oct. 19, 1993
Benazir Bhutto	Oct. 19, 1993 - Nov. 5, 1996
Meraj Khalid (caretaker)	Nov. 5, 1996 - Feb. 17, 1997
Mian Nawaz Sharif	Feb. 17, 1997-Oct. 12, 1999
Mir Zafarullah Jamali	Nov 23, 2002 - June 26, 2004
Ch. Shujaat Hussain	June 30, 2004 - Aug 25, 2004
Shaukat Aziz	Aug 28, 2004 -

سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس

Chief Justice Supreme Court of Pakistan

Name	Tenure
Mr. Justice Mian Abdul Rashid	June 27, 1944 - June 28, 1954
Mr. Justice M. Muneer	June 29, 1954 - May 02, 1960
Mr. Justice Shahabuddin	May 03, 1960 - May 12, 1960
Mr. Justice A.R. Cornelius	May 13, 1960 - Feb 29, 1968
Mr. Justice S.A. Rehman	March 1, 1968 - June 3, 1968
Mr. Justice Fazal Akbar	June 4, 1968 - Nov. 17, 1968
Mr. Justice Hamoodur Rehman	Nov. 18, 1968 - Oct. 31, 1975
Mr. Justice Yaqoob Ali Khan	Nov. 1, 1975 - Sep. 9, 1977
Mr. Justice Sh. Anwar-ul-Haq	Sep. 23, 1977 - March 25, 1981
Mr. Justice M. Haleem	March 25, 1981 - Dec 31, 1989
Mr. Justice M. Afzal Zullah	Jan. 1, 1990 - April. 17, 1993
Mr. Justice Naseem Hassan Shah	April. 17, 1993 - April. 14, 1994
Mr. Justice Saad Saood Jan	Jan. 15, 1994 - June. 4, 1994
Mr. Justice Sajjad Ali Shah	June. 5, 1994 - Dec. 23, 1997
Mr. Justice Ajmal Mian	Dec. 23, 1997 - July 1, 1999
Mr. Justice Saeed-uz-Zaman Siddique	July 4, 1999 - Jan. 26, 2000
Mr. Justice Irshad Hassan Khan	Jan. 26, 2000 - Jan. 3, 2002
Mr. Justice Bashir Jahangiri	Jan. 7, 2002 - Jan. 31, 2002
Mr. Justice Sh. Riaz Ahmed	Feb. 1, 2002 - Dec. 31, 2003
Mr. Justice Nazim Hussain Siddique	Dec. 31, 2003 - June 26, 2005
Mr. Justice Iftikhar Muhammad Ch.	June 30, 2005 Till Now

افواج پاکستان کے سربراہ

Commander-in-Chiefs

Name	Tenure
General Sir Frank Messervy	Aug. 15, 1947 - Feb. 10, 1948
General Sir Douglas David Gracy	Feb. 11, 1948, - Jan. 16, 1951
General Muhammad Ayub Khan (later Field Marshal)	Jan. 17, 1951 - Oct. 10, 1958
General Muhammad Musa Khan	Oct. 28, 1958 - Sep. 17, 1966
General Agha Muhammad Yahya Khan	Sep. 17, 1966 - Dec. 20, 1971
Lieutenant General Gul Hassan Khan	Dec. 20, 1971 - March 3, 1972
Chiefs of the Army Staff	
General Tikka Khan	March 3, 1972 - March 1, 1976
General Muhammad Zia ul Haq	March 1, 1976 - Aug. 17, 1988
General Mirza Aslam Beg	Aug. 17, 1988 - Aug. 16, 1991
General Asif Nawaz	Aug. 16, 1991- Jan. 8, 1993
General Abdul Waheed Kakar	Jan. 12, 1993 - Jan. 12, 1996
General Jehangir Karamat	Jan. 12, 1996 - Oct 7, 1998
General Pervez Musharraf	Oct. 7, 1998 -

Originally C-in-C, the designation became Chief of Army Staff (COAS) on December 20, 1971.

Naval Chiefs

Commander-in-Chiefs

Rear Admiral James Wilfred Jafford	Aug. 15, 1947 - Feb. 2, 1953
Vice Admiral Haji Muhammad Siddiq Choudri	Feb. 2, 1953 - Feb. 27, 1959
Vice Admiral Afzal Rahman Khan	Feb. 27, 1959 - Oct. 7, 1966
Vice Admiral Syed Muhammad Ahsan	Oct. 7, 1966 - Aug. 31, 1969
Vice Admiral Muzaffar Hassan	Sep. 1, 1969- Dec. 24, 1971
Vice Admiral Hasan Hafeez Ahmed	Dec. 24, 1971 - March 9, 1975
Chiefs of the Naval Staff	
Admiral Muhammad Sharif	March 22, 1975 - March 21, 1979
Admiral Karamat Rahman Niazi	March 21, 1979 - March 21, 1983
Admiral Tariq Kamal Khan	March 21, 1983 - April 9, 1986
Admiral Iftikhar Ahmed Sirohey	April 10, 1986 - Sep. 6, 1988
Admiral Yastur-ul-Haq Malik	Nov. 10, 1988 - Nov. 6, 1991
Admiral Saeed Muhammad Khan	Nov. 10, 1991 - Nov. 9, 1994
Admiral Mansural Haque	Nov. 9, 1994 - May 2, 1997
Admiral Fasih Bokhari	May 2, 1997 - Oct. 2, 1999

Admiral Abdul Aziz Mirza	Oct. 2, 1999 - Oct 2, 2002
Admiral Shahid Karimullah	Oct. 7, 2002 - Oct. 7, 2005
Muhammad Afzal Tahir	Oct. 7, 2005 -

Air Chiefs

Commander-in-Chiefs

Air Vice Marshal A . L . A Perry	Aug. 15, 1947 - Feb. 18, 1949
Air Vice Marshal R . L . R. Aicherley	Feb. 19, 1949 - May 6, 1951
Air Vice Marshal L.W. Cannon	May 7, 1951 - June 19, 1995
Air Vice Marshal A.W.B. McDonald	June 20, 1955 - July 22, 1957
Air Marshal M. Asghar Khan	July 23, 1957 - July 22, 1965
Air Marshal Malik Noor Khan	July 23, 1965 - Aug. 31, 1969
Air Marshal A. Rahim Khan	Sep. 1, 1969 - March 3, 1972
Chief of the Air Staff	
Air Marshal Zafar Ahmed Chaudhry	March 3, 1972 - April 14, 1974
Air Chief Marshal Zulfiqar Ali Khan	April 15, 1974 - July 22, 1978
Air Chief Marshal M. Anwar Shamim	July 22, 1978 - March 5, 1985
Air Chief Marshal Jamal Ahmed Khan	March 6, 1985 - March 8, 1988
Air Chief Marshal Hakimullah Khan	March 8, 1988 - March 9, 1991

Air Chief Marshal Farooq Feroze Khan	March 9, 1991 - Nov. 9, 1994
Air Chief Marshal M. Abbas Khattak	Nov. 9, 1994 - Nov. 8, 1997
Air Chief Marshal P. Mehdi Qureshi	Nov. 8, 1997 - Nov. 21, 2000
Air Chief Marshal Mushaf Ali Mir	Nov. 22, 2000 - Feb. 20, 2003
Air Chief Marshal Kaleem Saadat	March 19, 2003 - March 19, 2006
Air Chief Marshal Tanveer Mahmood Ahamad	March 20, 2006 -

متحدہ ہندوستان کے سول ملٹری ملازمین میں مسلمانوں کا تناسب(47 - 1946)

Muslims in the Civil and Military Services of the Government of India 1946-7[1]

- **Muslims in the secretariat of the Government of India, 1946-47**

1. ***Secretariat of the Governor-General***

   Personal Secertary — British

   Secretary (Public) — Reforms Commissioner — Hindu

   No Muslim in the Secretariat

2. ***Cabinet Secretariat***

   Secretary — British

   Joint Secretary — Hindu

   Establishment Officer — British

   Deputy Secretary (Military) — British

   Deputy Secretary (Civil) — Muslim

   Under Secretary (Civil) — Muslim

   Rest — all British

3. ***Department of Education***

   Secretary — British

   Deputy Secretary — Hindu

   Deputy Educational Advisers — three, one of whom a Muslim

   Assistant Educational Advisers — two, both Muslims

4. ***Department of Health***

   Secretary —British

   Deputy Secretaries — two, both Hindus

   Assistant Secretaries — two, one of whom a Muslim

[1] This information has been gathered from the Indian Year Book 1946-47, Vol. XXXIII, Bombay and Calcutta: Bennett Coleman.

5. ***Department of Agriculture***

Secretary — Hindu

Joint Secretaries — two, both Hindus

Deputy secretaries — two, one of whom a Muslim

Under Secretaries — two, one of whom a Muslim

Out of nearly fifty technical officers, only seven Muslims.

6. ***Labour Department***

Secretary — Hindu

Joint Secretary — Hindu

Deputy Secretaries — Hindus

Only one Muslim officer — Officer on Special Duty

A. **Directorate General of Resettlement and Employment**

Director General and ex-officio Joint Secretary — Muslim

Deputy Secretaries — two, one of whom a Muslim

Assistant Secretaries — three Hindus

A number of offices in the Department of Labour called Directorates of Training, Employment Exchanges, Resettlement and Employment, etc. — only, one Muslim Director

7. ***Department of Works, Mines and Power***

Secretary — Hindu

Joint Secretary — Hindu

Deputy Secretaries — Hindus

Under Secretaries — Hindus

Assistant Secretaries — Hindus

No Muslim except an officer called 'Attache'.

8. ***Finance Department***

Principal Secretaries — two, one British, one Hindu

Joint Secretaries — four, no Muslim

Deputy Secretaries — eight, no Muslim

Under Secretaries — six, only one Muslim

A. ***Communications Division***

Financial Adviser— Hindu

Deputy Financial Advisers— two, one of whom a Muslim.

B. ***Joint Financial Adviser Food***

All Hindu officers

C. ***Financial Department Revenue Division, Central Board of Revenue.***

Additional Secretary— British

Joint Secretaries— three, all British

Deputy Secretary— Hindu

No Muslim

In the Inspectorate of Customs and Central Excise and Income Tax — no Muslim except a minor inspecting officer in Customs and Central Excise.

9. ***War Department***

Secretary — British

Officiating Secretary— Hindu

Joint Secretaries— three, two British, one Muslim

Deputy Secretaries— no Muslim

Under Secretaries— eleven, only one Muslim

In the Pensions Branch, only two Muslims

A. ***Military Finance Department***

Financial Adviser— Muslim

Additional Financial Advisers— two, both British

Joint Financial Adviser— British

Deputy Financial Advisers— nine, only one Muslim

10. ***Home Department***

Secretary — British

Joint Secretary— British

Deputy Secretaries— six, one Muslim

11. ***Information and Broadcasting Department***

Secretary — British

Deputy Secretary— Muslim

Under Secretary— British

In the Publications Division of the Ministry, special officers dealing with Persian and Arabic publications were Muslims.

In the Press Information Bureau, mostly Hindus and British, only one Assistant Principal Information Officer- Muslim

12. ***Indian Council of Agricultural Research***

No Muslim

13. ***Central Agricultural Marketing Department and Indian Central Sugar Cane Committee***

Twenty-one officers-only three Muslims

14. ***External Affairs Department***

Secretary — British

Joint Secretaries— British,

Under Secretaries— mostly British, one Hindu and no Muslim

15. ***Commonwealth Relations Department***

Secretary — Hindu

Deputy Secretaries— all Hindus, except one Additional Deputy Secretary — Muslim

Hajj Officer— Muslim

16. ***Political Department***

All British officers

17. ***Department of Commerce***

Secretaries — two, both Hindus

Joint Secretaries— three, two Hindus, one Muslim

Deputy Secretaries— three, all Hindus

Under Secretaries— three, all Hindus

Chief Controller of Exports— Muslim

18. ***Department of Industries and Supplies***

Secretary — British

Officiating Secreatry— British

Joint Secretaries— two, one Hindu, one British

Deputy Secretaries— six, three of whom Muslim

19. ***Department of War Transport***

Secretary — British

Joint Secretary— British

Deputy Secretaries— two, one British, one Hindu

A number of other officers like Chief Controller, Railroad Priorities; Chief Controller, Motor Transport, were mostly either British or Hindu

Civil Aviation Directorate was entirely in the hands of British and Hindu officers

20. ***Railway Department***

Mostly Hindu or British

21. ***Legislative Department***

Secretary — British

Additional Secretary— British

Joint Secretary— Hindu

Deputy Secretary— Hindu

No Muslim in the Department except Assistant Solicitor to the Government of India (Supply).

- **Muslim Officers in the Army, 1946-7** [2]

	Muslims	Non-Muslims	Total
Field-Marshals	0	0	3

[2] These figures have been taken from Indian Army List, October, 1946, I.
In the above figures, officers who had military rank but were holding non-military posts and were in the Supernumerary List, have not been included. It is abvious from the figures that an overwhelmeing majority of the officers in the Indian Army were British. These figures do not include officers who were on Emergency Commissions.

نوٹ: اوپر والے گوشوارے میں برطانوی افسروں کو نان مسلم میں شامل نہیں کیا گیا۔

Generals	0	0	3
Lt. Generals	0	0	4
Maj. Generals	0	0	20
Colonels	I (Acting Colonel)	Not Known	126
Lt. Colonels	3	5	890
Majors	16	32	577
Captains	80	173	1,033

نوٹ: متحدہ ہندوستان (47-1946) میں وفاقی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ آج بھی بھارت میں رہنے والے مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں کو ہر شعبہ میں ترقی کرنے کا موقع ملا۔ پاکستان کے دم سے سول اور ملٹری ملازمین عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم سب کو پاکستان سے محبت کرنی چاہیئے اور پاکستان کے وسائل سے پندرہ کروڑ عوام کو فیض یاب ہونے کا موقع دینا چاہیے۔

پاکستان کی پہلی مرکزی کابینہ

قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے مرکزی کابینہ کی منظوری دی۔ پاکستان کی پہلی مرکزی کابینہ ان دس افراد پر مشتمل تھی۔

-1	لیاقت علی خان	وزیراعظم
-2	آئی آئی چندریگر	
-3	غلام محمد	خزانہ
-4	سردار عبدالرب نشتر	مواصلات
-5	راجہ غضنفر علی خان	خوراک، زراعت، صحت، بحالیات
-6	جوگندر ناتھ منڈل (مشرقی پاکستان)	قانون، محنت، تعمیرات
-7	فضل الرحمٰن (مشرقی پاکستان)	اُمور داخلہ، اطلاعات و نشریات اور تعلیم
-8	سر محمد ظفر اللہ خان	خارجہ تعلقات
-9	عبدالستار پیرزادہ	خوراک، زراعت، صحت، قانون
-10	خواجہ شہاب الدین (مشرقی پاکستان)	داخلہ، اطلاعات، بحالیات [3]

[3] ڈاکٹر صفدر محمود: ''پاکستان کیوں ٹوٹا'' صفحہ 270

نوٹ: پہلے چھ وزراء 15 اگست 1947 کو، نمبر 7، 27 دسمبر 1947ء، نمبر 8، 30 دسمبر 1947، نمبر 9 اور 10، 8 مئی 1948ء کو نامزد ہوئے۔ ان کے محکمے تبدیل ہوتے رہے۔

صدر کے عہدے کا حلف

[آرٹیکل 42]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں، ______، صدق دل سے حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور وحدت و توحید قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ، کتب الہیہ، جن میں قرآن پاک ختم الکتب ہے، نبوت حضرت محمد ﷺ بحیثیت خاتم النبیین جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، روز قیامت اور قرآن پاک و سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں:

کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا:

کہ بحیثیت صدر پاکستان، میں اپنے فرائض و کارہائے منصبی ایمانداری، اپنی انتہائی صلاحیت اور وفاداری کے ساتھ، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور اور قانون کے مطابق اور ہمیشہ پاکستان کی خودمختاری، سالمیت، استحکام، بہبودی اور خوش حالی کی خاطر انجام دوں گا:

کہ میں اسلامی نظریہ کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہوں گا جو قیام پاکستان کی بنیاد ہے:

کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے سرکاری کام یا اپنے سرکاری فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دوں گا:

کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ اور دفاع کروں گا:

کہ میں ہر حالت میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ، بلاخوف و رعایت اور بلا رغبت و عناد، قانون کے مطابق انصاف کروں گا:

اور یہ کہ میں کسی شخص کو بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی ایسے معاملے کی نہ اطلاع دوں گا اور نہ اسے ظاہر کروں گا جو بحیثیت صدر پاکستان میرے سامنے غور کیلئے پیش کیا جائے گا یا میرے علم میں آئے گا بجز جب کہ بحیثیت صدر اپنے فرائض کی کما حقہ انجام دہی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو۔

(اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔ آمین)

وزیراعظم کے عہدے کے حلف

[آرٹیکل 91 (4)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں، ______ صدق دل سے حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور وحدت و توحید قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ، کتب الہیہ، جن میں قرآن پاک خاتم الکتب ہے، نبوت حضرت محمد ﷺ بحیثیت خاتم النبیین جن کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، روز قیامت اور قرآن پاک اور سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں:

کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی و وفادار رہوں گا:

کہ بحیثیت وزیراعظم پاکستان، میں اپنے فرائض و کارہائے منصبی ایمانداری، اپنی انتہائی صلاحیت اور وفاداری کے ساتھ، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور اور قانون کے مطابق، اور ہمیشہ پاکستان کی خودمختاری، سالمیت، استحکام، بہبودی اور خوشحالی کی خاطر انجام دوں گا:

کہ میں اسلامی نظریہ کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہوں گا جو قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔

کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے سرکاری کام یا اپنے سرکاری فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دوں گا:

کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ اور دفاع کروں گا:

اور یہ کہ میں، ہر حالت میں، ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ، بلاخوف و رعایت اور بلا رغبت و عناد، قانون کے مطابق انصاف کروں گا۔

اور یہ کہ میں کسی شخص کو بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی ایسے معاملے کی نہ اطلاع دوں گا نہ اسے ظاہر کروں گا جو بحیثیت وزیراعظم پاکستان میرے سامنے غور کیلئے پیش کیا جائے گا یا میرے علم میں آئے گا، بجز جبکہ بحیثیت وزیراعظم اپنے فرائض کی کما حقہ انجام دہی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو۔

(اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔آمین)

مسلح افواج کے ارکان کا حلف

[آرٹیکل 244]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں، ________ صدق دل سے حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی حمایت کروں گا جو عوام کی خواہشات کا مظہر ہے اور یہ کہ میں اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول نہیں کروں گا اور یہ کہ میں مقتضیات قانون کے مطابق اور اس کے تحت پاکستان کی بری فوج (یا بحری یا فضائی فوج) میں پاکستان کی خدمت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ انجام دوں گا۔

(اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔آمین)

چیف جسٹس کا حلف

[آرٹیکل 178 اور 194]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں، ________ صدق دل سے حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا:

کہ بحیثیت چیف جسٹس پاکستان (یا جج عدالت عظمیٰ پاکستان، یا چیف جسٹس یا جج عدالت عالیہ صوبہ یا صوبہ جات ________) میں اپنے فرائض وکارہائے منصبی ایمانداری، اپنی انتہائی صلاحیت اور وفاداری کے ساتھ، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور اور قانون کے مطابق انجام دوں گا:

کہ میں اعلیٰ عدالتی کونسل کے جاری کردہ ضابطہ اخلاق کی پابندی کروں گا:

کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے سرکاری کام یا اپنے سرکاری فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دوں گا:

کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ اور دفاع کروں گا:

اور یہ کہ میں ہر حالت میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ، بلاخوف ورعایت اور بلا رغبت وعناد، قانون کے مطابق انصاف کروں گا:

(اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔آمین)

”مصنف نے اس کتاب میں نہ صرف اُن عوامل کا تجزیہ کیا ہے جو بار بار سیاست میں فوج کی آمد کا سبب بنے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہر سیاسی اور فوجی دور حکومت کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے، مختلف حکومتوں کی کارکردگی کا تجزیہ کیا ہے اور قوم کو مستقبل کی راہ دکھائی ہے۔ کتاب کے صفحات پر پھیلے ہوئے حوالہ جات مصنف کے وسیع مطالعے، عرق ریزی اور ریسرچ سکالرشپ کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جنہوں نے کتاب کو خاصی حد تک مستند بنا دیا ہے۔ نظامی صاحب بنیادی طور پر پیپلز پارٹی کے دیرینہ کارکن ہیں اس لئے بعض مقامات پر ان کا سیاسی جھکاؤ ایک قابل فہم بات ہے لیکن جس دلیری اور مہارت سے انہوں نے آمرانہ قوتوں کی سنگلاخ چٹانوں سے راستہ بنایا ہے اور تاریخی حقائق کے علاوہ اعداد وشمار کی بنا پر اُن کی کارکردگی کا راز فاش کیا ہے اس کے لئے وہ ہماری ستائش کے مستحق ہیں۔ اُن کے سادہ اور رواں اُسلوب نے کتاب کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے اور کتاب پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ تاریخ کی وادی میں سفر کر رہا ہے۔“

ڈاکٹر صفدر محمود

"There are armies that guard their nation's borders, there are those concerned with protecting their own position in society, and there are those that defend a cause or an idea, but the Pakistan Army does all three."

Stephean Philip Choen

”اگر سول ادارے فوج پر اپنی اہمیت جتانے کے اہل نہ ہوں تو اپنی خصوصیات کی بناء پر فوج سول اداروں پر غالب آجاتی ہے۔ لہٰذا یہی بیماری کی جڑ ہے جس کا علاج ہونا چاہیے جتنی جلدی ہمیں اس کا احساس ہو جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔“

ڈاکٹر حسن عسکری رضوی

E-mail:info@jbdpress.com

www.jbdpress.com